اسلام اور سياست
جلد دوم

مصنف:

حضرت آية الله مصباح يزدي مد ظله العالی

یہ کتاب برقی شکل میں نشر ہوئی ہے اور شبکہ الامامین الحسنین (علیہما السلام) کے گروہ علمی کی نگرانی میں تنظیم ہوئی ہے

اسلام اور سياست جلد (۲)
حضرت آية الله مصباح يزدي مد ظله العالی

چوبیسواں جلسہ

حکومت کی عظیم منصوبہ بندی ۱

۱۔ حکومت کی ضرورت

ہم نے اسلامی سیاسی فلسفہ کے شروع ہی میں یہ بات عرض کی تھی کہ دوسری حکومتوں کی طرح اسلامی حکومت کے بھی دو بنیادی محور ہوتے ہیں:

۱۔ قانون اور قانونگذاری -

۲۔ مدیریت اور قوانین کو نافذ کرنا۔

ہماری گذشتہ بحث پہلے محور پر ہوئی ہے مثلاً قانون کی اہمیت، مطلوبہ قانون کے خصوصیات، اسلام کی نظر میں قانون گذاری، اور اس کے شرائط کے سلسلہ میں بحث ہوئی، نیز اسی بحث کے ضمن میں مذکورہ سلسلہ میں ہونے والے بعض اعتراضات و شبہات کا بھی جواب دیا گیا۔

لیکن اب ہم دوسرے محور (یعنی مدیریت اور نفوذ قوانین) کے سلسلہ میں بحث کریں گے، اس بحث کے نقشہ کو روشن کرنے کے لئے اس مقدمہ پر توجہ کرنا ضروری ہے کہ کسی موسسہ یا سازمان کا ہدف جس قدر واضح اور صاف و شفاف ہوگا اسی مقدار میں اس سازمان کا نقشہ یا اس میں کام کرنے کی شرائط، اسی طرح اس کے منتخب ہونے والے اعضاء کی خصوصیات واضح اور روشن ہوگی اس بنا پر اگر ہم اسلامی حکومت یا حکومت بمعنی خاص یعنی حکومت اسلامی کی مدیریت کے بارے میں بحث کرنا چاہیں اور اس بات کا پتہ لگانا چاہیں کہ اس طاقت کا ڈھانچہ کیسا ہونا چاہئے؟ اس سلسلہ میں کون افراد فعالیت اور کارکردگی کر سکتے ہیں اور ان کی خصوصیات اور ان کے اختیارات کیا کیا ہیں؟

تو سب سے پہلے اسلامی حکومت کی تشکیل کے اہداف اور ان میں بھی اسلامی حکومت کی مدیریت کے ہدف اور مقصد سے آگاہ ہونا ضروری ہے کیونکہ اگر حکومت کی تشکیل کا ہدف معین اور مشخص نہ ہو تو پھر مدیریت کا ڈھانچہ، اس کے ذمہ دار افراد کی خصوصیات اور ان کے اختیارات واضح نہیں ہو پائیں گے لہذا مناسب ہے کہ پہلے حکومت (خاص شکل میں یعنی قوہ مجریہ) کی تشکیل کے اغراض و مقاصد کے سلسلہ میں بحث کریں۔

ان لوگوں کے نظریہ کو نظر انداز کرتے ہوئے جو حکومت کو ضروری نہیں مانتے اکثر فلسفہ سیاسی دانشمند افراد حکومت کو ضروری مانتے ہیں یعنی ان کا ماننا یہ ہے کہ معاشرہ میں ایسی انجمن یا مجموعوں کا ہونا ضروری ہے جو احکامات صادر کریں اور دوسرے افراد ان کی اطاعت کریں، یا وہ قوانین جن کو معاشرہ قبول کرتا ہے ان کو معاشرہ میں نافذ کریں اور ان قوانین کی مخالفت

کرنے والوں کو مخالفت سے روکیں، یا ان کو مخالفت پر سزا دیں چنانچہ اس بات پر تقریباً سبھی دانشمندانہ اتفاق رکھتے ہیں تجربہ کی بنیاد پر کم و بیش سبھی لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ معاشرہ کو حکومت کی ضرورت ہے اسی طرح اسلام بھی اس نظریہ کو قبول کرتا ہے، جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے (نہج البلاغہ میں) فرمایا ہے: یہاں تک کہ اگر معاشرہ میں نیک لوگوں کی حکومت نہ ہو تو ایسے حالات میں ایک فاجر اور برے فرد کی حکومت (حکومت نہ ہونے سے) بہتر ہے

وَإِنَّهُ لَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ أَمِيرٍ بَرٍّ أَوْ فَاجِرٍ يَعْمَلُ فِي إِمْرَتِهِ الْمُؤْمِنُ وَيَسْتَمْتِعُ فِيهَا الْكَافِرُ - (۱) "یعنی لوگوں کے ایک حاکم کی ضرورت ہوتی ہے چاہے وہ نیک ہو یا برا، تاکہ اس کی حکومت میں مومنین اپنا کام کر سکیں اور کافر اپنا فائدہ حاصل کر سکیں کیونکہ اگر حکومت یا قوانین کو جاری کرنے والا ضامن موجود نہ ہو تو پھر معاشرہ کا نظام درہم و برہم ہو جائے گا، جس کے نتیجے میں عام لوگوں کے حقوق پامال اور معاشرہ کے مصالح و فوائد نابود ہو جائیں گے لہذا اسلامی نقطہ نظر سے "بے حکومتی" قابل قبول نہیں ہے، بلکہ مومنین کے اہم و واجب وظائف میں سے ایک یہ ہے کہ نیک افراد کی حکومت بنائیں تاکہ معاشرہ کے مصالح اور فوائد تائین اور پورے ہوں۔

۲- قوہ مجریہ کے اہداف کے سلسلہ میں مختلف نظریات

اب جب کہ حکومت اور قوہ مجریہ کی ضرورت ثابت ہو گئی تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حکومت اور قوہ مجریہ کے اہداف و مقاصد کیا کیا ہیں؟ جبکہ اس بات کو تقریباً سبھی جانتے ہیں کہ قوہ مجریہ کا کام قوانین کو نافذ کرنا ہے، پس یہ طے ہو گیا کہ اس کا کام قوانین کو جاری کرنا ہے، لیکن اب یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ قوانین جن کو حکومت نافذ کرنا چاہتی ہے وہ کس طرح کے اور کس ماہیت کے ہونے چاہئیں؟ چنانچہ اس سوال کا جواب ایک دوسرے سوال پر متوقف ہے اور وہ یہ ہے کہ قانون کا ہدف اور مقصد کیا ہے؟ معاشرہ کو قانون کی کیا ضرورت ہے؟ اور وہ قانون لوگوں کے لئے کس چیز کو مد نظر رکھے؟ اس سوال کے جواب میں ہم عرض کرتے ہیں کہ قانون کے اہداف و مقاصد کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

پہلی قسم: مادی اغراض و مقاصد۔

دوسری قسم: معنوی اغراض و مقاصد۔

کلی طور پر سیاسی فلسفہ کے بارے میں بحث کرنے والے دانشوروں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ حکومت کو چاہئے کہ وہ لوگوں کے مادی مصالح و منافع کو تائین کرے، لیکن معنوی مصالح کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ آیا قانون کو لوگوں کے معنوی مصالح کو بھی پورا کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ کیا معنوی مصالح کا بھی قانون میں لحاظ کرنا ضروری ہے، اور اس طرح حکومت کو ایسے قوانین کا نافذ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

قدیم زمانہ سے بعض فلسفی مکاتب اس نظریہ کو مورد توجہ قرار دیتے تھے کہ حکومت کو لوگوں کے معنوی مصالح کو بھی تائین کرنا چاہئے، اور وہ قانون جس کی حکومت ذمہ دار ہوتی ہے اس قانون کو ایسا ہونا چاہئے جو انسانی فضائل کو مد نظر رکھے غیر دینی فلسفی مکاتب میں بھی یونانی قدیم فلاسفہ مثل ”افلاطون“ (انسانی) فضیلت پر توجہ دیتے تھے، اور حکومت کی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری یہ بھی سمجھتے تھے کہ وہ انسانی فضائل کے رشد و نمو کے لئے راستہ ہموار کرے، چنانچہ اسی لئے کہتے تھے: ”حکومت کرنے کا حق صرف انہیں افراد کو ہے جو حکیم (عالم و عاقل) ہوں، جو انسانی فضائل کے اعتبار سے دوسرے لوگوں سے بہتر ہوں، جیسا کہ افلاطون کا کہنا ہے: ”حکیمان باید حاکم بشوند“ (حکماء کو حاکم ہونا چاہئے) لہذا غیر مسلمان اور غیر الہی فلاسفہ (وہ لوگ جو آسمان اویان کے کو نہیں مانتے تھے) کے نزدیک بھی انسانی فضائل اور اخلاق کی اہمیت تھی یہاں تک کہ وہ فلاسفہ جو کسی دین اور مذہب کو نہیں مانتے تھے وہ بھی یہی نظریہ رکھتے تھے کہ معاشرہ میں اخلاقی فضائل اور لوگوں کی اخلاقی رشد و نمو ہونا چاہئے۔

جس وقت یورپ میں عیسائیت پھیلی اور ”کنسٹنٹین“ روم کا بادشاہ ایک عیسائی ہوا، اس نے یورپ میں عیسائیت کو رائج کیا، عیسائیت یورپین ممالک کے تمدن کا قانونی مذہب بن گئی، دین اور حکومت ایک ساتھ مل گئے اور حکومت کے اہداف میں دینی اغراض و مقاصد کو بھی مد نظر رکھا گیا یعنی جو کچھ عیسائیت نے کھا اس کے قوانین کو جاری بھی کیا گیا۔

لیکن ”رنسانس“ کے بعد مغربی نظریات میں تبدیلی آئی، جس کی بنا پر انھوں نے اخلاقی مسائل کو حکومت کے دائرہ سے نکال دیا کیونکہ رنسانس اور نوزائی کے بعد یورپ میں تغیر و تبدیلی پیدا ہوئی جس کے نتیجہ میں مغربی جدید تمدن کا آغاز ہوا، جس کی سب سے بڑی خصوصیت دین کا حکومت سے جدا کرنا تھا اس دور میں فلاسفہ نے اس سلسلہ میں گفتگو کی، کتابیں لکھیں جس کی بنا پر مختلف فکری مکاتب وجود میں آئے، اور اخلاقی اور معنوی فضائل کو بالائے طاق رک دیا گیا۔

انہیں فلاسفہ میں سے ”ہابز“ نامی فلسفی بھی گذرا ہے جس کا نظریہ یہ تھا کہ حکومت کی ذمہ داری صرف ہرج و مرج (بد امنی) پھیلنے سے روکنا نہیں ہے کیونکہ اس کے نظریہ کے مطابق بعض بھڑیا صفت لوگ ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کی جان پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو نابود کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے ایک ایسی حکومت کی ضرورت ہوتی ہے جو ان بھڑیا صفت انسان پر کنٹرول کرے اور ان کی درندگی اور ظلم و ستم کو روکے، لہذا حکومت کا صرف یہی مقصد ہوتا ہے۔

اس کے بعد ”جان لاک“ (۲) نے حکومت کے اہداف کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ حکومت کی ذمہ داری لوگوں کی؟ اور ان کی حفاظت کرنا ہے، اس کی نظر میں انسانوں کے پاس صرف ایک حکومت کی کمی ہوتی ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو پھر معاشرہ کا نظام وجود میں نہیں آسکتا، افراتفری پھیل جائے گی، امن و امان ختم ہو جائے گا، انسان کی جان و مال خطرہ میں پڑ جائے گی جیسا کہ وہ کہتا ہے: ”ہمیں اپنی ضرورت تحت حکومت چاہتے ہیں، ورنہ تو دوسری چیزوں کا حکومت سے کوئی مطلب و واسطہ نہیں ہے۔“

البتہ دین و حکومت اور اجتماعی مسائل کی جدائی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس نظریہ کے ماننے والے اخلاقی فضائل اور معنوی اقدار کی اہمیت کے قائل نہیں ہیں، بلکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ ان چیزوں کا حکومت سے کوئی ربط نہیں ہے بلکہ خود عوام الناس کو ان اخلاقی و معنوی فضائل کی طرف قدم بڑھانا چاہئے: جو لوگ خدا کو مانتے ہیں ان کو چاہئے کہ خود مسجد یا گرجا گھر میں جائیں یا کسی دوسری جگہ پر جا کر خدا کی عبادت کریں، لیکن اس سلسلہ میں حکومت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے اسی طریقہ سے اخلاقی فضائل جیسے سچ بولنا، نیک کردار، دوسروں کا احترام و اکرام کرنا، فقیر و فقراء کی مدد کرنا وغیرہ یہ فضائل قابل قدر ہیں لیکن یہ فردی (ذاتی) مسائل میں شمار ہوتے ہیں اور اس سلسلہ میں خود افراد کو تلاش و کوشش کرنا چاہئے تاکہ اپنے کو ان اخلاقی فضائل سے آراستہ کر لیں، لیکن ان کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

پس اجتماعی قوانین، یعنی وہ قوانین جو حکومت کے ذریعہ جاری ہوتے ہیں ان کا ہدف اور مقصد معاشرہ کے امن و امان کو تائین اور ان کی حفاظت کرنا ہے تاکہ لوگوں کی جان و مال؛ ہر طرح کے خطرہ سے محفوظ رہے پس حکومت کی ذمہ داری لوگوں کی جان و مال کی حفاظت ہے، اور یہ بات کہ حکومت کا مقصد امن و امان قائم کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے مختلف تحریروں میں بیان کیا گیا ہے، جیسا کہ ”لاک“ کی تحریروں میں جان و مال کی حفاظت کے علاوہ فردی آزادی کو بھی انیت کا ایک حصہ شمار کیا ہے، یعنی اس نے انیت میں جان و مال اور آزادی کو بھی داخل کیا ہے، لیکن اخلاقی اور معنوی مصالح کے بارے میں صرف اس بات کو قبول کرتا ہے کہ اجتماعی قانون کو اخلاق کے مخالف نہیں ہونا چاہئے، یا خدا پرستی سے نہ ٹکراتا ہو، لیکن اجتماعی اور حکومتی قوانین پر؛ اخلاقی اقدار، دینی اقدار کو حفظ کرنے اور معنوی رشد کرنے کی راہ ہموار کرنے کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی، چنانچہ اس کا کہنا ہے کہ یہ تمام چیزیں حکومت سے متعلق نہیں ہیں۔

آج کل دنیا کے تقریباً سبھی فلسفی مکاتب میں اسی ”لاک“ کا نظریہ انجیل کا حکم اور بنیادی قانون ہوتا ہے اس کا اصلی نعرہ یہ ہے کہ حکومت کو امن و امان اور آزادی کو برقرار کرنے کے علاوہ دینی مسائل یا اخلاقی فضائل کے سلسلہ میں کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

قارئین کرام! مغربی نقطہ نظر اور اسلامی نقطہ نظر میں سب سے بڑا نقطہ اختلاف یہی ہے۔

۳۔ انبیاء (ع) کی حکومت کے اغراض و مقاصد

انبیاء علیہم السلام اور ہمارے نبی اکرم (ص) کا نظریہ خاص طور پر یہ ہے کہ حکومت کی ذمہ داری، مادی مصالح اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے علاوہ معنوی مصالح کو پورا کرنا بھی ہے یہاں تک کہ معنوی مصالح کا پورا کرنا مادی مصالح پر فوقیت رکھتا ہے اور ان پر مقدم ہے یعنی حکومت کو ایسے قوانین جاری کرنا چاہئے جن کا آخری ہدف معنوی، روحی، اخلاقی اور انسانی مصالح کو تائین

(حفاظت) کرنا ہے وہی مسائل جن کو دین انسان کا آخری ہدف شمار کرتا ہے اور انسانی کمال کو ان سے متعلق گردانتا ہے، اس دنیا میں انسان کی خلقت اور اس کے لئے انتخاب اور آزادی کی طاقت کا ہونا؛ یہ تمام کی تمام چیزیں اسی وجہ سے ہیں کہ انسان اپنے نھائی اور آخری ہدف کو پہچان لے اور اسی پر قدم بڑھائے ان تمام مسائل کا محور ”قربت خدا“ ہے جیسا کہ الحمد للہ آج ہمارے اسلامی معاشرہ میں سب پر واضح ہے بلکہ ہمیشہ مسلمانوں کے درمیان یہ بات رائج تھی یہاں تک کہ جو لوگ اس کے صحیح معنی بھی نہیں جانتے لیکن پھر بھی اس لفظ سے مانوس ہیں کیونکہ جاہل اور کم پڑھے لکھے افراد بھی جملہ ”قربت الی اللہ“ کو زبان پر جاری کرتے ہیں۔

اب جبکہ یہ بات معلوم ہو گئی کہ انسان کا آخری ہدف خلقت، قربت خدا ہے تو پھر معاشرہ میں ایسے قوانین کا نافذ ہونا ضروری ہے جو اس ہدف تک پہنچانے میں مدد کریں اور انسان کی زندگی بھی اسی سمت آگے بڑھے، اور انسان کے دوسرے حیوانی پہلو کے دوسرے مسائل اسی صورت میں مہم ہو سکتے ہیں جب وہ مسائل انسان کو معنویات اور قربت خدا کی طرف رشد و ترقی کی منزلوں کو طے کرنے میں مددگار ثابت ہوں۔

اور جب یہ بات ثابت ہو چکی کہ اجتماعی قوانین کو بنانے کا ہدف مادی مصلح کو تائین کرنے کے علاوہ معنوی مصلح کو تائین کرنا بھی ہے تو پھر ظاہراً حکومت کا مقصد بھی مشخص اور معین ہو جاتا ہے اور حکومت کو بھی صرف لوگوں کی جان و مال کی حفاظت ہی کو اپنی ذمہ داری نہیں سمجھنا چاہئے؛ بلکہ ان کے علاوہ معنویات کے رشد کے لئے بھی راہ ہموار کرنا نیز اس راہ میں جو چیز مانع اور ضدیت رکھتی ہوں ان کو راستہ سے ہٹانا بھی حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے، حکومت کو صرف اسی پر اکتفاء نہیں کرنا چاہئے کہ میں نے تو تمھاری روٹی کے اسباب فراہم کر دئے ہیں اور تمھاری جان کی انیت برقرار کر دی ہے، اور بس البتہ یہ ذمہ داری تو سبھی حکومتوں کی ہوتی ہے اور سبھی اس سلسلہ میں متفق بھی ہیں کہ ہر ایک معاشرہ میں؛ چاہے وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، لائیک ہو یا غیر لائیک اس میں جو بھی حکومت تشکیل پائے تو اس کے لئے انیت برقرار کرنا ضروری ہے تاکہ لوگوں کی جان و مال محفوظ رہے، لیکن اسلامی نقطہ نظر سے حکومت اپنی ذمہ داری کو صرف اسی چیز میں محدود نہیں کر سکتی بلکہ اس کو اپنا سب سے پہلا وظیفہ یہ سمجھنا چاہئے کہ فضائل انسانی، معنوی والہی رشد کے لئے راستہ ہموار کرے، طبعی طور پر اس مقصد تک پھونچنے کے لئے امن و امان اور لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کے سلسلہ میں انیت برقرار کرنا ضروری ہوتا ہے، البتہ اس انیت کا برقرار کرنا ایک مقدمہ ہے نہ کہ اصل مقصد نہیں ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں عرض کیا جائے کہ جانی مالی انیت برقرار کرنا متوسط اہداف میں ہیں نہ نہائی اور اصلی ہدف، ایک دوسرے طریقہ سے یوں عرض کیا جاسکتا ہے کہ یہ انیت بلند و عالی ہدف تک پہنچنے کا ایک وسیلہ ہے اور وہ بلند ہدف معنویات کا رشد ہے پس معاشرہ میں وہ قوانین نافذ ہوں جو نہ فقط دین سے ضدیت نہ رکھتے ہوں اور دین کے مخالف نہ ہوں بلکہ ان کو مکمل طریقہ سے

دینی اصول و مبانی سے ہم اہنگ اور موافق ہونا چاہئے، اور انسان کے معنوی اور الہی رشد میں معاون و مددگار، ان کا دین کے مخالف نہ ہونا کافی نہیں ہے بلکہ دین کے اہداف میں مددگار ہونا ضروری ہے، یعنی اسلامی حکومت کا کردار نہ صرف یہ کہ ضد دین نہ ہو بلکہ بے دینی اور دینی ضدیت سے مقابلہ کرے اور دینی اہداف و مقاصد کو پایہ تکمیل تک پہنچائے۔

لہذا اسلامی نقطہ نظر سے حکومت یا قوہ مجریہ کا ہدف، صرف جان و مال کی حفاظت کرنا نہیں ہے بلکہ اس سے مہم تر معنوی مسائل پر توجہ دینا نہایت ہی ضروری ہے، یہاں تک کہ ممکن ہے کہ ایک اسلامی معاشرہ میں معنوی ضرورتوں کو پورا کرنے کی وجہ سے وقتی طور پر مادی ضرورتیں تاین نہ ہوں، اور اگر اسلامی احکام جاری ہوں تو پھر آئندہ میں لوگوں کی مادی ضرورتیں دیگر حکومتوں سے بہتر طریقہ پر پوری ہوں گی، لیکن اگر فرض کریں کچھ مدت تک لوگوں کی تمام مادی ضرورتوں کو پورا کرنے سے دین کے ضعیف ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر ایسے موقع پر ضروری ہے کہ لوگوں کی ان ضرورتوں کو پورا کیا جائے جن سے دین ضعیف نہ ہو، کیونکہ معنوی مصالح مقدم اور اہم ہیں لیکن اس سلسلہ میں مغربی ممالک کا نقطہ نظر ہمارے نظریہ سے الگ ہے کیونکہ وہ لوگ فقط مادی مسائل اور مادی اہداف پر توجہ کرتے ہیں اور ان کی حکومت معنوی مصالح کو تاین کرنے کی ذمہ دار نہیں ہوتی۔

۲۔ لیبرل "Liberal" (آزادی خواہ) نظام میں اجتماعی مشکلات کا اثر

کبھی کبھی بعض لوگ تحریری یا شفاہی طور پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مغربی ممالک میں بھی دینی مسائل پر توجہ دی جاتی ہے کہ وہ لوگ بھی ایثار و فداکاری کرتے ہیں اور اجتماعی مسائل پر توجہ کرتے ہیں، اگرچہ یہ مطلب صحیح ہے اور ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ تمام مغربی لوگ خود پسند نہیں ہیں اور لیبرل نظریہ کے رائج ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام مغربی لوگ اس نظریہ سے متاثر ہوں، بلکہ ہماری مراد یہ ہے کہ لیبرل نظریہ اکثر معاشروں پر غالب ہے اور وہ لوگ پیش آنے والے بعض مسائل کی بنا پر ایسے کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اپنے فلسفہ کے خلاف عمل کرتے ہیں یعنی وہ تمام لوگ جو لیبرل نظریہ کو قبول رکھتے ہیں اور خود پسند ہوتے ہیں وہ بھی ضرورتوں کے تحت مجبور ہوتے ہیں تاکہ اجتماعی مسائل پر توجہ کریں اور شورش اور بلوے کے ڈر سے کہیں اکثر لوگ قیام نہ کر لیں، لہذا محرومین کے حقوق کی رعایت کرتے ہیں عملی طور پر بھت سی سوسیالیسٹ "Socialiste" ڈیموکریٹک "Democratic" حکومتیں لوگوں سے حاصل کئے گئے ٹیکس وغیرہ کے کافی حصہ اجتماعی خدمات پر خرچ کرتے ہیں، جبکہ ان کا مادی فلسفہ اس چیز کی اجازت نہیں دیتا، لیکن اس کام کو اس وجہ سے کرتے ہیں تاکہ عوام الناس اعتراض نہ کرے، اور اہمیت محفوظ رہے اور لوگ قیام و شورش نہ کریں، ایک دوسرے کی جان کے پیچھے نہ پڑیں، پس یہ لوگ اپنی مجبوری کی بنا پر اس طرح کی سہولیات فراہم کرتے ہیں۔

لیبرل نظریہ کیا چاہتا ہے؟ اور اس کے طرفدار کیا کرتے ہیں؟ یہ دونوں الگ الگ باتیں ہیں، اتفاقاً یہ اعتراض تو خود ان پر (بھی) ہوا ہے کہ تمہارے لیبرالی نظریہ کے تحت تم کو ان مسائل کی رعایت نہیں کرنا چاہئے، پس تم لوگ ایسے کام کیوں کرتے ہو جس سے محروم طبقے کا فائدہ ہوتا ہو جیسے عام لوگوں کے لئے بیمہ اسکیم، یا دوسری سھیولیات کا فراہم کرنا اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ سب چیزیں اس لئے ہیں تاکہ سرمایہ داروں اور مالدار لوگوں کا سرمایہ اور پراپرٹی خطرہ میں نہ پڑ جائیں، اور کمیونسٹی اور مارکسسٹی انقلاب رونما نہ ہو جائیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مارکسسٹی ممالک میں مارکسسٹی نظریہ آنے سے پہلے یہ نظریہ مغربی ممالک میں رائج ہو چکا تھا اور اپنا اثر دکھا چکا تھا "مارکس" نامی دانشمند جرمن کا تھا اور انگلینڈ میں رہتا تھا شروع میں اس کے نظریات اور اس کی کتابیں انگلینڈ میں نشر ہوئیں، چنانچہ انگلینڈ کے سیاستمداروں نے اس کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد مارکس کے بیان شدہ خطرات پر توجہ کی اور پہلے ہی سے ان کی روک تھام کا بندوبست کیا۔

حزب کارگر اور سوسیالیسٹی طرز تفکر جو انگلینڈ میں وجود میں آئے اور انہوں نے جو محروم اور کم درآمد لوگوں کے لئے کچھ پروگرام رکھے ان سب کا مقصد مارکسسٹی طرز تفکر سے روک تھام تھا؛ کیونکہ پہلے ہی سے یہ پیشن گوئی کر دی گئی تھی کہ سرمایہ داری کی پیشرفت اور ترقی، لوگوں کی اکثریت کو انقلاب اور شورش کرنے پر مجبور کر سکتی ہے لہذا انگلینڈ میں مارکسسٹی انقلاب کو روکنے کے لئے فقیر اور غریب لوگوں پر توجہ کی جانے لگی، اور ان کو اطمینان دلایا جانے لگا اگرچہ ان کا یہ رویہ "کاپیٹالیسٹی" طرز تفکر سے سازگار اور ہم آہنگ نہ تھا، لیکن سرمایہ داروں اور مالداروں کے منافع کے حق میں تھا بھر حال لیبرل نظریہ کا ما حاصل یہ ہے کہ حکومت کی معنوی امور کے سلسلہ میں کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

ممکن ہے کوئی شخص ہم پر یہ اعتراض کرے کہ مغربی ممالک میں حکومت گرجا گھروں کے لئے ٹیکس لیتی ہے، تو پھر ان پر دین اور معنویات سے بے توجہی کا الزام کیونکر لگایا جاسکتا ہے؟!

تو اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی لیبرالیزم کا مقصد نہیں ہے بلکہ یہ کام اس لئے کرتے ہیں تاکہ دیندار لوگوں کا دل جیت لیں، اور حکومت بناتے وقت گرجا گھر کی طاقت سے استفادہ کریں ہماری بحث تو صرف اس میں ہے کہ لیبرل طرز تفکر کا مقصد اور مطلب کیا ہے؟

چنانچہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ ان کے نظریہ کے مطابق؛ دینی مصلح کی تائین اور ترویج کرنا حکومت کی ذمہ داری کے ذمہ نہیں ہے، اور اگر وہ حکومتیں بعض مذہبی مصلح پر توجہ کرتی ہیں تو وہ اپنے ذاتی فائدہ کے لئے ہوتا ہے، یہ صرف الکشن میں کامیاب ہونے کے لئے ہوتا ہے اور وہ لوگ دینداروں کے دلوں کو جیتنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ دینداروں کے دلوں کو جیت لیں تاکہ ان

کو ووٹ مل جائیں، کبھی کبھی امریکہ میں ووٹنگ کے وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض ممبران گرجا گھروں میں جاتے ہیں تاکہ ان لوگوں کو اپنے سے مانوس کر لیں، البتہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ دین کے طرفدار ہوتے ہیں۔

۵۔ لیبرل نظام سے لوگوں کی انسیت کی دلیل

اسلامی نقطہ نظر سے معنوی مسائل کا تحفظ ہی، جو دین کے زیر سایہ امکان پذیر ہوتا ہے وہی اصل اور اولی اہداف میں سے ہیں اور یہی اسلامی اور دنیا میں رائج دوسرے نظریات میں مہم ترین نقطہ اختلاف ہے، اور ہم حکومت کے سلسلہ میں مغربی ممالک کے تابع نہیں ہو سکتے؛ کیونکہ ان کے اور ہمارے درمیان حکومت کے اہداف کے سلسلہ میں بنیادی اختلاف پایا جاتا ہے اور اگر ہم (حکومت کے) ہدف ہی کو بھول جائیں تو حکومت کا ڈھانچہ، شرائط، ذمہ داریاں اور اختیارات عوض ہو جائیں گے۔

در حقیقت بعض لوگوں کے نظریات میں انحراف اور شک و شکوک کا ایجاد ہونا یہاں تک کہ جو لوگ خود غرضی کے بھی شکار نہ ہوں، جیسا کہ بعض انحرافات اور اعتراضات جو کتابوں اور اخباروں میں بیان ہوتے ہیں ان کی اصل وجہ یہی ہے کہ انہوں نے اسلامی نظریہ کے تحت حکومت کے قوانین کے اہداف پر توجہ نہیں کی ہے اور نہ ہی اسلامی نظریہ اور دوسرے نظریات کے اختلاف پر توجہ کی ہے انہوں نے اصل اسلام کو تو قبول کر لیا ہے واقعاً ایسے لوگ خدا کو مانتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں اور دین کے منکر اور کافر نہیں ہیں؛ لیکن اجتماعی اور سیاسی عملی میدان میں سو فی صد مغربی ممالک کے تابع ہو جاتے ہیں اور پھر ان کو یہ کوئی فکر نہیں ہوتی کہ ان کا یہ طریقہ کار اسلامی نظریہ سے ہم آہنگ بھی ہے یا نہیں؟ اور کھتے ہیں کہ آج کل دنیا میں یہی رویہ رائج ہے لہذا ہم بھی اسی رویہ کو اختیار کریں اور اس کی مخالفت (بھی) نہیں کر سکتے آج کی دنیا کا تمدن، مغربی تمدن ہے، اور لیبرل کلچر حاکم ہے، لہذا ہم اس کی مخالفت نہیں کر سکتے!!

لیکن سب سے پہلے ہمیں تھیوری اور نظری لحاظ سے یہ سمجھنا چاہئے کہ اسلام کیا کھتا ہے، کیا وہ سب کچھ جو مغربی ممالک میں ہوتا ہے، اسلام کی نظر میں آیا وہ قابل قبول ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ ہم مقام عمل میں دیکھیں کہ اسلام کے دستور العمل کو رائج کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر بالفرض مقام عمل میں اسلامی قوانین کو عملی جامہ نہیں پھنسا سکتے تو کم سے کم ہمیں یہ تو پتہ ہونا چاہئے کہ اسلام؛ لیبرل نظریہ کو قبول نہیں کرتا، لہذا ہماری یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ غیر اسلامی طریقہ کار کو اسلام کا نام نہ دیں ہم شاہ کے زمانہ میں بھی بعض اسلامی طریقہ کار پر عمل نہیں کر سکتے تھے لیکن یہ جانتے تھے کہ شاہ کی حکومت اسلامی نہیں ہے، اور اس کے بعض کام دین کے مخالف تھے پس اسلام کے احکام کا جاری نہ ہو سکتا اس بات کا سبب قرار نہیں پاسکتا کہ ہم یہ کہنے لگیں کہ اسلام بدل گیا ہے، ہم آج بھی بعض موارد میں اسلام کے قوانین کو جاری کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، لیکن ہمیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ یہی اسلام ہے جو ہم کرتے ہیں، اسلام کو تو اسی طرح پہنچانیں جیسا وہ ہے اور اگر کسی مقام پر اسلام پر عمل نہیں کر سکتے تو خداوند عالم

سے عذر خواہی کریں کہ ہم سے فلاں مورد میں اسلام کے احکام پر عمل نہیں ہوا، اور اگر خدا نخواستہ ہماری غلطی ہے تو ہمیں ملت اسلامی سے عذر خواہی کرنا چاہئے کہ اسلامی قوانین کے نافذ کرنے میں ہم سے غلطی ہوئی پس ہمیں اسلام میں رد و بدل اور تغیر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے نیز ہمیں توجہ رکھنا چاہئے کہ اسلام وہی دین ہے جو ۱۳۰۰ سال پہلے پیغمبر اکرم (ص) کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔

۶۔ اسلامی حکومت کے ڈھانچے کے سلسلہ میں ایک طریقہ

مذکورہ مطالب کے پیش نظریہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی حکومت کا ہدف؛ معاشرہ میں اسلامی اور معنوی اقدار کو رواج دینا ہے اور اسی کے زیر سایہ مادی مصالح کو پورا کرنا ہے، نہ کہ بالعکس (مثلاً معنوی اقدار کے زیر سایہ مادی مصالح کو پورا کرنا)، تو اب ہم کو یہ دیکھنا ضروری کہ اسلامی حکومت کا ڈھانچہ کیسا ہونا چاہئے اور جو افراد حکومت کی باگ ڈور سنبھالیں ان کے شرائط کیا کیا ہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کسی بھی حکومت میں تو وہ مجریہ کی اصلی ذمہ داری قوانین کو نافذ کرنا ہے، اس مطلب پر سبھی اتفاق رکھتے ہیں؛ اور اسلامی حکومت یعنی وہ سسٹم جو اسلامی قوانین نافذ کرنے کا ضامن اور اسی قانون کے اہداف کو پورا کرنا ہے تو اب یہ دیکھنا ہے کہ کوئی بھی حکومت ہو، چاہے مشرقی اور مارکسی حکومت ہو یا مغربی اور لیبرل حکومت یا دیگر حکومتیں، ان کے ذمہ دار افراد میں کیا کیا خصوصیات ہونا ضروری ہیں؟ اس سوال کے جواب میں عرض ہے کہ کسی بھی حکومت کے ذمہ دار افراد میں کم سے کم دو صفات کا ہونا ضروری ہے:

۱۔ قانون کی شناخت:

جو شخص نفوذ قوانین کا ضامن ہونا چاہتا ہے اگر اس کو قانون کا صحیح علم نہ ہو تو پھر وہ کس طرح قانون کو جاری کر سکتا ہے؟ قوانین سے آگاہ اور آشنا ہونا حکومتی افراد کی پہلی خصوصیت ہے تاکہ وہ اپنی ذمہ داری کو صحیح طور سے نبھاسکے، کیونکہ حکومت قوانین کو جاری کرنے کی ضامن ہوتی ہے تو اگر اس کو قوانین اور دیگر پہلوؤں کا صحیح علم نہ ہو تو پھر عملی میدان میں غلطی کر سکتی ہے اس سلسلہ میں سب سے بہترین طریقہ کاری یہی ہے کہ جو شخص حکومت میں سب سے بڑے درجہ پر فائز ہو وہ قوانین پر سب سے زیادہ علم رکھتا ہو اور ان کو اچھے طریقہ سے جانتا ہو، تاکہ اس کی غلطی کا احتمال سب سے کم ہو۔

۲۔ قوانین کو نافذ کرنے کی طاقت:

وہ حکومت جو قوانین کو نافذ کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے اس کے پاس اتنی طاقت ہو جس کے ذریعہ مورد نظر قوانین کو نافذ کر سکے، اگر کوئی حکومت ۶۰/ ملین لوگوں پر بلکہ ایک ارب لوگوں پر (مثلاً چین اور ہندوستان) حکومت کرے اور ان پر احکام اور مقررات کو جاری کرنا چاہے تو اس کے لئے کافی مقدار میں قدرت و طاقت کا ہونا ضروری ہے چنانچہ یہ مسئلہ اتنی اہمیت کا حامل ہے کہ آج کی دنیا کے بھت سے فلسفی نظریات میں حکومت کو قدرت کے برابر جانتے ہیں اور اسی ”قدرت و طاقت“ کو فلسفہ سیاست کے مہم ترین مفہیم میں سے ایک مفہوم سمجھتے ہیں بھر حال اس بات پر توجہ رہے کہ حکومت کو صاحب قدرت و طاقت ہونا ضروری ہے۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ”طاقت و قدرت“ کیا ہے؟ تو مختصر طور پر یہ سمجھئے کہ قدیم زمانہ سے انسانی معاشرہ میں تحویل و تحول کے ساتھ ساتھ قدرت و طاقت کے مختلف معنی کئے جاتے رہے ہیں، چنانچہ ابتدائی اور سادہ حکومت (۲)

میں عام طور پر حاکم یا قبیلہ کے سردار میں جسمانی قدرت شامل ہوتی تھی، کیونکہ اس زمانہ میں جو شخص حاکم ہوتا تھا اس کی جسمانی قدرت دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ہوا کرتی تھی کیونکہ اگر کوئی شخص ایک ہزار افراد پر مشتمل خاندان ہے اور اس پر حکومت کرتا تھا، اور کوئی شخص حاکم کے قوانین کی مخالف کرتا تھا تو اس کو سزا دینے کے لئے حاکم اپنی جسمانی طاقت سے استفادہ کرتا تھا لہذا طے یہ ہوا کہ اس زمانہ میں طاقت سے مراد صرف ظاہری اور جسمانی طاقت مراد ہوتی تھی۔

لیکن جب سے انسانی معاشرہ کے مسائل پیچیدہ تر ہوتے گئے اور معاشرہ نے ترقی کی تو اس وقت ایک شخص کی طاقت نے ایک کمیٹی کی صورت اختیار کر لی؛ یعنی اگر خود حاکم میں جسمانی طاقت کافی مقدار میں موجود نہ ہو تو اس کے پاس ایسے افراد ہونا چاہئے جو جسمانی اعتبار سے بھت زیادہ طاقتور اور قوی ہوں اس حاکم کے پاس طاقتور لشکر ہونا ضروری تھا، لیکن اس کے بعد جب علم و دانش نے ترقی کی تو پھر قدرت اپنے ظاہری اور فیزیکی شکل سے نکل کر علمی اور ٹیکنالوجی شکل میں تبدیل ہو گئی یعنی گویا حاکم کے پاس ایسے اسلحے و آلات ہوں جن کے ذریعہ بدنی طاقت کا کام لیا جاسکے۔

اگرچہ ایک موقع پر حاکم کو معاشرہ کا ادارہ کرنے کے لئے اس کی جسمانی طاقت ہی کافی تھی لیکن جیسے جیسے معاشرہ نے علم و فن میں ترقی کی اور بھت سے فوجی اسلحہ بنائے تو پھر حکومت کے لئے بھی ضروری ہو گیا کہ وہ بھی فیزیکی، صنعتی اور ٹیکنالوجی خصوصاً فوجی اسلحہ جات کافی مقدار میں رکھتی ہو، تاکہ خلاف ورزی کا سدباب کیا جاسکے، اور اگر کچھ لوگ شورش اور بغاوت کرنا چاہیں تو آسانی سے ان کا سر کچل دیا جائے، یا اگر کچھ لوگ دوسروں کی جان و مال کے لئے خطرہ بن رہے ہوں تو اپنی طاقت کے ذریعہ ان کو روک سکے۔

۱۔ عوام الناس میں حکومت کی مقبولیت ضروری ہے۔

جس طاقت و قدرت کے بارے میں ہم نے آپ کی خدمت میں عرض کیا وہ جسمانی اور فیزیکی طاقت میں منحصر تھی، جو ابتدائی حکومتوں میں ہوتی تھی، اس کے بعد پیشرفتہ حکومتوں میں مورد توجہ ہوتی تھی یہاں تک کہ آج کل اسی معنی میں استعمال ہوتی ہے، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حکومتیں اپنی طاقتوں کو بڑھانے میں لگی ہوئی ہیں، ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے اسلحہ خانہ کو جدید اور اہم اسلحوں سے بھر لیں تاکہ موقع پڑنے پر ان سے کام لیا جاسکے لیکن یہ توجہ رہے کہ حکومت کی طاقت اور اس کا اقتدار صرف اسی چیز میں منحصر نہیں ہے؛ بلکہ پیشرفتہ معاشرہ میں حکومت کی طاقت کو معاشرہ میں نفوذ اور لوگوں کی مقبولیت کو پہلا درجہ دیا جاتا ہے کیونکہ حکومت اپنے تمام پروگراموں اور اپنی خواہشات کو قوت بازو کے زور پر معاشرہ میں نافذ نہیں کر سکتی؛ اصل یہ ہے کہ عوام الناس اپنی خوشی اور رغبت کے ساتھ مقررات اور قوانین کو قبول کریں اور قوانین کے سامنے گردن جھکائیں لہذا طے یہ ہوا کہ جو شخص بھی قوانین کو نافذ کرنے کا ذمہ دار ٹھہرے یا سب سے اعلیٰ درجہ پر فائز ہو تو عوام الناس میں اس کی مقبولیت ضروری ہے، اور ظاہری طاقت اور قوت بازو کی بنا پر کبھی بھی ایک طولانی مدت کے لئے حکومت باقی نہیں رہ سکتی۔

پس طے یہ ہوا کہ قوانین کا جاری و نافذ کرنے والا طاقتور اور معاشرہ میں مقبولیت رکھتا ہو، یہی وجہ ہے کہ مدیریت میں بد نظمی سے روک تھام اور معاشرہ کے فوائد کو نابودی سے بچانے کے لئے حکومت کے ذمہ دار افراد میں خاص صفات کا ہونا ضروری ہے تاکہ حکومت اور قانون کے اہداف و مقاصد کو پورا کر سکیں؛ یعنی حقیقت میں حکومت کے ذمہ دار افراد اور قانون کے نافذ کرنے والے ضامن افراد کے لئے ایک خاص صلاحیت کا ہونا ضروری ہے چنانچہ اس بات کو سیاست کے فلسفہ میں مختلف طریقوں سے بیان کیا جاتا ہے جس کو معمولاً اجتماعی مشروعیت اور عام مقبولیت سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی حکومت عقلانی طریقہ کار کو اپنائے اور قوانین کو نافذ کرنے میں صحیح طریقہ بروئے کار لائے، اور عوام الناس بھی اس کے لئے قانونی اعتبار کے قائل ہوں قوانین کو نافذ کرنے والے ذمہ دار افراد کے لئے صاحب اقتدار ہونے کے ساتھ ساتھ (تاکہ قوانین کی مخالفت سے روک تھام ہو سکے) عوام الناس بھی ان کے اعتبار کے قائل ہوں اور حکومت کو انہیں کا حق سمجھے۔

قارئین کرام! خلاصہ یہ ہوا کہ اقتدار کی تین قسمیں ہیں پہلی اور دوسری قسم دوسرے تمام ہی معاشروں میں جانی پہنچانی ہیں، اگرچہ ان کو جاری کرنے کے سلسلہ میں مختلف قسم کے نظریات اور طریقہ کار پائے جاتے ہیں، لیکن ہماری نظر میں جس چیز کی زیادہ اہمیت ہے وہی تیسری قسم کا اقتدار (مقبولیت عام) ہے۔

حوالے:

(۲) اسی شخص نے مغربی لیبرل "Liberal" آزادی خواہ نظریہ کی بنیاد رکھی، جو آج کل کی سیاسی گفتگو اور یونیورسٹی وغیرہ میں بیان ہوتی ہے اور کم و بیش سبھی لوگ اس کو قبول کرتے ہیں

(۳) مثلاً ہزاروں سال قبل تقریباً دنیا بھر میں قبائلی حکومتیں ہو کر تھیں

پچیسواں جلسہ

حکومت کی عظیم منصوبہ بندی ۲

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

ہم نے اس سے قبل بھی یہ بات عرض کی تھی کہ مغربی ممالک کے منحرف اور الحادی نظریات کا ذہن اور اسلامی اعتقادات پر اثر انداز ہونا، اسی طرح مغربی ممالک کے پٹھووں، غلاموں وغیرہ کی اسلامی معاشرہ اور دینی اعتقادات میں شک و تردید ایجاد کرنے کے لئے بھرپور اور حساب شدہ کوششیں کرنا، نیز اسلام کی اصل ثقافت اور کلچر میں سیاسی اور ثقافتی مشکلات کا ایجاد کرنا، یہ تمام چیزیں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ اسلام کے مفکرین اور اسلام کے محافظ افراد جو کہ اسلام کی گھری معلومات اور وسیع ثقافت سے واقف بھی ہوں ان کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہو اور اس سلسلہ میں اساسی، بنیادی اور مفید گفتگو کا آغاز کریں منجملہ ”اسلامی سیاسی نظریہ“ وغیرہ کو سادہ اور روان الفاظ میں اسلامی معاشرہ کے سامنے پیش کریں، جو علی القاعدہ تخصصی، فنی اور اکیڈمیک طریقہ پر یونیورسٹیوں میں بیان ہوتی ہے۔

اس وقت ہمارے معاشرہ کو اسلام کی ہمیشگی ثقافت، کلچر اور عظیم میراث کا پاس و لحاظ رکھنا ضروری ہے تاکہ دشمنان اسلام کے ثقافتی حملوں کا مقابلہ کیا جاسکے، اور ان چیزوں کو اپنی آئندہ نسل میں صحیح و سالم چھوڑ کر جائے، جو اسلامی اور انقلابی اہداف کے لئے بھت ہی زیادہ ضرورت مند ہیں لہذا اس ہدف تک پہنچنے کے لئے علمی اور باریک مسائل کو آسان زبان میں پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اکثر عوام الناس اس کو سمجھ کر ہضم بھی کر سکے، اور ان کو علمی اور مشکل اصطلاحات میں پھنسنے سے نجات بھی مل جائے۔

چنانچہ ہم نے مذکورہ ہدف کے پیش نظریہ طے کیا کہ اس طرح کے مسائل ”اسلامی سیاسی نظریہ“ کے تحت دو حصوں میں بحث کریں جس کا پہلا حصہ مکمل ہو چکا ہے، جس میں یہ بیان کیا گیا کہ انسانی معاشرہ کے لئے قانون کی ضرورت ہے اور یہ بھی بیان کیا گیا کہ اسلامی نقطہ نظر سے قانون کا بنانے والا صرف خدا یا وہ افراد جو خداوند عالم کی طرف سے اذن یافتہ اور قانون گذاری کی کافی و وافی صلاحیت رکھتے ہوں چنانچہ اس سلسلہ میں بحث ہو چکی ہے، ضمناً اس سلسلہ میں ہونے اعتراضات کے بھی جلسوں کے لحاظ سے جوابات دئے گئے۔

اور ہماری بحث کا دوسرا حصہ حکومت بمعنی خاص کے سلسلہ میں ہے، درحقیقت پہلے حصے میں حکومت بمعنی عام (جس میں قوہ مقننہ (پارلیمنٹ) بھی شامل تھی) کے بارے میں گفتگو ہوئی جس کے تحت قانون اور قانون گذاری کے سلسلہ میں بحث ہوئی لیکن اس وقت ہماری بحث حکومت بمعنی خاص؛ یعنی قوہ مجریہ کے بارے میں ہے۔

۲۔ حکومت، انسانی معاشرہ کی دائمی اور ہمیشگی ضرورت ہے۔

حکومت کی مختلف شکل و صورت اور ڈھانچوں کو چھوڑتے ہوئے (کیونکہ اس کی بحث اپنی جگہ ہوگی) جیسا کہ ہم نے پہلے جلسہ میں بھی اشارہ کیا؛ تمام سیاسی صاحب نظر افراد، معاشرہ کے لئے حکومت پر اتفاق رائے رکھتے ہوئے اس کو ضروری مانتے ہیں صرف "آنارشیست" "Anarchiste" (مفسدہ جویان) معاشرہ کے لئے حکومت کے قائل نہیں ہیں، یونانی قدیم فلسفہ کے زمانہ میں اس گروہ کے طرفدار پائے جاتے تھے، جن کا عقیدہ یہ تھا کہ اگر عوام الناس قوانین کو پہنچانے اور اخلاقی عہد پر عمل کریں تو پھر ان کو حکومت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تھیوری کسی بھی وقت اور کسی جگہ عملی نہیں ہوتی جبکہ اس کے مقابلہ میں عملی طور پر تمام معاشروں میں حکومت کی ضرورت کا احساس ہوا، اور یہ احساس اسی طرح سے آج تک باقی ہے۔

ہم اپنے بھائیوں کے لئے حکومت کی ضرورت کے نظریہ کو مزید روشن کرنے اور ان کو بعض مغالطوں کے جال میں پھنسنے سے بچانے کے لئے عرض کرتے ہیں کہ مذکورہ نظریہ پر سب کا اتفاق ہے اور انسانی معاشرہ کی واقیعات کی شناخت پر مبنی ہے، اس کی وضاحت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مخلوقات، روحیات، معاشرہ کے نشیب و فراز اور واقیعت سے آنکھیں بند کر کے ایک بند کمرہ میں اس چیز پر تجزیہ و تحلیل کرے اور انسانوں کو بالکل فرشتوں جیسا تصور کرے جو خیر خواہی اور فضائل کے حصول میں لگے ہوئے ہیں اور پاک و پاکیزہ خصلت و عادت کے مالک ہیں اس کی نظر میں اگر تعلیم کا نظام اور صحیح تربیت عام ہو جائے اور عوام الناس تربیتی لحاظ سے مودب ہو جائیں کہ اپنے اخلاقی خواہش کے تحت قانون کے سلسلے میں عہد کریں اور اس پر عمل کریں اور (کبھی بھی) مخالفت نہ کریں، اسی طرح اگر صحیح قوانین اور معاشرہ یا شخص کے فوائد، نیز قانون شکنی کے مفاسد و نقصانات عوام الناس کے لئے بیان ہو جائیں، اور پھر صحیح راستہ کا انتخاب ان کے اوپر چھوڑ دیا جائے تو پھر کوئی بھی شخص قانون کی مخالفت نہیں کرے گا بلکہ قوانین کے مطابق عمل کرے گا بالکل اسی شخص کی طرح جس کو یہ معلوم ہو کہ اس کھانے میں زھر ملا ہوا ہے تو وہ اس کھانے کو نہیں کھائے گا، اسی طرح عوام الناس بھی ایسے کام کریں گے جو ان کے مفاد میں ہوں اور وہ کام جو ان کے یا معاشرہ کے لئے نقصان دہ ہوں گے ان کو انجام نہیں دیں گے لہذا حکومت اور قوانین کو تکمیل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔!!

قارئین کرام! مذکورہ نظریہ ایک خیالی پلاؤ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کیونکہ جو لوگ انسانی زندگی اور معاشرتی زندگی کی واقیعات سے باخبر ہیں یا وہ افراد جو تاریخ بشریت اور گذشتہ معاشروں کی تاریخ سے مطلع ہیں، ہرگز یہ احتمال نہیں دے سکتے کہ کم سے کم آئندہ نزدیک میں اس طرح کا ماحول پیدا ہو جائے گا کہ لوگوں کے درمیان اخلاقی اقدار کے رائج اور پھیلنے کے بعد تمام لوگ آٹومیٹک طریقہ پر نیک کام کرتے ہوئے نظر آنے لگیں، اور ان کو برے کاموں کی ہوا تک نہ لگے، کوئی بھی جھوٹ نہ بولے، خیانت نہ کرے، لوگوں

کے مال اور ناموس (عورتوں) کی طرف بری نظر نہ اٹھائے، لوگوں کے حقوق پر تجاوز اور ظلم نہ کرے اسی طرح بین الاقوامی مسائل کے سلسلہ میں کوئی ملک اپنے پڑوسی ملک پر ظلم نہ کرے!!

۳۔ حکومت کی ضرورت پر اسلام اور قرآن کا نظریہ

اسلام نے بھی بغیر حکومت کے معاشرہ کو (کہ اس کی صحیح تربیت ہو جائے نیز مصالح و مفاسد اور قوانین کے آشنائی ہونا کافی ہے) ایک خیال خام اور حقیقت سے دور بیان کیا ہے، اسی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت سے متعلق آیات میں، خلقت انسان کو اس طرح بیان کیا ہے کہ انسان کے نقاط ضعف اور اس میں خطا و لغزش کا امکان ظاہر ہوتا ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾^(۱)

”اے رسول! اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں اور انہوں نے کہا کہ کیا اسے بنائے گا جو زمین پر فساد برپا کرے اور خونریزی کرے جب کہ ہم تیری تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں تو ارشاد ہوا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو۔“ جس وقت فرشتوں نے انسان کے بارے میں اجتماعی فساد اور خونریزی کے بارے میں خبر دی تو خداوند عالم نے اس کا انکار نہیں کیا بلکہ ان کے جواب میں انسانی خلقت کی حکمت کی طرف اشارہ کیا جس سے فرشتہ باخبر نہیں تھے۔

اسی طرح دوسری آیات میں انسان کی بعض کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے، منجملہ یہ آیات:

۱۔ ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا﴾^(۲)

”بیشک انسان بڑا المالچی پیدا ہوا ہے جب اسے تکلیف چھو بھی گئی تو گھبرا گیا اور جب اسے ذرا فراخی حاصل ہوئی تو بخیل بن بیٹھا“

۲۔ ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ﴾^(۳)

”بے شک انسان بڑا ظالم اور انکار کرنے والا ہے۔“

واقعاً یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ مذکورہ آیت میں خداوند عالم نے انسان کو ”ظلوم“ کے نام سے پہنچنویا ہے جو مبالغہ کا صیغہ ہے اور بھت ظلم کرنے والے کے معنی میں ہے اور انسان کو اس نام سے یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر ظلم، سرکشی اور ناشکری اس قدر ہے کہ اس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا اور ہمیشہ انسانی معاشرہ ظلم اور ناشکری سے بھرا ہوا ملے گا، تو پھر یہ نظریہ قابل قبول نہیں ہے کہ تعلیم و تربیت اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کے ذریعہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جاسکتا ہے جس میں تمام افراد

کا اچھا اور پسندیدہ کردار ہو، اور کوئی ایک انسان بھی قوانین اور اخلاقی اقدار سے سرپیچی نہیں کمرے گا، اور اس صورت میں حکومت اور طاقت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید بھی اس نظریہ کا مخالف ہے، جبکہ موجودہ حقائق نے بھی یہ بات واضح کر دی کہ انسانی معاشرہ میں مختلف وجوہات کی بنا پر ہمیشہ جرائم اور مخالفت رہی ہے البتہ بعض افراد نے جرائم کے اسباب اور جرائم کی وجوہات کے بارے میں پتہ لگایا ہے اور جھل و نادانی اور وراثتی عوامل وغیرہ کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن اس وقت ہم اس کو بیان نہیں کرنا چاہتے، ہم تو یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ انسانوں کے درمیان قانون کی مخالفت اور جرائم اور گناہ کا ارتکاب ہمیشہ رہا ہے جس کے پیش نظر آسانی کے ساتھ یہ پیشن گوئی بھی کی جاسکتی ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہی رہے گا۔

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ خداوند عالم کے لطف و کرم سے ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا جب حضرت امام زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کے ہاتھوں ایک اسلامی نمونہ معاشرہ تشکیل پائے گا لیکن پھر بھی اس بات پر توجہ رہے کہ اس زمانہ میں بھی قوانین کی مخالفت اور گناہ انجام دئے جائیں گے، اس کے علاوہ وہ معاشرہ بھی ہمیشہ نہیں رہے گا یہاں تک کہ بعض روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ حضرت ولی عصر امام زمانہ (ع) کی مخالفت میں قیام کیا جائے گا اور آپ (ع) کو شہید کر دیا جائے گا۔

پس ہمیں اس چیز کی توقع نہیں رکھنا چاہئے کہ حضرت امام مہدی (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کے زمانہ حکومت میں ایک نمونہ اور مطلوب معاشرہ تشکیل پائے گا جو گناہ اور نافرمانی سے بالکل پاک و پاکیزہ ہوگا البتہ امام علیہ السلام کی حکومت اور طاقت کا استعمال اس طریقہ سے ہوگا کہ اس میں کسی طرح کے ظلم و جور کو بغیر جواب دئے نہیں چھوڑا جائے گا نیز اس زمانہ میں عدالت عام ہو جائے گی، اسی بنا پر معاشرہ میں جرائم و گناہ کم ہو جائیں گے، لیکن بالکل ہی ان کا خاتمہ نہیں ہوگا؛ کیونکہ انسان فرشتوں کی طرح نہیں بن سکتا، اور اس کی فطرت انسانی رہے گی، اس میں گناہ و عصیان اور جرائم کے امکانات پائے جائیں گے۔

لہذا طے یہ ہو گیا کہ ان تمام حقائق کے پیش نظر حکومت کا ہونا ضروری ہے لیکن اگر کوئی شخص گھر کے ایک کونے میں بیٹھ کر اپنے محدود ذہن میں اس طرح کے معاشرہ کا تصور کرے کہ اخلاقی اور تربیتی ترقی کے بعد ایک ایسا معاشرہ پیدا ہو جائے جس میں کسی بھی طرح کا کوئی ظلم و فساد نہ ہو تو یہ بات حقیقت جامعہ سے بھت دور ہے واقعا عوام الناس کے درمیان جائے اور ان کے کاموں کا مشاہدہ کرے کہ کس طریقہ سے نیکیوں اور اچھائیوں کے ہوتے ہوئے بھی گناہ و انحراف کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ جو لوگ اخلاقی مسائل کو اہمیت نہیں دیتے ان کی بات تو الگ ہے جو افراد نیک اور اچھے ہوتے ہیں ان سے بھی کبھی کبھی گناہ اور مخالفت ہو جاتی ہے تو پھر یہ بات ظاہر ہے کہ جرائم اور تخلفات کی روک تھام کے لئے معاشرہ میں مناسب اور شائستہ قوانین^(۴) کا نفاذ ضروری ہے، کیونکہ جب معاشرہ میں قوانین نافذ ہونے کے لئے بنائے گئے ہیں تو پھر ان کو نافذ کرنے والے ضامن کی ضرورت ہے حکومت کے وجود کے لئے سب سے عمدہ اور بہترین دلیل؛ معاشرہ میں مختلف طریقوں سے قوانین کو نفاذ کرنے کی ضمانت ہے،

اور اسی چیز کو ہم بیان کرنا چاہتے ہیں، انشاء اللہ ہم اپنی آئندہ بحث میں حکومت یا حکومتی شعبہ جات وغیرہ کی ذمہ داریوں اور اس کے اختیارات کی بحث کریں گے

۲ طاقت و قدرت کی ضرورت

قارئین کرام! قانون بغیر متولی کے نہ رہے اور ان کی تعطیل نہ ہو جائے اور جرائم و خلاف کاریوں کی روک تھام کی جاسکے، اسی طرح معاشرہ کے امن و امان کو خطرہ میں ڈالنے کی سازشوں کا سدباب کیا جاسکے اور اسی طرح ملک اور اسلامی معاشرہ پر خارجی دشمنوں کے ہجوم کو روکا جاسکے تو ان تمام چیزوں کے لئے ایک طاقتور حکومت کا ہونا ضروری ہے، تاکہ قوانین کو جاری کرنے، دیگر امور کی تشریح، عقائد اور اقدار کی حفاظت کرنے اسی طرح معاشرہ کی اندورنی اور بیرونی امنیت کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری کو نبھایا جاسکے اسی وجہ سے سیاسی فلسفہ میں ”مفہوم قدرت“ کو ایک بنیادی مفہوم قرار دیا گیا ہے یہاں تک ان لوگوں کے نزدیک بھی جنہوں نے ”سیاست“ کو ”علم قدرت“ سے تعبیر کیا ہے۔ اب جبکہ حکومت اور قوہ مجریہ کا وجود ثابت ہو گیا اور یہ بھی بیان ہو گیا کہ حکومت کا صاحب اقتدار اور صاحب طاقت ہونا ضروری ہے، یہ سوال پیش آتا ہے کہ قدرت کا سرچشمہ کیا ہے؟ اور کس بنیاد پر حکومت کے عہدہ دار قدرت اور اقتدار رکھتے ہوں تاکہ جرائم سے روک تھام اور قوانین کو نافذ کرنے کے ذمہ داری کو پورا کر سکیں؟ چنانچہ فلسفہ سیاست کے بارے میں بھت زیادہ فنی اور خاص بحثیں ہوئی ہیں لیکن ہم اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کو روان اور سادہ زبان میں عرض کرتے ہیں۔

انسانی معاشرہ میں ہمیشہ سے بعض افراد بعض وجوہات کی بنا پر مثل کم عقلی، (ادواری) جنون، جبری تربیت یا اسی طرح کی دوسری چیزوں کی بنا پر جرائم کے مرتکب ہوتے رہے ہیں، مثلاً کسی جگہ آگ لگا دے تے ہیں، چاقو یا رولور کے ذریعہ کسی بے گناہ انسان پر حملہ آور ہو جاتے ہیں اسی طرح دوسرے جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں کہ الحمد للہ ہمارے ملک میں جرائم کی تعداد کم ہے لیکن آج کے ترقی یافتہ ممالک (یورپ اور امریکہ وغیرہ) میں جرائم کی تعداد کھیں زیادہ ہے؛ جیسا کہ بعض معتبر اخباروں کے ذریعہ یہ خبر ملی تھی کہ کسی ایک ملک کے پائے تخت میں ہر ایک منٹ میں کئی قتل ہوتے ہیں یا ایک دوسرے ملک کی پائے تخت میں ہر آدھے منٹ میں ایک قتل ہوتا ہے^(۵) اور یہ رپورٹ ان ملکوں کے سرکاری اخباروں کے ذریعہ نشر ہوتی ہے، در اگر ہمارے ۶۰/۱ ملین افراد والے ملک میں کبھی کوئی قتل ہو جاتا ہے تو ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ کیوں ہمارے اسلامی ملک میں ایک ایسا حادثہ پیش آیا!!

خلاصہ یہ کہ اس طرح کے جرائم اور خلاف ورزیوں سے مقابلہ کرنے کے لئے حکومت ظاہری اور مادی طاقت رکھتی ہو جس وقت کسی بے گناہ انسان پر ظلم و ستم ہو، یا کسی پر شدت سے تجاوز ہوتا ہے یا کسی جگہ پر چوری ہوتی ہے یا ڈاکا پڑتا ہے، تو ایسے

مقامات پر حکومت کے بعض افراد (پولیس) اپنی بھرپور طاقت کے ذریعہ ان جرائم کا مقابلہ کریں تاکہ قوانین کے نفاذ کی ضمانت ہو سکے۔

قارئین کرام! قوانین کو جاری کرنے اور ان کی ضمانت کے امکان کے لئے نیز مجرموں سے مقابلہ کرنے کے لئے پہلی شرط ظاہری، مادی اور جسمانی طاقت کا ہونا ضروری ہے اگرچہ ٹکنالوجی کی ترقی کے ساتھ اسلحہ وغیرہ میں بھی ترقی ہوئی ہے جن کی وجہ سے مجرموں کے ہاتھوں میں نئے نئے قسم کے اسلحے ہوتے ہیں، اسی طرح ادھر حکومت نے بھی مجرموں کو سزا دینے کے لئے الیکٹرانک مشینیں ایجاد کر لی ہیں، لیکن پھر بھی ان قوانین کو جاری کرنے والے کے لئے جسمانی طاقت سے بھرہ مند ہونا ضروری ہے چنانچہ اسی ضرورت کے تحت تمام حکومتوں کے پاس چاہے چھوٹی ہوں یا بڑی، ترقی یافتہ ہوں یا غیر ترقی یافتہ؛ تمام کی تمام ان جرائم اور ظلم و ستم سے مقابلہ نیز اندرونی امنیت کی برقراری کے لئے پولیس کا انتظام کرتی ہے اور ان کو اپنے حساب و کتاب سے اسلحہ وغیرہ دیتی ہے اور حکومت جتنی چھوٹی ہوگی اس کے پاس اسلحہ وغیرہ سادہ اور کمتر ہوگا اور اگر حکومت بڑی، ترقی یافتہ اور پیچیدہ تر ہوگی اسی حساب سے اس کی پولیس بھی جدید طریقہ اور ترقی یافتہ اسلحوں سے لیس ہوگی۔

اس بنا پر ہر ملک کی پولیس کا مختلف قسم کے تمام تر اسلحوں سے لیس ہونا ضروری ہے، اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حکومت بغیر قدرت کے عملی طور پر قوانین کو نافذ نہیں کر سکتی لہذا طے یہ ہوا کہ ہر معاشرہ میں قوہ قہریہ (پولیس) کا ہونا ضروری ہے تاکہ جرائم پیشہ لوگ اس سے ڈریں اور جرائم کے قریب نہ جائیں اور اگر جرائم کے مرتکب ہو گئے ہیں تو ان کو سزا مل سکے۔

۵۔ مدیروں میں تقویٰ اور اخلاقی صلاحیت ہونا ضروری ہے

قارئین کرام! اب تک کی باتوں سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ قوانین کو نافذ کرنے، امن و امان کو باقی رکھنے، جرائم اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز سے روک تھام کے لئے حکومت کے پاس سبھی طرح کی طاقت کا ہونا ضروری ہے لیکن یہ بھی توجہ رکھنا ضروری ہے کہ اس عہدہ کی حفاظت اور قوانین کو نافذ کرنے اور اس کی ضمانت کے لئے صرف جسمانی اور اسلحہ کی طاقت اور مادی محارتیں کافی نہیں ہیں بلکہ وہ شخص جو قوانین جاری کرنے کے لئے منتخب ہو اور اس ہدف کی خاطر ضروری امکانات اور اسلحہ جات اس کے اختیار میں دئے جائیں تو اس کو صاحب تقویٰ اور اخلاقی صلاحیت کا مالک ہونا چاہئے، کیونکہ اگر کوئی صاحب تقویٰ نہ ہو تو جو طاقت اس کے اختیار میں دی گئی ہے نہ صرف یہ کہ فائدہ نہیں دے گی بلکہ اس سے معاشرہ کا نقصان ہوگا اور معاشرہ کے لئے بھت سی مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں، کیونکہ وہ اس طاقت اور قدرت سے سوء استفادہ کرے گا اسلامی انقلاب کی کامیابی سے پہلے اور ملت ایران کے شاہ سے مقابلہ کے دوران حضرت امام خمینی (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک بیان میں فرمایا جس کا مضمون یہ ہے کہ اسلحہ نیک اور شائستہ افراد کے ہاتھوں میں دیا جائے، تاکہ شاہ سے مقابلہ کے دوران، ان کا ہدف عوام الناس کے حقوق دلانا

اور اسلام کی حاکمیت کو برقرار رکھنا ہو، نہ یہ کہ وہ صرف قدرت پر قبضہ کرنا چاہیں؛ لیکن اگر اسلحہ غیر شائستہ لوگوں کے ہاتھوں میں چلا گیا، تو درحقیقت یہ قدرت؛ طاقتور شیطان کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے کہ جس کا نتیجہ معاشرہ میں فتنہ و فساد اور تباہی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا۔

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ صرف ظاہری قدرت معاشرہ کے منافع و مصلح کی ضامن نہیں ہو سکتی، بلکہ جو شخص قوانین کو جاری کرے اور قدرت کو اپنے ہاتھوں میں لے لے تو اس میں مادی اور ظاہری مہارت کے علاوہ تقویٰ اور اخلاقی شائستگی کا ہونا ضروری ہے پس اس صورت میں حکومت اپنے تمام تر امکانات اور طاقت و قدرت کے ساتھ، نیز ان امکانات سے صحیح طریقہ سے استفادہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوئے معاشرہ کی اصلاح کے لئے صحیح رجحان کے تحت اپنی پوری طاقت صرف کر دے، اور میدان عمل میں ہوئی و ہوس اور ذاتی مفاد کا شکار نہ ہو لیکن اگر کوئی شخص تقویٰ اور اخلاقی صلاحیت سے بھرہ مند نہ ہو، اور اس کے ہاتھ طاقت اور مادی امکانات آجائیں تو اس کو غرور ہو جاتا ہے اور ہوئی و ہوس، شیطانی خواہشات اور جاہ طلبی وغیرہ کے لئے اس قدرت کو استعمال کرنے لگتا ہے، جس کے نتیجہ میں صحیح راستے سے منحرف ہو جاتا ہے اور معاشرہ میں تباہی و بربادی کے علاوہ کچھ اور نہیں کر پاتا اس صورت میں معاشرہ میں اس کا نقصان اور ضرر عام تباہ کار سے زیادہ ہوتا ہے؛ جیسا کہ فاسد بادشاہ جس ظلم و بربریت کے مرتکب ہوتے ہیں اس کا دوسرے جرائم سے مقابله اور مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

البتہ قانون کا جاری کرنے والا، قانون اور اس کے مختلف پہلوؤں کی بحد کافی شناخت رکھتا ہو؛ کیونکہ حکومت قانون کو جاری کرنے کے لئے ہوتی ہے اور حکومتی افراد جس عہدہ پر بھی ہوں؛ قانون کے مجری ہونے کے ناطے قانون سے بحد کافی آگاہی رکھتے ہوں ورنہ تو اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے قانون کی خلاف ورزی نہ کرنا چاہے اور قانون پر عمل کرنے کا مصمم ارادہ رکھتا ہو، لیکن چونکہ قانون سے صحیح طریقہ سے آشنا نہیں ہے مقام عمل میں غلطی کا امکان پایا جاتا ہے، اسی طرح قانون کو اس کے مصداق پر تطبیق کرنے پر بھی قادر نہیں ہو سکتا، درحالیکہ ایسا شخص بری نیت بھی نہیں رکھتا اور اخلاقی صلاحیت سے بھی بھرہ مند ہوتا ہے لیکن چونکہ قانون کے بارے میں علم نہیں رکھتا اور قانون سے صحیح نتیجہ بھی نہیں نکال سکتا جس کے نتیجہ میں منحرف ہو جائے گا اور غلط راستہ پر چل پڑے گا اور عملی میدان میں معاشرہ کے منافع کو پامال کر دے گا۔

بنا برین مجری قانون کو قانون سے آشنا ہونا چاہئے، وہ قانون جاری کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہو اور تقویٰ و اخلاقی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ البتہ متون دینی میں فقہیہ کے لئے یہ تین شرطیں قانون جاری کرنے کی قدرت اور مدیریت بیان کی گئی ہیں، لیکن ان تینوں کلی شرطوں کے بھت سے اجزاء ہیں کہ ہم اس وقت ان کو بیان نہیں کر رہے ہیں چونکہ ہم کلیات بیان کر رہے ہیں جزئیات نہیں

۶۔ فلسفہ سیاست میں حکومت کی مشروعیت

قارئین کرام! اس سلسلہ میں ایک بحث کا بیان کرنا مقصود ہے جیسا کہ گذشتہ جلسہ میں بھی اس چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ حکومت کی مشروعیت (حق حکومت) اور اس کے قانونی ہونے کا معیار و ملاک کیا ہے؟ لہذا اس چیز کی تحقیق اور جائزہ لینا ضروری ہے کہ کن معیار کے تحت ایک ملت کی حکومت کو کسی شخص یا کسی پارٹی کے سپرد کی جاسکتی ہے تاکہ وہ قدرت سے استفادہ کر سکے واقعاً یہ بحث فلسفہ سیاست کی ایک اصل اور بنیادی بحث ہے اور اس کو مختلف نظریات کی بنا پر مختلف طریقہ سے مورد بررسی و تحقیق قرار دیا گیا ہے اور اس کو بیان کرنے کے لئے بھی مختلف تعبیریں پیش کی گئی ہیں ان میں سے ایک تعبیر ”قدرت اجتماعی“ کے نام سے موجود ہے جسے عوام الناس تسلیم نہیں کرتی، یعنی حکومتی افراد کے اندر مادی و جسمانی اور مدیریت کی قدرت کے علاوہ ایک دوسری قدرت بھی ہو جس کو ”قدرت اجتماعی“ کہا جاتا ہے اب سوال یہ ہوتا ہے کہ حکومت قدرت اجتماعی کی مشروعیت اور قانون کو جاری کرنے کا حق کہاں سے حاصل کرتی ہے؟ ایک چہ کروڑ افراد کی آبادی میں بھت اہم شخصیات، ماہر افراد اور شائستہ افراد ہوتے ہیں، ان میں سے کس طرح ایک شخص حکومت کی لگام کو ہاتھ میں لے سکتا ہے؟ کون اس قدرت کو اس کے حوالہ کرتا ہے؟ بنیادی طور پر حکومت اور اس کے ذمہ دار افراد کی مشروعیت (اور جواز حکومت) کہاں سے آتی ہے؟

اس سلسلہ میں مختلف صاحب نظروں نے مختلف جوابات دئے ہیں، لیکن آج کی دنیا میں رائج اور متفق علیہ جواب یہ ہے کہ حکومت یا رئیس حکومت کو یہ طاقت عوام الناس دیتی ہے گویا یہ قدرت عوام الناس کے ارادہ و مرضی سے کسی کو دی جاتی ہے، اور اگر کوئی شخص اس قدرت پر کسی دوسرے راستے سے قابض ہو جاتا ہے وہ قدرت مشروعیت نہیں رکھتی اس قدرت کو کسی شخص کے لئے اپنے آباء و اجداد سے ارث میں لینا ممکن نہیں ہے؛ جیسا کہ (انقلاب سے پہلے) شاہ کی حکومت کا یہ نظریہ تھا کہ قدرت اور حکومت میراثی ہے مثلاً جب کوئی سلطان اس دنیا سے جائے تو اس کا بیٹا میراث کے عنوان سے اس پر قابض ہو جائے اور اس میں عوام الناس کا کوئی کردار نہ ہو اگرچہ حکومت کا یہ طریقہ آج بھی بعض ملکوں میں رائج ہے، لیکن آج کی دنیا میں موجود کلچر اس سسٹم کو قبول نہیں کرتا اور یہ تھیوری عام لوگوں کی نظر میں قابل قبول نہیں ہے، اور ایسا نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص عوام الناس پر حکومت کی بہترین صلاحیت رکھتا ہے تو اس کا بیٹا بھی وہی صلاحیت اور شائستگی رکھتا ہو اس کے علاوہ عوام الناس اس طریقہ کار کو اچھا نہیں سمجھتی، بلکہ اس کے خلاف دیکھنے میں آیا ہے اور بھت سے ایسے مورد دیکھے گئے ہیں جن میں میراثی حاکم سے بہتر اور مناسب افراد موجود ہو جاتے ہیں۔

قارئین کرام!

چونکہ بادشاہت اور سلطنت کا سسٹم آج کے زمانہ میں قابل قبول نہیں ہے اور اس کی مخالفت بھی ہوتی رہی ہے، کیونکہ بعض بادشاہی نظام میں اس طرح کی کوشش کی گئی ہے کہ بادشاہت برائے نام باقی رہ گئی، اور بادشاہ سے قدرت چھن گئی ہے اور جو شخص عوام الناس کا منتخب شدہ ہوتا ہے مثلاً وزیر اعظم؛ یہ طاقت اس کے حوالہ ہو جاتی ہے درحقیقت ان ممالک میں صرف بادشاہت کا نام باقی ہے جب کہ واقعی قدرت اس سے چھن چکی ہے۔

پس عام عقیدہ اور آج کل کے زمانہ میں رائج ڈیموکریٹک "Democratic" نظام کے تحت جو شخص حکومت کرنے کی صلاحیت اور قوانین کو نافذ کرنے کی طاقت اپنے ہاتھ میں لیتا ہے وہ عوام الناس کا منتخب شدہ ہو، اور صرف عوام الناس کے ارادہ و مرضی کے ذریعہ حکومت مشروعیت پیدا کرتی ہے البتہ عوام الناس کا طریقہ انتخاب اور ان کے نظریات مختلف ہوتے ہیں، اور اس سلسلہ میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں، مثلاً بعض ممالک میں صدر حکومت کو عوام الناس اپنی اکثریت سے براہ راست انتخاب کرتی ہے، جبکہ بعض ملکوں میں حکومت کے رئیس کو پارٹیاں اور پارلیمنٹ کے ممبران انتخاب کرتے ہیں، درحقیقت ممبر آف پارلیمنٹ عوام الناس اور رئیس حکومت کے درمیان واسطہ کے کام کرتے ہیں بھر حال جو شخص براہ راست یا بالواسطہ عوام الناس کی اکثریت سے انتخاب ہوتا ہے اس کو حکومت اور قدرت مل جاتی ہے اور اس کے بعد وہ اجرائے قانون کی سب اہم شخصیت اور معاشرہ کی رہبری اور ہدایت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے۔

البتہ عوام الناس کی طرف حاکم کو حکومت دینا ایک ظاہری اور فیزیکی چیزوں میں سے نہیں ہے کہ مثلاً عوام الناس اپنے پاس سے کوئی چیز نکال کر اس حاکم کو دیں یا اس کے جسم میں کوئی خارق العادہ طاقت ایجاد کریں بلکہ یہ حکومت غیر مادی ہے جو عوام الناس کی موافقت سے حاکم کے لئے وجود میں آتی ہے لہذا اسی قرارداد کے تحت یہ عہد کیا جاتا ہے کہ مثلاً دو سال، چار سال، سات سال یہاں تک کہ زندگی بھر کے لئے (ان قوانین کے تحت جو آج کے زمانہ میں مختلف ممالک میں رائج ہیں) ان کا حاکم مقرر ہو، اور عوام الناس اپنے منتخب شدہ حاکم کے فرمان کے تحت باقی رہیں۔

اس فرضیہ کے مطابق حکومت اور قوانین کا مجری، عوام الناس سے اپنی قدرت حاصل کرتا ہے، اور اگر عوام الناس کے موافق نہ ہو تو پھر وہ (صحیح) کام نہیں کر سکتا اس نظریہ اور تھیوری کے لئے مختلف دلائل پائے جاتے ہیں جن میں سے بعض فلسفی ہیں، بعض انسانی معرفت کے پہلو رکھتے ہیں اور بعض صرف اعتباری ہوتے ہیں یا عینی اور خارجی تجربوں کی بنا پر قائم ہوتے ہیں؛ یعنی تجربہ اور مختلف حکومتوں کی شکلوں کے مشاہدہ کے بعد اس قسم کی حکومت کو بہترین اور مفید ترین طریقہ قرار دیا گیا ہے۔

قارئین کرام! یہ بات قابل توجہ ہے کہ عوام الناس کی طرف منتخب شدہ شخص کو قدرت دینے کے طریقہ کار اور اس کی تحقیق و بررسی کے لئے ایک طولانی گفتگو درکار ہے کہ اگر خداوند عالم نے توفیق دی تو اس سلسلہ میں بعد میں بیان کریں گے (انشاء اللہ) لیکن یہاں پر صرف مختصر طور پر عرض کرتے ہیں کہ مشروع حکومت تشکیل ہونے کے بعد عوام الناس کا حکومت کے قوانین کو

قبول کرنا ضروری ہے اور اس کی فرمانبرداری اور اطاعت پر موافقت کریں اس مطلب پر قبل اس کے دوسرے مکاتب اور مذاہب بیان کریں اسلام نے بیان کرتے ہوئے قبول کیا ہے عوام الناس کی شرکت اور ان کی طرف سے عہدہ داران کا انتخاب کرنا اور اس موضوع پر عام موافقت، قدیم زمانہ سے اسلامی معاشرہ میں یہ تھیوری نہ صرف بیان ہوئی ہے بلکہ اس پر عمل بھی ہوا ہے کیونکہ اگر کوئی میراثی یا طاقت کے بل بوتے پر دوسروں پر حاکم بن جائے تو نہ صرف یہ کہ عملی میدان میں اس کی شکست ہے بلکہ اسلام کی نظر میں بھی یہ طریقہ کار محکوم (غیر مقبول) ہے لہذا دین اور اسلام نے اس پر صحیح کا نشان لگایا ہے کہ تمام لوگوں کی موافقت اور عام مقبولیت ہونے ضروری ہے اس میں کوئی بحث نہیں ہے، لیکن یہاں پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ کیا اسلام کی نظر صرف عوام الناس کا اس حکومت کو مشروعیت دینے میں قبول کر لینا کافی ہے، اور قانونی نقطہ نظر سے اسلامی حکومت میں جیسا کچھ ہوا ہے یا ہوگا صرف عوام الناس کی موافقت کا نتیجہ ہے؟

بعض اخباروں، کتابوں اور مقالات میں لکھا جاتا ہے کہ آج کی دنیا میں ”مقبولیت“ اور ”مشروعیت“ ایک ساتھ ہوتی ہیں، یعنی کسی حکومت کی مشروعیت کے لئے عوام الناس کی اکثریت کا ووٹ کافی ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ مشروعیت؛ مقبولیت کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے جب عوام الناس نے کسی کو قبول کر لیا اور اس کو ووٹ دیدیا تو اب منتخب شدہ شخص کی حکومت مشروع اور قانونی ہو جاتی ہے۔

قارئین کرام! یہ وہی ڈیموکریٹک "Democratic" نظریہ ہے جو آج کل کی دنیا میں عام مقبولیت رکھتا ہے تو اب یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام بھی بالکل اسی نظریہ کو قبول کرتا ہے۔؟

۱۔ حکومت کی مشروعیت کے سلسلہ میں اسلامی نظریہ کا لیبرل معاشرہ سے فرق

اب جبکہ ہم نے یہ قبول کر لیا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے حاکم کے لئے ضروری ہے کہ عوام الناس اس کو قبول کرتی ہو اور عوام الناس کی شرکت اور تعاون کے بغیر اسلامی حکومت قوانین کو جاری کرنے پر قادر نہیں ہو سکتی، اور اسلامی احکام کو بھی جاری نہیں کر سکتی، تو سوال یہ ہے کہ اسلامی نظریہ کے مطابق حکومت کے مشروع ہونے میں صرف عوام الناس کا ووٹ کافی ہے، اور قانون کے جاری کرنے والے افراد کی مشروعیت عوام الناس کے ووٹوں کے ذریعہ مشروع ہو جاتی ہے، یا کوئی دوسری چیز بھی اس میں ضمیمہ ہونی چاہئے؟ دوسرے الفاظ میں یوں کھا جائے کہ عوام الناس کا قبول کرنا حکومت کے قانونی اور مشروع ہونے کے لئے شرط لازم و کافی ہے، یا اس کے عینی طور پر محقق ہونے کے لئے یہ شرط لازمی ہے۔

جواب میں ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ جو کچھ ”ولایت فقیہ“ کے سلسلہ میں بیان ہوا ہے اور اسی وجہ سے یہ حکومت، دوسری مختلف ڈیموکریٹک حکومت سے صاحب امتیاز بناتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی حکومت کی مشروعیت اور اس کا قانونی ہونا اسلام کی نظر

میں صرف عوام الناس کی رائے نہیں ہے بلکہ عوام الناس کی رائے گویا ایک بدن کی طرح ہے اور اس مشروعیت کی روح ”اذن الہی“ ہے، اور یہ مطلب ایک مسلمان کے عقیدہ میں راسخ ہے۔

وضاحت:

ایک مسلمان شخص عالم ہستی کو خدا کی ملکیت جانتا ہے اور یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ تمام افراد؛ خداوند عالم کے بندہ اور غلام ہیں، نیز اس سلسلہ میں افراد کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، خدا کی بندگی میں سب برابر ہیں؛ جیسا کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

”الْمُؤْمِنُونَ كَأَسْنَانِ الْمَشْطِ يَتَسَاوُونَ فِي الْحُقُوقِ بَيْنَهُمْ“^(۴)

(مومنین آپس میں گنگھے کے دانتوں کی طرح ہیں اور سب کے حقوق مساوی اور برابر ہیں۔)

پس معلوم یہ ہوا کہ سب انسان خدا کے بندے ہیں اور سب برابر ہیں نیز اس سلسلہ میں کوئی صاحب امتیاز نہیں ہے، اسی طرح سب انسانیت میں مساوی ہیں اور کسی ایک کو دوسرے پر کوئی امتیاز نہیں ہے عورت مرد، کالے سفید اصل انسانیت میں مساوی ہیں تو پھر کس معیار اور کس بنیاد کی بنا پر ایک شخص دوسروں پر حکومت کرنے کا حق رکھتا ہے؟ ہم نے یہ بھی قبول کیا کہ قانون کو جاری کرنے والا ایک عظیم طاقت کا مالک ہو جس کو ضرورت کے موقع پر استعمال کیا جاسکے، اور ہم نے یہ عرض کیا کہ حکومت بغیر قوہ قہریہ (پولیس یا فوج) کے بغیر اپنے اہداف تک نہیں پہنچ سکتی اور حکومت کا فلسفہ وجودی وہی قوہ قہریہ ہے جو عوام الناس کو قانون کی پیروی کرنے پر مجبور کرتا ہے اب اگر قوہ قہریہ نہ ہو اور حکومت فقط وعظ و نصیحت کے ذریعہ عوام الناس کو قانون پر عمل کرانے پر قادر ہوتی تو پھر قوہ قہریہ کی کوئی ضرورت نہ ہوتی، اور اس کام کے لئے علماء اور اخلاقی معلمین کافی ہوتے پس ثابت یہ ہوا کہ قوہ مجریہ کا فلسفہ وجودی یہ ہے کہ وقت ضرورت اپنی طاقت سے فائدہ اٹھائے اور بڑھتے ہوئے جرائم کی روک تھام کرے مثلاً اگر کوئی شخص لوگوں کے مال و ناموس پر دست درازی کرے تو حکومت اس کو پکڑ کر زندان میں ڈال دے یا اس کو کسی دوسرے طریقہ سے سزا دے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آج کل دنیا بھر میں سزا دینے کے مختلف طریقے پائے جاتے ہیں، اسی طرح اسلام نے مجرموں کو سزا دینے کے لئے طریقہ معین کئے ہیں جن میں سے سب سے زیادہ راجح مجرم کو جیل میں ڈال دینا ہے جس سے اس کی آزادی کا ایک حصہ سلب ہو جاتا ہے جس وقت کسی شخص کوئی طاقت ایک بند کرہ میں مقید کر دیتی ہے اور اس پر دروازہ بند کر دیا جاتا ہے، اور اس کی معمولی اور ابتدائی آزادی سلب کر دی جاتی ہے تو سوال یہ ہوتا ہے کہ کسی مجرم کی آزادی کو سلب کرنے کا کسی کو کیا حق ہے؟ بے شک مجریان قانون کی طرف سے کسی شخص کی آزادی کا سلب کرنا یا مجرموں کے حقوق کو سلب کرنا جائز اور حق ہو، یہ

ٹھیک ہے کہ مجرم کو سزا ملنی چاہئے، لیکن کوئی خاص شخص ہی سزا دینے کا حق رکھتا ہے، دوسرا نہیں؟ (یہ کھاس سے؟) ایسے افراد کو معین کرنے کے لئے کوئی قاعدہ قانون اور خاص ملاک اور دلیل ہونی چاہئے کیونکہ ان کا کام گویا اس شخص میں مالک جیسا تصرف کرنا ہے، جو شخص کسی مجرم کو جیل میں ڈالتا ہے گویا وہ اس کے وجود میں تصرف کر رہا ہے نیز اس سے اختیار اور آزادی کو سلب کر رہا ہے، اور اس کو ایک بند کمرے میں مقید کر رہا ہے، اس کو اجازت نہیں دیتا کہ جہاں چاہے چلا جائے، جیسے ایک مالک اپنے غلام کی تہیہ و تادیب کر رہا ہے۔

پس چونکہ مجرموں اور خطاکاروں سے اس طرح کا برتاؤ ان کی آزادی اور حقوق کا سلب کرنا ہے اور انسان میں مالک جیسا تصرف حساب ہوتا ہے اسلامی نقطہ نظر سے حکومت کی مشروعیت کا معیار و ملاک اکثریت کی رائے کے علاوہ خداوند عالم کی اجازت ہے، کیونکہ تمام انسان خدا کے بندے ہیں لہذا خدا اپنے بندوں پر اگرچہ مجرم بندے ہی کیوں نہ ہوں؛ تصرف کا حق عنایت فرمائے؟ ہر ایک شخص (یہاں تک کہ مجرم بھی) آزادی رکھتے ہیں اور یہ آزادی خدا داد نعمت ہے جو اس نے تمام انسانوں کو عطا کی ہے اور کسی کو اس کے بندوں کی آزادی سلب کمرے کا حق نہیں ہے کیونکہ وہی انسان کی آزادی یہاں تک کہ مجرم انسان کی آزادی کا حق رکھتا ہے جو ان کا مالک ہے اور تمام انسانوں کا مالک خداوند قدوس ہے۔

اس لحاظ سے اسلامی نقطہ نظر سے ان تمام چیزوں کے علاوہ جو دوسری حکومتوں میں حکومت کی تشکیل کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے، ایک دوسرا معیار اور ملاک بھی ضروری ہے اور وہ اعتقادات اور معارف اسلامی میں سرچشمہ رکھتا ہے ہمارے عقیدہ کی بنیاد پر خداوند عالم، انسان اور تمام مخلوقات کا رب ہے اور ہمارا یہ عقیدہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ خدا کی مخلوقات میں ذرا سا بھی دخل و تصرف؛ خدا کی اجازت اور مرضی سے ہونا چاہئے دوسری طرف وہ قوانین جو شہریوں کی رفتار، چال چلن اور کردار کو معین کرتا ہے اور ان کی آزادی کو محدود کرتا ہے، نیز وہ قوانین خود بخود جاری نہیں ہوتے بلکہ ان کو جاری کرنے کے لئے ایک سسٹم کی ضرورت ہے جو ان کو جاری کر سکے، اسی وجہ سے حکومت کے پاس ایک طاقت (پولیس) کی ضرورت ہے، اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حکومت اور قوہ مجریہ، خدا کی مخلوقات میں تصرف کرنے کے بغیر اور ان کی آزادی کو محدود کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ خدا کی مخلوقات میں تصرف کرنا یہاں تک مجرموں اور غنڈوں سے آزادی کا سلب کرنا، صرف اسی شخص کے لئے جائز ہے جس کو خداوند عالم نے اختیار دیا ہے، اور یہ اختیار صرف خداوند عالم کی طرف سے دوسروں کو عطا ہوتا ہے؛ کیونکہ وہی تمام انسانوں کا مالک اور رب ہے، اور حکومت کو اپنی مخلوقات میں تصرف کرنے کی اجازت دے سکتا ہے۔

حکومت کے سلسلہ میں فلسفہ سیاست میں نظریہ ”ولایت فقیہ“ کا دوسرے نظریات پر یہ امتیاز ہے کہ یہ نظریہ توحید اور اسلامی عقیدہ میں سرچشمہ رکھتا ہے اس نظریہ حکومت اور انسانوں میں تصرف کرنے کی نسبت خداوند عالم کی اجازت کی طرف ہوتی ہے

اس کے مقابلہ میں دوسرا نظریہ جو کہ قوانین کو جاری کرنے اور انسانوں کی آزادی میں تصرف کرنے میں خدا کی اجازت کو ضروری نہیں سمجھتا، یہ نظریہ ایک قسم کا ”ربوبیت میں شرک“ ہے یعنی اگر قوانین کو جاری کرنے والا فرد یہ عقیدہ رکھے کہ وہ خدا کے بندوں میں اس کی اجازت بغیر کے دخل و تصرف کا حق رکھتا ہے، حقیقت میں ایسا عقیدہ رکھنا اس ادعا کے برابر ہے کہ جس طرح خداوند عالم اپنے بندوں میں تصرف کا حق رکھتا ہے میں بھی اسی طرح مستقل طور پر انسانوں میں دخل و تصرف کا حق رکھتا ہوں، اور یہ ایک قسم کا شرک ہے اگرچہ ایسا شرک نہیں جو مرتد ہونے کا سبب بنتا ہو بلکہ کمتر درجہ کا شرک ہے جو غلط فکر اور کج فکری کی وجہ سے وجود میں آتا ہے، جس کے نتیجے میں عصیان اور لغزش وجود میں آتے ہیں اور یہ کوئی کم گناہ نہیں ہے کیسے کوئی شخص اپنے کو خدا کا ہم پلہ قرار دیتا ہے اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ جس طرح خدا اپنے بندوں میں تصرف کا حق رکھتا ہے میں بھی ان کی رائے اور انتخاب پر تکیہ کرتے ہوئے؛ ان پر تصرف کا حق رکھتا ہوں؟! کیا عوام الناس اپنا اختیار رکھتی ہے جو دوسروں کے حوالہ کر سکتی ہے؟ تمام انسان خدا کے بندے ہیں ان کا اختیار بھی خدا کے ہاتھ میں ہے۔

قارئین کرام! ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اگر ہم اسلامی نقطہ نظر سے حکومت کی تحقیق و بررسی کریں تو اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ اس نظریہ میں دوسرے ممالک کے حکومتی معیار کے علاوہ ایک دوسری چیز کا بھی لحاظ کرنا ضروری ہے، اور وہ ہے خدا کے بندوں میں تصرف کرنے کے لئے خدا کی اجازت لھذا اسی نظریہ کی بنیاد پر حکومت کی مشروعیت خداوند عالم کی طرف سے ہے اور عوام الناس کی رائے اور ووٹس نیز عوام الناس میں اس کی مقبولیت؛ حکومت کے تحقق کے لئے ایک شرط ہے۔

حوالے:

(۱) سورہ بقرہ آیت ۳۰

(۲) سورہ معارج آیات ۲۱ تا ۲۹

(۳) (سورہ ابراہیم آیت ۳۴)

(۴) جیسا کہ ہم پہلے قوانین کی ضرورت پر گفتگو کر چکے ہیں

(۵) (اگر ہر آدمی منٹ میں ایک قتل ہوتا ہے تو تقریباً ایک دن میں $2880 / (2 * 60) = 24 * 120 = 2880$ قتل ہوتے ہیں (مترجم))

(۶) بحار الانوار ج ۹ ص ۴۹

چھبیسواں جلسہ

حکومت کے مخصوص کام اور عوام الناس کے ہاتھ بنانے پر اسلام کا زور

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ ”اسلامی سیاسی نظریہ“ کی گفتگو دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے جس کے پہلے حصے میں قانون اور قانونگذاری کے سلسلہ میں بحث ہو چکی ہے اس کا دوسرا حصہ حکومت اور نظام اسلامی میں قوانین کے نفاذ کی ضمانت سے مربوط ہے ہم نے گذشتہ گفتگو میں حکومت کی ضرورت کو ثابت کرنے کے سلسلہ میں اسلامی حکومتی سسٹم کو ثابت کیا اور ہم نے حکومت کی ضرورت کے سلسلہ میں ایک دلیل یہ پیش کی کہ چونکہ قوانین کو جاری کرنے کے لئے ایک ضامن کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ بھی عرض کیا کہ اگر قوانین کو جاری کرنے کی کوئی ضمانت نہ ہو تو پھر ان (قوانین) کا ہونا لغو اور بے ہودہ ہو جائے گا، اور چونکہ معاشرہ میں ہمیشہ جرائم اور قانون شکنی ہوتی رہتی ہے (اگر قوانین کی ضمانت اجرائی نہ ہو) تو پھر ان قانون کو بنانے کا مقصد ختم ہو جاتا ہے چنانچہ یہ ایک ایسی بات ہے جس پر ہمیشہ تمام ہی ملتوں نے تجربہ کیا ہے اور اسلامی منابع و کتب کے لحاظ سے بھی اس میں کوئی شک و تردید نہیں ہے۔

۲۔ حکومت کے عظیم اور مخصوص کام

قارئین کرام! جیسا کہ ہم بعد میں ذکر کریں گے کہ حکومت کی ضرورت کے لئے؛ قوانین کی ضمانت اجرائی کے علاوہ بھی دیگر دلائل موجود ہیں کہ ان تمام دلائل کے پیش نظر حکومت کے وظائف کے مجموعہ کو بیان، اور ان کی منطقی توجیہ کرنا اسی طرح حکومت کے اختیارات کو بیان کرنا ممکن ہے کیونکہ اگر صرف حکومت کا کام قوانین کو جاری کرنے کی ضمانت ہوتی تو پھر اس طرح کے پیچ و خم والے سسٹم کی ضرورت نہ ہوتی اور صرف محکمہ پولیس کے ذریعہ یہ مسئلہ حل ہو سکتا تھا، اور حکومت کی دوسرے اجتماعی کاموں میں کوئی دخالت نہ ہوتی کیونکہ اس صورت میں حکومت کی ذمہ داری صرف ملک میں قوانین کو جاری کرنا ہوتا جس کے لئے صرف پولیس ہی کافی تھی لیکن حکومتوں کی منجملہ اسلامی حکومت کی دوسری بھی ذمہ داریاں ہوتی ہیں جن میں سے اسلامی معاشرہ کی ان عام ضرورتوں کو پورا کرنا ہے جو انفرادی طور پر ممکن نہیں ہیں۔

ہم کبھی انسان کی زندگی کو شخصی اور انفرادی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور اس کی ضرورتوں کی جستجو کرتے ہیں تو ظاہراً یہ ضرورتیں خود شخصی طریقہ سے پوری ہونا چاہئے مثلاً روٹی اور مکان کی ضرورت، اور یہ چیزیں خود انسان کی سعی و کوشش سے پوری ہو جاتی ہیں البتہ انسان کی انفرادی سعی و کوشش کا اثر بخش ہونے کے لئے قاعدہ و قانون کے ماتحت ہونا ضروری ہے۔

لیکن کچھ ضرورتیں انسان اور اہل خانہ سے متعلق نہیں ہوتیں بلکہ وہ پورے معاشرہ یا معاشرہ کے کسی خاص گروہ سے متعلق ہوتی ہیں مثلاً اندرونی اور بیرونی امنیت ایک عام ضرورت ہے، کیونکہ اندرونی دشمنی، قانون شکنی اور نا امنی سے مقابلہ کرنے کے لئے نیز اسلامی ملک کے عہدہ دار افراد کے جو بیرونی دشمن ہیں ان سے جنگ کے لئے فوج کی تشکیل دینا وغیرہ؛ یہ چیزیں معاشرہ کے بعض افراد سے متعلق نہیں ہیں، بلکہ تمام ہی افراد سے متعلق ہیں اور چونکہ اس طرح کی ضرورت معاشرہ کے بعض افراد کے بس کی بات نہیں ہے، بلکہ یہ کام معاشرہ کے تمام افراد کے ذریعہ پورا ہونا چاہئے، جن کو حکومت معاشرہ کی طرف سے قوانین کو مرتب کرنے اور ضروری طریقوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انجام دی سکتی ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ جس وقت معاشرہ کے لئے سرحدی علاقے سے کوئی خطرہ درپیش ہوتا ہے اور عوام الناس اس خطرہ سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، تو ان کو صحیح طریقہ سے ٹریننگ دی جائے، یعنی درحقیقت جنگ اور دفاع میں شرکت کرنے والے تمام لوگوں کو ایک سسٹم کے ماتحت ہونا چاہئے کیونکہ یہاں پر ذاتی اور شخصی سلیقہ کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا لہذا ہر شخص اپنے سلیقہ سے دشمن کے حساب شدہ حملوں کو نہیں روک سکتا اسی وجہ سے فوجی افسروں کے تجربوں، دشمن کے اسلحوں اور اس کی طاقت کی شناخت کے ذریعہ بہترین پلان کے ساتھ میدان جنگ میں قدم رکھا جانا ضروری ہے لہذا اس اہم ضرورت کو صرف ایسا سسٹم ہی پورا کر سکتا ہے جو پورے معاشرہ پر حکومت کرتا ہو چنانچہ حکومت اپنے خاص پروگرام کے ذریعہ ہی لوگوں کو جنگ میں شرکت کرنے کے لئے تیار کر سکتی ہے تاکہ ملک سے دشمن کا خطرہ ٹل جائے اس کے علاوہ بیرونی دشمن کے مقابلہ کی تیاری کے پیش نظر لازمی اسلحہ کی فراہمی ضروری ہے، اور حکومت کو فوج کی ٹریننگ پر خاص دھیان رکھنا ضروری ہے تاکہ ملک میں سرحدوں کی حفاظت کرنے والی فوج کی تعداد کافی مقدار میں آمادہ رہے، اسی طرح اندرونی فتنہ و فساد سے روک تھام کے لئے پولیس کی ضرورت ہے لہذا اس طرح کے مسائل صرف حکومت ہی کر سکتی ہے، لہذا عوام الناس حکومت کی اطاعت کریں، اور اس کے احکام کو لازم الاجراء مانیں۔

جو مثال ہم نے حکومت کی ضرورت پر دلیل دوم (یعنی معاشرہ کی عام ضرورت) کے تحت پیش کی وہ ملک سے دفاع اور بیرونی دشمن سے مقابلہ کے سلسلہ میں ہے اور ہمارے ملک میں یہ خطرناک وظیفہ ارتش اور سپاہ (فوجوں کے نام) کے ذمہ ہوتا ہے، اسی طرح وہ مثال جس کو ہم نے دلیل اول (یعنی قوانین کی اجرائی ضمانت) کے سلسلہ میں ذکر کی وہ اندرونی امنیت کی حفاظت اور

مجرموں کو قانون پر عمل کرنے پر مجبور کرنے کے لئے طریقوں کے سلسلہ میں ہے، اور یہ ذمہ داری نیروئے انتظامی (پولیس) کے کاندھوں پر ہوتی ہے۔

ان ہی عام ضرورتوں میں سے جو عام افراد کے ذمہ داری سے باہر ہوتی ہیں اور انہیں بھی حکومت انجام دیتی ہے وہ معاشرہ کی صحت و سلامتی کا مسئلہ ہے کیونکہ ہمیشہ معاشرہ میں پھیلنے والی بیماریاں موجود رہی ہیں جن کی وجہ سے بھت بڑے بڑے نقصانات معاشرہ کو اٹھانا پڑے ہیں، اور اگر ان کی روک تھام نہ کی جائے تو معاشرہ کو کافی نقصان اٹھانا پڑے گا (اور بے شمار جانیں چلی جائیں گی) جیسا کہ گذشتہ زمانہ میں میڈیکل ترقی نہ ہونے اور عظیم پیمانہ پر منصوبہ بندی نہ ہونے کی بنا پر معاشرہ میں پھیلنے والی بیماریاں پائے جاتی تھیں مثلاً ”وبا“، ”طاعون“ اور ”چچک“ وغیرہ جن سے بھت سی جانیں جاتی تھیں لیکن آج کل حکومتی پروگرامس وغیرہ کے تحت اور میڈیکل کے ترقی کی وجہ سے اس طرح کی بیماریوں پر کافی حد تک کنٹرول کیا گیا ہے اور حکومت کی مدد نیز تمام عوام الناس کے تعاون اور شرکت سے بعض مذکورہ بیماریوں کی جڑ ہی ختم کر دی گئی ہے مثلاً گذشتہ زمانہ میں بچوں میں فلج کا اثر بھت زیادہ ہوتا تھا جس کی وجہ سے ہزاروں اور لاکھوں معصوم بچوں کی جانیں ضایع ہو چکی ہیں لیکن آج بہترین منصوبہ بندی اور میڈیکل وغیرہ کے پروگرامس کے تحت ہمارے ملک میں ”واکسیناسین“ ”vaccination“ کا پروگرام بہترین طریقہ سے جاری ہوا ہے جس کے نتائج بھی بہترین برآمد ہوئے ہیں لیکن یہ کام بغیر حکومتی منصوبہ بندی اور عوام الناس کی بھرپور شرکت کے بغیر ممکن نہیں ہے تو ایسے کاموں کے لئے عام افراد کی قدرت سے بالآخر ایک قدرت کا ہونا ضروری ہے، اور وہ حکومت ہے جو اپنے پروگرام کے تحت، ضروری وسائل کے ساتھ اور ضروری مقررات اور مخصوص قانون نامہ مرتب کر کے عملی میدان میں قدم آگے بڑھائے اور عوام الناس بھی حکومت کے قوانین پر عمل کرے، تاکہ معاشرہ کی میڈیکل ضرورت پوری ہو جائے اور معاشرہ سے خطرناک بیماری کی جڑیں ختم کی جاسکے۔

قارئین کرام! حکومت کے گذشتہ وظائف کی طرح منشیات کا دھندہ کرنے والے افراد کا بھی مقابلہ کرنا ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک ایسی بلا ہے جس سے بدن، روح اور معاشرہ کی اہمیت کو بھت بڑے نقصانات پھونچے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حکومت خاص منصوبہ بندی کے تحت اور اپنی پوری طاقت صرف کر کے ہی اس برائی کی جڑ کو اکھاڑ پھینک سکتی ہے اس میں محدود افراد کی کوشش کسی نتیجہ پر نہیں پھونچ سکتی۔

پس معاشرہ کی عام ضرورتوں کو پورا کرنا حکومت کے وجود پر ایک دوسری دلیل ہے کیونکہ ان کا پورا ہونا معاشرہ کے لئے مفید اور ثمر بخش ہے، اور اگر ان کے پورا ہونے میں کوئی نقص اور خلل واقع ہو تو پھر اس کا نقصان بھی معاشرہ ہی کو بھگتنا پڑے گا، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ یہ ضرورت انفرادی طور پر پوری نہیں کی جاسکتی بلکہ یہ کام معاشرہ پر حکومت کرنے والے حاکم اور وزراء

کا ہے، اسی وجہ سے ان تمام ضرورتوں کے پیش نظریا ان ذمہ داریوں کے الگ الگ ہونے کی وجہ سے ہر ایک کے لئے سلسلہ میں ایک وزراخانہ تشکیل دیا جاتا ہے۔

البتہ معاشرہ کی بعض ضرورتوں کو انفرادی طور پر پورا کیا جاسکتا ہے لیکن ان کو پورا کرنے کے لئے تمام افراد میں خواہش اور تمنا نہیں ہوتی یا اگر ہوتی بھی ہے تو وہ اتنی زیادہ نہیں ہوتی، تو اگر اس صورت میں عوام الناس پر یہ کام چھوڑ دئے جائیں تو پھر یہ ضرورتیں ناقص رہ جاتی ہیں، کم سے کم معاشرہ کے بعض گروہ ان ضرورتوں سے محروم رہ جائیں گے، اسی وجہ سے یہ ذمہ داریاں حکومت کی ہوتی ہیں تاکہ ان ضرورتوں میں کوئی نقص اور خلل واقع نہ ہو مثلاً پورے ملک میں عوام الناس خود ہی مدرسہ، اسکول اور کالج بنا کر تعلیم و تربیت کا انتظام کر سکتے ہیں اور ان کا خرچ بھی خود ہی برداشت کر سکتے ہیں، (جیسا کہ گذشتہ زمانہ میں ایسا ہی ہوتا تھا اور آج کل بھی بعض ترقی یافتہ ممالک میں مدارس اور کالج وغیرہ کا انتظام عوام الناس کے ذمہ ہے) لیکن افسوس تعلیم و تربیت پر خرچ کرنے کے لئے کم ہی لوگ تیار ہوتے ہیں تاکہ خود ان کے بچوں اور دیگر بچوں کی تعلیم کا انتظام ہو سکے اگرچہ ہم اس بات کے منکر نہیں ہیں کہ کوئی اس طرح کے امور میں خرچ نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ تاریخ میں ایسے مخیر افراد موجود رہے ہیں اور آج بھی بعض ایسے مخیر حضرات موجود ہیں جنہوں نے مدرسہ بنانے کے لئے بھت زیادہ مدد کی ہے، لیکن ان کی مدد محدود ہوتی ہے، معاشرہ کے تمام لوگوں تک ان کی خدمت نہیں پہنچ سکتی، اور اگر حکومت اس طرح کی ذمہ داریوں کو ایسے مخیر افراد کے اوپر چھوڑ دے تو پھر معاشرہ کی مصلحت پوری نہیں ہوگی۔

ایسے حالات میں جب عوام الناس مدارس و اسکول بنانے کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لیتی، تو پھر معاشرہ کی فلاح و بھبود کے لئے حکومت کو یہ ذمہ داریاں اپنے ذمہ لینا پڑتی ہیں، تو پھر اس چیز کی ضرورت ہے کہ ان تمام ضرورتوں کا خرچ یا عوام الناس ادا کرے اور حکومت مختلف قسم کے ٹیکس کے ذریعہ یہ مبلغ حاصل کرے، یا حکومت اپنی ملی درآمد کے ذریعہ اس خرچ کو پورا کرے؛ کیونکہ تعلیمی نصاب کا ایک حصہ تمام لوگوں تک مفت پہنچانے کی ضرورت ہے تاکہ معاشرہ فلاح و بھبود کی طرف آگے بڑھے اور اگر حالات بدلے اور تعلیمی اداروں کے اخراجات کو بعض مخیر حضرات برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں تو پھر واقعاً حکومت سے ایک بڑا بوجہ کم ہو جائے گا۔

۳۔ حکومت کے دو طرفہ وظائف

قارئین کرام! گذشتہ باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض ایسی ذمہ داریاں ہوتی ہیں جو حکومت سے مخصوص نہیں ہوتی بلکہ حکومت خاص حالات میں ان کو قبول کرتی ہے اور ان کو پورا کرنے میں اپنی ہمت لگادیتی ہے، جبکہ بعض حالات میں ان کو عوام الناس کے سپرد کیا جاسکتا ہے لیکن بعض ایسی ذمہ داریاں ہوتی ہیں جو صرف حکومت ہی سے مخصوص ہوتی ہیں اور کبھی بھی حکومت کے

عہدہ سے باہر نہیں ہوتیں اور کسی بھی وقت حکومت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ان کو عوام الناس کے کاندھوں پر ڈال دے، مثلاً دفاع اور جنگ کیونکہ انفرادی اور مختلف گروہ کے ذریعہ کبھی بھی جنگ اور دفاع ممکن نہیں ہے، لہذا اس بات کی ضرورت ہے کہ بہترین منصوبہ بندی کے تحت معاشرہ کی اس اہم ضرورت کو پورا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے البتہ جب حکومت دفاع اور جنگ کی ذمہ داری قبول کرے، اور براہ راست اس سلسلہ میں منصوبہ بندی مکمل کر لے تو پھر عوام الناس اپنی مرضی سے فوجی اور بسیجی (عوامی رضا کار فوج) جنگ میں شرکت کر سکتی ہے اور اپنے اسلامی ملک اور اسلامی حکومت سے دفاع کر سکتی ہے۔

لہذا تمام اجتماعی کاموں کو انجام دینے کی ذمہ داری اپنے کاندھے پر لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے؛ بلکہ بھت سی ذمہ داریوں کو خود عوام الناس اپنے عہدہ پر لے سکتی ہے اور اپنی مرضی سے ان کے اخراجات کو برداشت کر سکتی ہے اور ان کاموں کے انجام دینے کے لئے (بھی) وزارت خانہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ عوام الناس خود اس ذمہ داری کو نبھا سکتی ہے لیکن ان عظیم منصوبوں کو منظم کرنے، بے نظمی سے بچنے اور ان میں عوام الناس کی شرکت کو بروئے کار لانے نیز ان کو اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے؛ حکومت کو چاہئے کہ اس سلسلہ میں اپنا کردار ادا کرے، جیسا کہ بعض وزارت خانہ صرف نظارت کا کردار ادا کرتے ہیں جبکہ اصل کام عوام الناس کرتی ہے مثلاً محکمہ تجارت کا اصل کام تجارت نہیں ہے اندرونی اور بیرونی تجارت عوام الناس انجام دیتے ہیں البتہ جیسا کہ شاہ کے زمانہ میں درباری لوگ ہی معاملات سے بڑے بڑے فائدہ اٹھاتے تھے اور عوام الناس ان فوائد سے محروم رہتی تھی، لہذا اس طرح کی تجارت سے روک تھام کے لئے یہ کام حکومت کے ذمہ ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ تجارتی امور عوام الناس سے متعلق ہیں حکومت سے نہیں جیسا کہ معروف ہے کہ ”حکومت ایک مناسب تاجر نہیں ہو سکتی“ اور اگر حکومت براہ راست تجارتی امور کو انجام دے (بھی) لگے، تو اس کو شکست اٹھانا پڑے گی کیونکہ تجارتی اور صنعتی امور بلکہ کلی طور پر اقتصادی امور میں افراد اور گروہ کی آپس میں رقابت (مقابلہ، کمپیشن) بھت ہی زیادہ موثر ہوتی ہے، اور اگر ان کو صحیح طریقہ پر راہنمائی ہوتی رہے اور ان کے درمیان مقصد معین رہے تو پھر تجارت اور صنعت میں ترقی ہوگی، لیکن اگر حکومت خود براہ راست تجارت کرے تو پھر اس کے اندر وہ مقصد نہیں ہوتا جس کے نتیجے میں ترقی نہیں ہوگی۔

”ٹوٹالیٹر“ "Totalitair" (۱) حکومت یا متحد حکومتیں مثلاً سوسیالیسٹ "Socialiste" اور کمیونسٹ "communiste" حکومتیں جو ”چین“ اور ”کوبا“ پر حاکم تھی یا قدیم روس کی حکومتیں یا مشرقی ممالک کی وہ حکومتیں جن میں حکومت براہ راست تمام تر سیاست گذاری اور پروگراموں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہے اور عوام الناس اقتصادی، تجارتی، صنعتی اور کاشتکاری وغیرہ میں صرف نوکروں کا کردار ادا کرتی ہے کیونکہ تمام کام حکومت کے ذمہ ہوتے ہیں اور تمام عوام الناس یہاں تک کہ کاشتکار اور کارخانوں میں کام کرنے والے افراد حکومت کے نوکر اور مزدوروں کی طرح ہوتے ہیں

لیکن اس طرز کی حکومت کے مقابلہ میں اسلامی حکومت کا نظریہ یہ ہے کہ جہاں تک عوام الناس مختلف مسائل کو خود اپنے آپ انجام دے سکتے ہیں اس پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور ان کی مالکیت اور ان کے استقلال کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

۲۔ کم درآمد لوگوں کو مدد پہنچانے والی کمیٹیوں کی ضرورت

قارئین کرام! جیسا کہ ہم نے عرض کیا معاشرہ میں عام طور پر فائدہ کے لئے کچھ مرکز ہونا چاہئیں تاکہ وہ غریب لوگ جو اپنی بعض ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتے ان مرکزوں سے استفادہ کر سکیں مثلاً ایسے ہاسپٹل بنائے جائیں جہاں پر ان کے لئے مفت علاج کیا جاسکے کیونکہ ان میں علاج کے اخراجات کو ادا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، اسی وجہ سے بیمہ اجتماعی کے قوانین کے تحت ہاسپٹل بنائے جاتے ہیں جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں اس طرح کے ہاسپٹل کی تعداد کافی مقدار میں ہوتی ہے، جن میں مریضوں کو اپنے علاج کے لئے اخراجات ادا نہیں کرنے پڑتے، اور حکومت ٹیکس وغیرہ یا اپنی ملی درآمد کے ذریعہ ان ہاسپٹلوں کا خرچ حاصل کرتی ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ جس وقت حکومت اپنی درآمد کے لئے ٹیکس مقرر کرتی ہے مثلاً عمومی بیمہ کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے ٹیکس وصول کرتی ہے تو پھر عوام الناس کو یہ ٹیکس ادا کرنے پر مجبور کرتی ہے، خصوصاً ترقی یافتہ ممالک میں حکومتیں ایسے طریقے اپناتی ہے جن سے عوام الناس ٹیکس ادا کرنے سے فرار نہیں کر سکتے، اگرچہ بعض فوائد ٹیکس دینے والے کے حق میں بھی ہوتے ہیں، لیکن معاشرہ کے کم درآمد والے افراد کے لئے یہ امکانات فراہم کئے جاتے ہیں، تاکہ ٹیکس سسٹم کے تحت مفت علاج اور دوسری خدمات حاصل کر سکیں۔

لیکن کیا یہ کام عوام الناس پر چھوڑ دینا بہتر ہے کہ وہ خود اپنی مرضی سے عام فائدوں کے لئے اس طرح کے کام انجام دیں اور اسپتال وغیرہ بنائیں تاکہ کم درآمد والے افراد ان میں جا کر اپنا مفت علاج کرا سکیں؟ یا حکومت لوگوں سے ٹیکس وغیرہ حاصل کر کے کم درآمد والے افراد کے لئے ہاسپٹل وغیرہ بنوائے تاکہ وہ لوگ مفت علاج کرا سکیں؟

جواب یہ ہے کہ بے شک پہلی صورت بہتر اور مناسب تر ہے کیونکہ احکام اسلامی فلسفہ میں اس چیز پر توجہ دی گئی ہے اور مقام تشریح احکام میں بھی مد نظر قرار دیا گیا ہے، کیونکہ اسلام نے اس بات پر تاکید کی ہے عوام الناس کو اپنے مال کے ایک حصہ کو عام فائدہ کاموں میں خرچ کرنا چاہئے اور اپنی مرضی اور شوق کے ساتھ دوسروں کو اپنے مال سے فائدہ پہنچائیں، کیونکہ اس صورت میں نیک عمل کو اختیار کرنے کی اہمیت بھی ظاہر ہو جاتی ہے اور انسان، نفسانی کمال اور آخرت میں ثواب کا مستحق ہوتا ہے نیز اس طرح معاشرہ کی ضرورتیں بھی پوری ہو جاتی ہیں لیکن اگر عوام الناس کو اپنے مال کے کچھ حصے کو خرچ کرنے پر مجبور کیا جائے تو اس میں عمل کو اختیار کرنے کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے اور اس میں ثواب بھی نہیں ہوتا۔

ان ہی نیک کاموں میں سے ایک کام یہ ہے کہ ہمارے مخیر مسلمان برادران رضاکارانہ طور پر ہمیشہ بعض چیزیں وقف کرتے ہیں کہ جس سے معاشرہ میں فوائد رہے ہیں، یہاں تک کہ یہ بھی کھا جاسکتا ہے کہ اس ملک میں ایسا کوئی دیہات، بستی اور شہر نہ ہوگا جس سے عوام الناس کے لئے کوئی وقف نہ ہو لیکن اس عظیم اور خدا پسند کام میں آج کل رغبت کم ہو گئی ہے جس کی بنا پر وقف کا سلسلہ کم ہو گیا ہے اس کے علاوہ بھت سے ایسے وقف ہیں کہ یا تو وہ بھلا دئے گئے ہیں یا ان سے صحیح طریقہ سے فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے جب کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر دوبارہ وقف کا سلسلہ شروع ہو جائے اور اس عظیم مسئلہ کی اہمیت عوام الناس پہنچان لیں تو پھر حکومت بعض ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائے گی اور عوام الناس بھی ثواب کی مستحق ہوگی جس وقت کوئی شخص اپنی مرضی اور رغبت سے کوئی کام انجام دے یا وہ کام جس مقدار میں اختیار اور آزادی کے ساتھ انجام دیا جائے تو اس کا ثواب بھی زیادہ ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ وہ امور جو حکومت سے مخصوص نہیں ہیں اور ان میں اصل یہ ہے کہ عوام الناس رضاکارانہ طور پر انجام دیں اور اپنی اجتماعی ضرورتوں کو پورا کریں، اور یہ کام عوام الناس کے سپرد کیا جائے، لیکن اگر عوام الناس اس کام کو انجام نہ دے اور اجتماعی ضرورتیں رضاکارانہ طور پر انجام نہ ہو پائیں تو اس وقت حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خاص قوانین بنا کر عوام الناس کو ٹیکس وغیرہ دینے پر مجبور کرے تاکہ معاشرہ کی ضرورتوں کا مکمل خرچ پورا ہو جائے۔

۵۔ عوام الناس کی شرکت پر اسلام کی توجہ

یہ بات عرض کر دینا ضروری ہے کہ عوام الناس پر بعض امور کی ذمہ داری کا رکھنا، اور مختلف قسم کے کاموں میں سبھی کی شرکت کا راستہ ہموار کرنا، مثلاً معاشرہ کی بھت سی ضرورتوں کو پورا کرنا، یہ تمام ”جامعہ مدنی“ (جیسا کہ ذیل میں وضاحت کی جائے گی) کے خصوصیات ہیں البتہ جامعہ مدنی اور مغرب سے آئی ہوئی بھت سی دیگر اصطلاحات کے مختلف معنی کئے جاتے ہیں، اسی وجہ سے ان اصطلاحات سے ناجائز استفادہ کیا جاتا ہے، لیکن ہم ان اصطلاحات کو اپنے اعتبار سے قبول کرتے ہیں، مثلاً جامعہ مدنی کے مختلف بلکہ بعض موقع پر ایک دوسرے کے مخالف معنی کئے جاتے ہیں، چنانچہ جامعہ مدنی کے ایک معنی یہ ہیں کہ حتی المقدور معاشرہ کے امور خود عوام الناس کے سپرد کئے جائیں، اور ان میں حکومت کی ذمہ داری نہ ہو حتی الامکان عوام الناس خود رضا کارانہ طور پر معاشرتی امور میں شرکت کریں اور اگر حکومت کسی موقع پر دخالت کر سکتی ہے البتہ معاشرہ کے اہم مسائل میں سیاست گذاری تمام ہی ممالک میں حکومت کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور اس کو عملی جامہ پہنانے اور ان کے مختلف مراحل حتی الامکان عوام الناس کے ذمہ ہوتے ہیں۔

بے شک جامعہ مدنی کے مذکورہ معنی اسلامی مستحکم اصول کے مطابق ہے جس پر روز اول ہی سے ”جامعہ اسلامی“ یا ”مدینۃ النبوی“ کا نام دیا گیا ہے کیونکہ شروع میں اسلامی حکومت تمام امور کی عہدہ دار نہیں ہوتی تھی بلکہ اکثر معاشرہ کے امور کو عوام الناس ہی انجام دیتے تھے، لیکن معاشرہ کی ترقی کے ساتھ اور طرح طرح کی جدید ضرورتوں کے پیش نظر اہستہ اہستہ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ بعض ضرورتوں کو پورا کرنا عوام الناس کے بس کی بات نہ تھی تو اس صورت میں حکومت کا ان امور کو اپنے ذمہ لینا ضروری تھا مثلاً قدیم زمانہ میں شہر کی روشنی کے لئے عوام الناس کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے گلی کوچوں میں فانوس اور چراغ لگائے جاتے تھے اور یہ کام خود عوام الناس کے ذریعہ ہوتا تھا، لیکن آج کے زمانہ میں بجلی کے ذریعہ پورے شہر کے گلی کوچوں میں روشنی کرنا عوام الناس کا کام نہیں ہے اور اگر عوام الناس کرنا بھی چاہے تو اس میں نقص پایا جائے گا، لہذا معاشرہ کی اس ضرورت کو پورا کرنا اور ضروری اسباب فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

۶۔ عوام الناس کی شرکت کو کم کرنے والے اسباب

کلی طور پر عوام الناس میں معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی شرکت کو کم کرنے والے دو اسباب کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے:

پہلا سبب: ضرورتوں کی بڑے پیمانہ پر وسعت کے ساتھ ساتھ ان ضرورتوں کا پیچیدہ اور خاص طریقہ پر ہونا، جس کی بنا پر عوام الناس ان ضرورتوں کو پورا کرنے سے محروم ہیں، جس کے نتیجہ میں ان کو پورا کرنے کے لئے حکومت کا بوجہ مزید بڑھ جاتا ہے۔

دوسرا سبب: عوام الناس میں اخلاقی اور دینی اقدار کا کمزور ہو جانا اور مغربی ممالک کی طرح صرف ذاتی مفاد کی فکر رائج ہو جانا۔ ان دو اسباب کی وجہ سے عوام الناس معاشرہ اور دوسروں کی ضرورتوں کو پورا کرنے سے کتراتے ہیں کیونکہ مغربی کلچر اپنے ذاتی مفاد، خود پسندی اور ذمہ داری کو قبول نہ کرنے پر مبنی ہوتا ہے جو ”رنسانس“ کے زمانے سے مغربی ممالک میں رائج ہوتا چلا گیا ہے اور اہستہ اہستہ یہ نظریہ اسلامی ممالک میں بھی رواج پیدا کر چکا ہے، جس نے مسلمانوں کے معنوی اور اخلاقی رجحان کو کم رنگ کر دیا ہے ایک انسان کو دوسرے کے بارے میں نیز اس کی ضرورتوں میں مدد کرنے سے روک دیا ہے اور انسان کو دوسروں سے بے توجہ کر دیا ہے کیونکہ یہ خود پسند نظریہ معاشرہ کے امور میں حصہ لینے کی ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا اور صرف اپنے ذاتی مفاد اور اپنی لذتوں کے بارے میں فکر کرتا ہے یہ کلچر بالکل اسلامی ثقافت کے مقابلہ میں ہے جو صدیوں سے اسلامی معاشرہ میں رائج تھا اور عوام الناس کو معاشرہ کے فوائد اور لوگوں کی خدمت پر تحریک کرتا ہے۔

آج کل کے زمانہ میں سنتوں اور اسلامی اقدار پر بے توجہی اور مغربی کلچر کا رواج اس بات کا باعث بنا ہے کہ وقف کی بہترین سنت پر کم عمل ہو رہا ہے اور وقف ہونے والی زمینوں اور عمارتوں کی نسبت پہلے سے بھت کم ہوتی جا رہی ہے اسی طرح

رضاکارانہ طور پر عام المنفعہ امور کم ہوتے جا رہے ہیں، اور اسلامی معاشرہ میں ”روح مدنی“ (حقیقت جامعہ مدنی) کمزور ہو رہی ہے جس کے نتیجے میں اسلامیک حکومت کی ذمہ داری روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اگر اسلامی انقلاب کی برکت سے معاشرہ میں انسانی اور اسلامی اقدار کی اہمیت دوبارہ زندہ ہو جائے اور عوام الناس اپنی دینی، اخلاقی اور معنوی ذمہ داریوں پر توجہ کریں اور عام المنفعہ امور میں حصہ لیں تو پھر حکومت کا بوجھ کم ہو جائے گا، حکومت کی ذمہ داریاں کم ہو جائیں گی اور حکومت بعض اپنی ذمہ داریوں کو عوام الناس کے حوالے کر سکتی ہے؛ اور یہ چیز ایک حساب سے ”جامعہ مدنی“ کی طرف دوبارہ پلٹ جانا ہے۔

۱۔ اسلام میں جامعہ مدنی کی اہمیت

قارئین کرام! ہم دوبارہ اس بات پر تاکید کرتے ہیں کہ گذشتہ معنی میں جامعہ مدنی کا اسلام اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں سرچشمہ ملتا ہے اور ہم اسلام سے دور ہونے کی وجہ سے اس سے دور ہوئے ہیں اور وہ وقت آچکا ہے کہ ہم اسلام کی برکت سے اس کی طرف توجہ کریں پس مغربی ممالک کو ہم لوگوں پر احسان نہیں جتنا چاہتے کہ ہم نے ”جامعہ مدنی“ کے نقشے کو پیش کر کے تمام ملتوں پر احسان کیا ہے اور ہم اس وقت تمام افراد کو جامعہ مدنی کی تشکیل کی دعوت اور راہنمائی کرتے ہیں، بلکہ ہمیں ان کے اوپر احسان جتنا چاہتے کہ جب اسلامی تمدن اپنے اوج پر تھا تو مغربی معاشرہ نیم وحشی تھا (یعنی آدھی حیوانیت پائی جاتی تھی) اور اسلامی تمدن نے ان کو اہستہ اہستہ صاحب تمدن کیا اور انھوں نے جامعہ مدنی کو اسلام سے حاصل کیا ہے لیکن اس وقت یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم مغربی کلچر کو اسلامی ملک میں رواج دینا چاہتے ہیں اور ہماری تربیت کرنا چاہتے ہیں تاکہ جامعہ مدنی کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔!

لہذا ثابت یہ ہوا کہ صحیح معنی میں جامعہ مدنی اسلام اور اسلامی تمدن میں سرچشمہ رکھتا ہے اور اگر کوئی اسلام کی طرف رجوع کرے تو اس میں جامعہ مدنی مل جائے گا؛ لیکن جامعہ مدنی کے دوسرے معنی بھی کئے جاتے ہیں جو ہمارے نزدیک قابل قبول نہیں ہیں کیونکہ آج کل مغربی کلچر میں جامعہ مدنی کے اسلامی معاشرہ کے مخالف معنی کئے جاتے ہیں، اور وہ معنی یہ ہیں کہ جامعہ مدنی یعنی جس میں دین کی سلطنت نہ ہو اور معاشرہ کے امور میں دینی کوئی منصوبہ نہ ہو ایسے غیر دینی جامعہ مدنی (جس کا آج کل بھت زیادہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے) میں حکومت کے تمام عہدوں کے سلسلہ میں تمام لوگ برابر ہونے چاہئیں، اور جیسا کہ کھتے ہیں کہ ایرانی معاشرہ جامعہ مدنی میں تبدیل ہونا چاہتے یعنی ایک یہودی بھی صدر مملکت ہو سکتا ہے کیونکہ تمام انسان، انسانیت میں برابر کے شریک ہیں، یعنی انسانوں میں پہلا درجہ یا دوسرا درجہ نہیں ہے کیونکہ وہ اس نعرہ کے ذریعہ چاہتے ہیں کہ ایک الحادی اور منخرف مذہب جو صھیونیزم سے وابستہ ہے ان کو قانونی طور پر مان لیا جائے وہ لوگ اس بھانہ سے کہ انسان ایک درجہ کے ہیں اور ان میں چند درجہ نہیں ہیں؛ یہ چاہتے ہیں کہ امریکہ اور صھیونیزم سے وابستہ گروہوں کو اہم عہدے مثلاً صدر مملکت کے عہدے پر بیٹھا دیا جائے۔

اگر ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم شہریوں کا اختلاف ایک حد تک قابل قبول ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے بنیادی قوانین میں بعض عہدوں کے لئے خاص شرائط رکھے گئے ہیں جیسا کہ خداوند عالم بھی ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا﴾ (۲)

”اور خدا کفار کے لئے صاحب ایمان کے خلاف کوئی راہ نہیں دے سکتا“

اس طرح کا نظریہ جامعہ مدنی سے کوئی مخالفت نہیں رکھتا، لیکن اسلامی نظریہ کے مطابق وہ جامعہ مدنی جس میں کافر اور مسلمان تمام حقوق اور مختلف عہدوں پر فائز ہونے میں سب برابر ہوں؛ قابل قبول نہیں ہے اور ہم صاف طور پر یہ اعلان کرتے ہیں کہ اسلام اس چیز کی اجازت نہیں دیتا کہ اسلامی معاشرہ پر کوئی کافر مسلط ہو اور مسلمانوں پر حکومت کرے، اسی طرح یہ بھی اجازت نہیں ہے کہ ایک ایسی پارٹی یا ایک ایسا مذہب جو ملحد اور صھیونیزم سے وابستہ ہو، اس کو قانونی طور پر مان لیا جائے؛ اس صورت میں کوئی فرق نہیں ہے کہ اس چیز پر انسانوں میں درجہ بندی کی تہمت لگائیں یا کوئی دوسرا نام رکھیں۔

۸۔ اسلامی انتخاب کے معیار سے مخالفت کے نئے حیلے

قارئین کرام! آج کل استکبار سے وابستہ بعض افراد اندرون ملک، انسانوں کے ایک درجہ کا نعرہ لگاتے ہوئے مغربی ممالک کی لیبرلزم اور ڈیموکریٹک کورائج کرنا چاہتے ہیں وہ اس مطلب کو معاشرہ کے اندر رائج کرنا چاہتے ہیں کہ انسانوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے لہذا ان کے حقوق بھی برابر ہیں اور ملک کے قوانین بناتے وقت ان کو بھی مد نظر رکھنا چاہئے۔

اگرچہ انسانوں کے درمیان دو درجہ نہ ہونے کو اسلام بھی قبول کرتا ہے، جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (۳)

”اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تم میں شاخیں اور قبیلے قرار دئے ہیں تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے“

مذکورہ آیت میں ذاتی اور تکوینی خصوصیات کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے بلکہ سب برابر ہیں اور اس لحاظ سے انسانوں میں کسی درجہ بندی کا تصور بھی ممکن نہیں ہے لیکن اسی آیت کے ذیل میں عرضی فرق کی طرف اشارہ موجود ہے؛ یعنی اگرچہ تکوینی (ذاتی) طور پر تمام انسان ایک ہی درجہ کے ہیں لیکن اکتسابی خصوصیات اور انسانی صفات کے صاحب امتیاز ہو سکتے ہیں، اسی وجہ سے با تقویٰ افراد خدا کے نزدیک ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ خداوند عالم کے نزدیک تمام انسان برابر ہیں اسی طرح صلاحیت اور شائستگی کے لحاظ سے چونکہ ایک دوسرے میں فرق پایا جاتا ہے لہذا معاشرہ میں ان کو عہدہ اور مقام دینے میں بھی برابر نہیں رکھا جاسکتا، کیونکہ ہر عہدہ کے لئے خاص شرائط رکھے گئے ہیں مثلاً پوری دنیا میں یہ کھیں نہیں ہوتا کہ ایک

جاہل انسان کو صدر مملکت بنا دیا جائے؛ تو کیا اس سلسلہ میں یہ کھا جاسکتا ہے کہ صدر مملکت کے عہدہ کے لئے پڑھے لکھے ہونے کی شرط لگانا؛ انسان کے برابر ہونے کے خلاف ہے؟ اور کیا یہ وہی انسانوں کے دو درجہ ماننا نہیں ہے؟

دنیا بھر میں اہم عہدوں مثلاً صدر مملکت کے عہدہ کے لئے خاص شرائط مقرر کئے گئے ہیں، ہماری حکومت میں بھی اسلامی ہونے کی وجہ سے اس کے لئے خاص شرائط رکھے گئے ہیں اور جس دلیل کے تحت صدر مملکت کو پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے، اسی دلیل کے تحت ایک اسلامی ملک کے صدر مملکت کا اسلام کا حامی اور طرفدار ہونا ضروری ہے، اور یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک ایسا شخص جو اسلام کا دشمن ہو، اسلامی ملک میں کسی بڑے عہدہ پر فائز ہو سکے؛ اور یہ مطلب اسلامی اصول پر منطبق ہے۔

پس اگر ممبر آف پارلیمنٹ یا دوسرے کاموں کے لئے مسلمان ہونے کی شرط لگائی گئی ہے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسانوں میں دو درجہ ہیں اگر اسلامی معاشرہ کے اندر ان حقوق اور ذمہ داریوں کے مقابلہ میں جو مسلمان انجام دیتے ہیں اسی طرح مسلمان خمس و زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اس کے مقابلہ میں، دوسرے ادیان کی پیروکاروں کے لئے الگ طریقہ پر حقوق اور وظائف معین کئے جائیں تو اس کا مطلب انسانوں میں درجہ بندی کے نہیں ہیں؛ اگرچہ ایک لحاظ سے ان فرقوں کی وجہ سے انسان کے درجے میں فرق پایا جاتا ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ”مقام رہبری“، ”ریاست جمہوری“ اور دوسرے اہم عہدے اس شخص کو دئے جاسکتے ہیں جو اسلام اور اسلامی حکومت کا مخالف ہو نیز بنیادی قوانین کو قبول نہ کرتا ہو، تو ایسا کرنا اس شخص کی مانند ہے جو اپنا کامل اختیار اپنے دشمن کو دیدے!! مسلماً ایسا کام نہ ہی عاقلانہ ہے اور نہ ہی ہونے والا، اور اگر بعض لوگ ایسا کرنا بھی چاہیں تو اسلام اس چیز کی اجازت نہیں دیتا؛ کیونکہ خداوند عالم نے کافروں کو مسلمانوں سے بہتر قرار نہیں دیا ہے اور مسلمانوں پر ان کی حکومت کو قبول نہیں کرتا یہ ہمارا عقیدہ ہے، اور ہمیں اس بات کا بھی ڈر نہیں ہے کہ ہم پر شہریوں کی درجہ بندی کی تہمت لگائی جائے۔

۹۔ اسلامی اصول اور اقدار کی حفاظت اور دشمن زینہ سازی سے مقابلہ کی ضرورت

ہم بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ تمام انسان، انسانیت میں شریک ہیں، لیکن بعض لوگ مغالطہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ تمام انسان، انسانیت کے ایک ہی درجہ پر فائز ہیں پس معاشرہ میں بھی ان کے تمام حقوق برابر ہونا چاہئے لیکن انسانیت میں برابر ہونے کا مطلب، حقوق میں بھی برابر ہونا نہیں ہے، اگرچہ تمام انسان انسانیت میں برابر کے شریک ہوں لیکن انسانی تمام لوازمات اور انسانی فضائل برابر نہیں ہیں، اسی چیز کے پیش نظر اسلامی معاشرہ میں ایسے بھت سے عہدے ہیں جن کے لئے خاص صلاحیتوں اور شائستگی کا ہونا ضروری ہے جس طرح رہبر کے لئے فقیہ (مجتہد) ہونا ضروری ہے تاکہ اسلامی احکام کے جاری ہونے پر نظر

رکھے، اور اگر وہ اسلام ہی کو نہ سمجھے تو پھر اس کی حفاظت بھی نہیں کر سکتا، اسی طرح صدر مملکت کا مسلمان ہونا ضروری ہے، ایک یہودی یا عیسائی ایک ایسے معاشرہ پر حکومت نہیں کر سکتا جس کی ۹۰ فی صد آبادی مسلمان ہو۔

ہمیں اس چیز کا ڈر نہیں ہونا چاہئے کہ وہ اخبار یا وہ صاحبان قلم جو عالمی استخبار سے وابستہ ہیں وہ ہم پر اس بات کی تہمت لگائیں کہ یہ لوگ شہریوں میں دو درجہ کے قائل ہیں کیونکہ ان سے امید بھی اور کیا ہو سکتی ہے، کیونکہ وہ لوگ تو اسلامی ضروریات کے بھی منکر ہیں ہمیں ہر حال میں یہ کوشش کرنی چاہئے کہ اسلامی حکومت کے زیر سایہ واقعی اسلام کو دنیا والوں کے سامنے پیش کریں، نہ کہ جس طرح سے دشمن چاہتے ہیں ہمیں اسلامی اقدار کو کم رنگ نہیں کرنا چاہئے تاکہ ہمارا دشمن ہم سے خوش رہے۔

اگر ہم نے کوئی بات کھی یا کچھ لکھا تو اس سے امریکہ سے وابستہ اخبار یا ذرائع ابلاغ کو خوشی ہو اور وہ ہماری تعریف کریں، اس صورت میں ہمیں خوش نہیں ہونا چاہئے بلکہ اگر ہمارے کام سے ہمارا دشمن راضی اور خوشحال ہو، تو ہمیں غمگین ہونا چاہئے۔

افلاطون کے بارے میں مشہور ہے کہ بعض لوگوں نے اس سے آکر کہا کہ ”فلاں شخص تمہاری بھت تعریف کرتا ہے“ یہ سن کر افلاطون رونے لگا، جب لوگوں نے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ ”مجھے نہیں معلوم کہ مجھ سے ایسا کونسا جاہلانہ کام ہو گیا ہے جس کی بنا پر اس جاہل شخص کو مجھ سے خوشی ہوئی“!

لہذا اگر ہم سے دشمن کے نفع میں کوئی کام ہو گیا ہے جس کی بنا پر وہ خوشحال ہو گیا اور اگر اسلام کو اس طرح پہنچنوا یا کہ دشمن کو اچھا لگا تو گویا ہم نے دشمن کی خدمت کی ہے اسلام کی نہیں! ہمیں اس اسلام کا دفاع کرنا چاہئے جس کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام نے ہم تک پہنچایا ہے، نہ اس اسلام کا جس کی تلقین اسلام دشمن طاقت کر رہی ہے۔

قارئین کرام! خلاصہ کلام یہ ہوا کہ ہم جامعہ مدنی کے اس خاص معنی کو قبول کرتے ہیں جو اسلام سے اخذ شدہ ہو، اور اس سے دور ہونا حقیقت میں اسلام سے دور ہونے کی وجہ سے ہے، لہذا اسلامی جامعہ مدنی کی بنا پر اصل یہ ہے کہ معاشرہ کے امور عوام الناس کے ذمہ ہوں لیکن مغربی ممالک کے جامعہ مدنی کے لحاظ سے جس میں دین سے دوری اختیار کی جاتی ہے نیز اس جامعہ مدنی میں تمام انسان چاہے کافر ہوں یا مسلمان؛ تمام کے اجتماعی حقوق اور معاشرہ میں عہدہ داری مساوی ہو ہم اس جامعہ مدنی کو قبول نہیں کرتے اگرچہ بعض لوگوں کی کوشش یہ ہے کہ تمام لوگ معاشرہ کے اہم عہدوں پر فائز ہونے کے اعتبار سے مساوی ہیں، چاہے وہ مسلمان ہوں یا کافر اور چاہے بنیادی قوانین کو قبول کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں، اور اسی کو وہ جامعہ مدنی مانتے ہیں!! ہم اس طرح کے جامعہ مدنی کو رد کرتے ہیں کیونکہ ہمارے نزدیک مسلمان اور غیر مسلمان ملک کے اہم عہدوں پر فائز ہونے کے اعتبار سے مساوی نہیں ہیں تو اسلام؛ ہمیں جامعہ مدنی کے نام پر، عالمی صحیونیزم سے وابستہ پارٹی کو اس ملک کے قانونی مذہب میں شمار کرنے کی اجازت کیسے دے سکتا ہے۔

حوالے:

(۱) ٹوٹا لیٹر، اس حکومت کو دکھاتا ہے جو ایک گروہ کے نفع میں قوانین بنائے اور اپنے مخالفین کو مخفی پولیس وغیرہ کے ذریعہ نابود کرنے کی درپے ہو، (مترجم)

(۲) سورہ نساء آیت ۱۴۱

(۳) سورہ حجرات آیت ۱۳

ستائیسواں جلسہ

اسلامی حکومت کی خاص پہچان

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

قارئین کرام! جیسا کہ ہم نے گذشتہ جلسوں میں عرض کیا کہ ہماری بحث ”اسلام کے سیاسی نظریات“ کا یہ حصہ مخصوص ہے حکومت کی ذمہ داریاں اور اس کے اختیارات کی تحقیق و بررسی سے اور جو مباحث اس موضوع سے مربوط ہیں بے شک حکومت کی ذمہ داریوں کی صحیح شناخت تب ہی ہو سکتی ہے جب ہم حکومت کے فلسفہ کو سمجھ لیں، اور کوئی بھی مجموعہ، کوئی بھی عضو یا کوئی بھی حصہ ایک خاص ضرورت اور ایک خاص ہدف کے لئے بنایا جاتا ہے؛ کیونکہ اگر وہ اس کے ماتحت نہ ہوں تو اس میں نقص اور خلل واقع ہو جائے گا، اور پھر معاشرہ کی ضرورتیں اور مصلح مکمل طور پر محقق نہیں ہو پائیں گی پس ہر عضو یا ہر مجموعہ کے وظائف اور ذمہ داریاں ان کی ضرورت کے تحت؛ ان کے وجود کا تقاضا کرتی ہے۔

حکومت کے سلسلہ میں قانون گزار طاقت کی ضرورت واضح ہو گئی، کیونکہ کوئی ایسی ہیئت یا کمیٹی ہو جو معاشرہ کے لئے ضروری قوانین بنائے لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قوہ مجریہ (حکومت) کی کیا ضرورت ہے؟ وجود حکومت کا فلسفہ کیا ہے، اور اگر حکومت نہ ہوتی تو پھر کیا حالات پیدا ہوتے؟ اور اگر عوام الناس کی اس طرح سے اخلاقی اور معنوی تربیت ہو جاتی کہ وہ کسی بھی حال میں قانون کی خلاف ورزی نہ کرتے تو کیا پھر حکومت کی ضرورت نہ تھی؟ اس صورت میں حکومت کی اصلی علت معاشرہ میں قوانین کو جاری کرنے کی ضمانت ہوگی، اس بنیاد پر بعض لوگوں کا یہ تصور ہے کہ لوگوں کی اس طرح تربیت کی جا سکتی ہے کہ خود اپنی مرضی سے اپنی ذمہ داریوں پر عمل کریں اور پھر کسی ضامن یعنی حکومت کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن مسلم طور پر یہ نظریہ حقیقت سے کوسوں دور ہے، اور جیسا کہ ہم نے حکومت کی ضرورت پر دلائل کے سلسلہ میں پہلے بھی عرض کیا کہ حکومت کی ضرورت پر ضمانت اجرائی کے علاوہ دوسرے دلائل بھی موجود ہیں؛ منجملہ معاشرہ کی عظیم اور اہم ضرورتوں کا ہونا جو معاشرہ کے تمام افراد سے متعلق ہوتی ہیں، اور کوئی خاص شخص یا کوئی خاص گروہ ان کا عہدہ دار نہیں ہو سکتا، اور ان میں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی ایک ایسی ہم آہنگ کمیٹی ہو جو اپنی منصوبہ بندی کے تحت معاشرہ کی ان ضرورتوں کو پورا کر سکے ہم نے یہ (بھی) عرض کیا کہ معاشرہ کی عام ضرورتوں میں سے ملک پر حملہ کرنے والوں کے مقابلہ میں جنگ اور دفاع کا مسئلہ بھی ہے بے شک جب جنگ زوروں پر ہوتی ہے تو کوئی خاص فرد یا خاص گروہ دشمن کے حملہ کو روکنے پر قادر نہیں ہو سکتا اور تنہا جنگ کو ادارہ

نہیں کر سکتا، بلکہ معاشرہ میں ایک ہمہ گیر اور سسٹائیٹک قدرت کا ہونا ضروری ہے تاکہ جنگ میں کامیابی مل سکے اور اپنی منصوبہ بندی کے ذریعہ عوام الناس کو جنگ میں شرکت کی دعوت دے اور ان کو ٹرینڈ کر کے جنگی فنون میں ماہر بنا کر آمادہ جنگ کرے۔

ان کے علاوہ معاشرہ کی دوسری ضروریات بھی ہوتی ہیں کہ جن کو پورا کرنا حکومت کے زیر سایہ ہی ممکن ہے؛ مثلاً معاشرہ میں حفظ الصحت، تعلیم و تربیت اور ضروری دانش کو پورا کرنا؛ اسی طرح دوسری ضروریات بھی ہوتی ہیں جن کے لئے مخصوص وزارت خانے ہونے ضروری ہوتے ہیں اور ظاہر سی بات ہے کہ معاشرہ کے حالات بدلنے اور نئی نئی قسم کی ضرورتوں کا ایجاد ہونا؛ جن کے لئے الگ الگ وزارت خانے ہونے ضروری ہیں؛ مثلاً معاشرہ کی ضرورت کے لئے بعض حالات میں اگر صرف پانچ وزارت خانے کافی ہوں لیکن نئی نئی ضرورتوں کے پیش نظر ان وزارت خانوں میں اضافہ کیا جاسکتا ہے، اور یہ مناسب نہیں ہے کہ قانون میں مخصوص تعداد میں وزارت خانے معین کئے جائیں بلکہ ان کی تعداد زمان و مکان کے شرائط کے لحاظ سے ہونا چاہئے لہذا اسلامی سیاسی نظریہ کے لحاظ سے بھی یہ معین نہیں ہے کہ اسلامی ملک کا صدر کتنے وزیر رکھ سکتا ہے، بلکہ اس مسئلہ کو آزاد رکھا گیا ہے تاکہ زمانہ کے پیش نظر اور مختلف ضرورتوں کے لحاظ سے وزارت خانے تعین کئے جائیں۔

۲۔ نظام اسلامی اور لائیک نظام میں حکومت کے سلسلہ میں بنیادی فرق

قارئین کرام! یہ بات طے ہو چکی ہے کہ حکومت کی ضرورت کا فلسفہ معاشرہ کی مختلف ضرورتیں ہیں جن کو صرف حکومت ہی انجام دے سکتی ہے خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ حکومت کی مخصوص ذمہ داری؛ معاشرہ کی مختلف ضرورتوں کو پورا کرنا اور قوانین کا نافذ کرنا ہے۔

ہم نے قانون گذاری کی بحث میں یہ عرض کیا کہ وسعت کے لحاظ سے اسلامی معاشرہ کے قوانین لائیک حکومتوں سے مختلف ہیں؛ کیونکہ لائیک حکومتوں میں قوانین کو صرف عوام الناس کی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بنایا جاتا ہے، اور ان کی حکومت کی بنیاد ہی عوام الناس کی صرف مادی اور دنیاوی ضرورتوں کو پورا کرنا ہوتا ہے یہاں تک کہ بعض حکومتوں میں اس بات کی شرط کی جاتی ہے کہ دین کے بارے میں کوئی حمایت نہ ہو، اور کسی بھی حکومتی ادارہ میں دین کی کوئی طرفداری یا اس کی حمایت دکھائی نہ دے۔

لیکن اسلامی حکومت میں قوانین کو صرف مادی ضرورتوں کے لحاظ سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ معنوی ضرورتوں کو بھی مد نظر رکھا جاتا ہے، بلکہ معنوی مصالح کو مقدم رکھا جاتا ہے یہ مسئلہ بالکل قوہ مجریہ (حکومت) میں بھی بیان ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں حکومت ان قوانین کو جاری کرنے کی ضامن ہے جو دنیاوی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں اور معنوی (اور اخروی) زندگی سے بھی متعلق ہوتے ہیں جس دلیل کے تحت ہم نے قانون گذاری کے سلسلہ میں عرض کیا کہ قوانین کو ایسا ہونا ضروری ہیں جن سے

معنوی ضروریات بھی پوری ہوں بلکہ ان کو مقدم رکھا جائے، اسی دلیل کے تحت اسلامی حکومت کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ معنوی مصلح، حقوق الہی اور اسلامی شعار (رسومات) سے متعلق قوانین کو بھی نافذ کرے، اور اس سلسلہ میں ہونے والی خلاف ورزیوں کا سدباب کرے اور اگر کوئی اسلامی مقدسات کی اہانت کرنا چاہے تو اس کو بھی روکے؛ بے شک یہ مسئلہ حکومت کی اہم ذمہ داریوں میں سے ایک ہے۔

۳۔ مغربی کلچر کے عاشق افراد کی طرف سے سیکولر حکومت کی پیش کش

بعض اخباروں اور تقریروں میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حکومت کی ذمہ داری، عوام الناس کی مادی ضرورتوں کا پوری کرنے، ملک میں امن و امان کو برقرار رکھنے اور ہرج و مرج (افرا تفری) سے روک تھام کے علاوہ کوئی ذمہ داری نہیں ہے اور معنوی اور دینی مصلح کو پورا کرنا علماء اور دینی مدارس کی ذمہ داری ہے! یہ نظریہ مغربی کلچر اور سیکولر طرز تفکر سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے، جیسا کہ ہم نے اس سے قبل بھی عرض کیا کہ مغربی ممالک کے کلچر کا سب سے واضح امتیاز ”سیکولرزم“ ہے یعنی دین کو سیاست سے جدا کرنا لائیک اور بے دین حکومتوں میں دنیاوی امور حکومت سے متعلق ہوتے ہیں لیکن معنوی امور حکومت سے متعلق نہیں ہوتے اگر کچھ لوگ دین اور معنوی امور میں مشغول ہونا چاہتے ہیں تو اپنے اس ہدف کے تحت ذاتی امکانات کو خرچ کریں اور اس سلسلہ میں سرکاری امکانات سے استفادہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ دین کے سلسلہ میں حکومت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اسلامی ثقافت کے بالکل برعکس جس کے اہم ترین وظائف میں سے: اسلام کو حفظ کرنا، معاشرہ میں اسلامی شعار کو رائج کرنا اور ان کو بھلا دینے جانے سے روک تھام کرنا نیز بے توجہی اور خدا نخواستہ اسلامی شعار اور مقدسات کی توہین کرنا؛ وغیرہ ہے۔

جو لوگ اسلامی ثقافت کو قبول نہیں کرتے بلکہ مغربی کلچر کے تابع ہیں؛ ان کی طرف سے اس نظریہ کا پیش ہونا کہ ”حکومت کو دینی امور میں دخالت نہیں کرنا چاہئے۔“ بعید نہیں ہے اور ہمارا ان سے یہ اختلاف بنائی ہے اور ہماری ان سے یہ بحث ہے کہ اسلام حق ہے یا نہیں؟ لیکن یہ نظریہ ان لوگوں کی طرف سے جو خود کو مسلمان اور اسلامی اصول کا معتقد سمجھتے ہیں ان کے لئے مناسب نہیں ہے، اور اس طرح کی گفتگو کرنا اس بات کی نشانی ہے کہ انھوں نے اسلامی ثقافت کو نہیں سمجھا ہے۔

۴۔ اسلامی شعار کا حفظ اور رائج کرنا، حکومت کی ایک ذمہ داری

پس جو ذمہ داری مشترک طور پر لائیک اور دینی حکومت کی ہوتی ہے؛ اس کے علاوہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اسلامی شعار کو قائم کرے البتہ عوام الناس اپنی مرضی سے بعض اسلامی رسومات کو انجام دے سکتے ہیں؛ مثلاً نماز جماعت کا برقرار کرنا، محفل اور عزا داری کرنا، دینی مدارس قائم کرنا، اسلامی پروگراموں کے منعقد کرنے کے لئے ملی اور مذہبی مرکز قائم کرنا ان میں

سے حوزات علمیہ دینی اہم مرکزوں میں شمار ہوتے ہیں جو عوام الناس کی دی ہوئی رقوم شرعی سے چلتے ہیں اور اسلامی شعار کے حفظ ، ان کی ترویج اور اسلامی ثقافت کی تبلیغ میں مشغول رہتے ہیں ، ان کے لئے حکومت کوئی فنڈ معین نہیں کرتی لیکن عوام الناس کا ان شعار کو انجام دینا حکومت کی ذمہ داری کو سلب کرنے کے معنی میں نہیں ہے، اور ایسا نہیں ہے کہ پھر ان امور میں حکومت کی کوئی ذمہ داری نہیں رہ جاتی کیونکہ اگر عوام الناس کا رضا کارانہ طور پر کام کرنا کافی نہ ہو تو پھر ان امور کو انجام دینا حکومت کی ذمہ داری ہے مثال کے طور پر: حج ایک عبادی وظیفہ ہے اور جو شخص مستطیع ہو جائے تو اس کے لئے حج کرنا واجب ہو جاتا ہے، مجتہدین کرام؛ فقہی کتابوں اور روایات سے استفادہ کرتے ہوئے اس مسئلہ کو بیان کرتے ہیں کہ اگر ایک ایسا موقع آجائے کہ اسلامی ملک کے پورے معاشرہ میں کسی پر حج واجب نہ ہو یا اگر کسی پر واجب تو ہو گیا ہے لیکن وہ حج پر جانے کے لئے تیار نہ ہو، بلکہ نافرمانی کرے اور اپنی مرضی سے کوئی حج نہ جائے اور خانہ کعبہ کے خالی رہ جانے کا اندیشہ ہو، تو اس موقع پر اسلامی حکومتوں پر مسلمانوں کے بیت المال سے ایک گروہ کو حج کے لئے بھیجنا واجب ہے؛ کیونکہ وہ اسلامی شعار جو تمام ہی مسلمانوں کے لئے حفظ مصالح کے باعث ہیں وہ تعطیل نہیں ہونے چاہئیں۔

پس جبکہ حج ایک عبادی مسئلہ ہے اور دنیاوی اور سیاسی امور میں شمار نہیں ہوتا اور خود عوام الناس انجام دیتے ہیں اور اپنے پاس سے خرچ کرتے ہیں، لیکن اگر عوام الناس نے نافرمانی کی یا حج بجالانے کی قدرت نہ رکھتے ہوں تو پھر اسلامی حکومت پر اسلامی شعار کو قائم کرنے اور قوانین کو جاری کرنے کے ضامن کے عنوان سے؛ یہ ذمہ داری ہے کہ حج کو انجام دینے کے مقدمات فراہم کرے۔

اس بنا پر اسلامی اور لائیک حکومت کا بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلامی حکومت ہر چیز سے پہلے اسلامی شعار اور اسلام کے اجتماعی احکام و قوانین کو جاری کرنے کی فکر میں رہے اور ان کو مقدم رکھے البتہ عملی میدان میں معنوی اور مادی امور میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا لیکن بالفرض اگر ان میں ٹکراؤ ہو بھی جائے تو پھر معنوی امور کو مقدم کرے۔

لہذا اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں کی سرفہرست درج ذیل چیزیں ہونا چاہئے: اسلامی شعار کو قائم کرنا، قوانین اور اسلامی ثقافت کی حفاظت کرنا اور ایسی چیزوں کی روک تھام کرنا جو معاشرہ میں اسلامی ثقافت کے کمزور ہونے کا باعث بننے نیز کفر کے رسومات سے روک تھام کرنا۔

۵۔ حکومت اور اس کے کرداری پہلو

قارئین کرام! ہم نے اس سے پہلے بھی عرض کیا کہ حکومت پر لازم ہے کہ وہ معاشرہ کی بعض ضرورتوں کو پورا کرنے کی خود ذمہ داری قبول کرے، مثلاً دفاع اور جنگ کا مسئلہ، جس میں منصوبہ بندی، سیاست گذاری اور اس کے اجرائی امور تمام مسائل

حکومت کے ذمہ ہوتے ہیں لیکن حکومت کے مخصوص کاموں کے علاوہ یہ بھی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اسلامی معاشرہ کی بعض ضرورتوں کو پورا کرنے میں اپنا کردار ادا کرے جس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ حکومت صرف منصوبہ بندی، سیاست گذاری اور ان کے اجراء پر نظارت رکھے اور براہ راست ان امور میں دخالت نہ کرے۔

۲۔ منصوبہ بندی، سیاست گذاری اور نظارت کے علاوہ ان امور کو خود اپنے ذریعہ انجام دے۔

مزید وضاحت کے لئے عرض کرتے ہیں کہ معاشرہ کے کسی ایک پروجیکٹ کو کامیاب بنانے کے لئے پہلے اس کے مقاصد کا روشن ہونا ضروری ہے تاکہ اسی بنا پر منصوبہ بندی کی جاسکے، اس کے بعد اس کو آگے بڑھانے کے لئے اس کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو منظم کیا جاتا ہے کیونکہ کسی ایک پروجیکٹ کے لئے مدت معلوم ہونی چاہئے شروع اور ختم ہونے کی مدت معلوم ہو اور اس کا خرچ بھی موجود ہو اس مرحلہ کے بعد جو کمپنی اس کام کو کرنا چاہے اس کو طے کیا جاتا ہے؛ یعنی یہ معین کیا جاتا ہے کہ کون لوگ اور کس شکل میں اس پروجیکٹ کو انجام دیں گے، اس کا مدیر، اس میں کام کرنے والے اور ان کے وظائف معین کئے جاتے ہیں مثلاً امام خمینی انٹرنیشنل ایرپورٹ پروجیکٹ کو لے لیجئے: پہلے یہ طے ہوتا ہے کہ کیا اس ایرپورٹ کی ضرورت ہے یا نہیں (اگرچہ یہ بات ملک کی اہم سیاست گذاری سے متعلق ہے) جس کی بنا پر یہ طے ہوتا ہے کہ اس پروجیکٹ پر کام ہونا چاہئے یا نہ؟ اور جب پروجیکٹ کو قبول کر لیا جاتا ہے تو پھر اس سلسلہ میں منصوبہ بندی کی جاتی ہے اور یہ طے کیا جاتا ہے کہ یہ پروجیکٹ کتنی زمین میں اور کس طرح کے امکانات کے ساتھ انجام دیا جائے اور کس نقشہ کے تحت ہو اس کے بعد اس کا مدیر اور اس کے شروع ہونے کی تاریخ معین کی جاتی ہے، آخر میں اس پروجیکٹ کی بولی لگائی جاتی ہے تاکہ جو کمپنی کم خرچ میں اس پروجیکٹ کو مکمل کرنے پر آمادہ ہو تو اس کام کو اس کے حوالے کر دیا جائے اس صورت میں ایک وقت حکومت سیاست گذاری اور منصوبہ بندی کے بعد اس پروجیکٹ کو بھی اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہے اور کوئی سرکاری شعبہ یا کوئی وزارت خانہ اس پروجیکٹ پر کام کرتا ہے اور اس پروجیکٹ کا خرچ سرکاری خزانہ سے اور سرکاری افراد کے ذریعہ تکمیل ہوتا ہے یا کسی پروجیکٹ کو معین کرنے کے بعد کسی کمپنی کے حوالے کیا جاتا ہے تاکہ اس پروجیکٹ کو عملی جامہ پہنائے، بھر حال دونوں صورتوں میں حکومت اس پروجیکٹ کو عملی بنانے کا وعدہ کرتی ہے لیکن ممکن ہے کہ حکومت کسی پروجیکٹ کے لئے؛ سیاست گذاری اور منصوبہ بندی کے بعد اس کام کو خود اپنے ذمہ نہ لے، اور اس کے خرچ اور اس پر کام کرنے کے لئے دوسروں کے حوالہ کر دے اور خود صرف نظارت کرتی رہے؛ یعنی حکومت اپنی طرف سے کچھ معائنہ کار افراد کو معین کرتی ہے تاکہ قوانین اور مقررات کی خلاف ورزی کی روک تھام کی جاسکے اور نقشہ کے مطابق عمل نہ کرنے سے روکا جاسکے نیز عوام الناس کے مال کو تلف اور برباد ہونے سے روک تھام کی جاسکے اور کوشش یہ کی جاتی ہے کہ پروجیکٹ اسی اصل نقشہ کے تحت عمومی مصالح کے قوانین کے مطابق عملی جامہ پہنایا جاسکے۔

۶۔ ”ٹوٹالیٹر“ (Totalitair) اور ”لیبرل“ حکومت کا مدل

ان پروجکٹ کے مقابلہ میں معاشرہ کی ضرورتیں مثلاً جنگ اور دفاع، تعلیم و تربیت، علاج معالجہ اور شہر کی صفائی وغیرہ کا انتظام قاعدتاً حکومت کے ذمہ ہوتا ہے، لیکن یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حکومت کی ذمہ داری صرف ان ضرورتوں میں منصوبہ بندی اور حد اکثر نظارت ہوتی ہے؟ یا منصوبہ بندی اور نظارت کے علاوہ ان کو جاری کرنے کی بھی ذمہ داری اسی کی ہوتی ہے، اور بنیادی طور پر اسلام کی نظر میں کونسا طریقہ صحیح ہے؟ کیا اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں کے بنانے کا خرچ حکومت کے ذمہ ہے؟ یا اس کا کچھ حصہ حکومت کے ذمہ ہوتا ہے اور کچھ حصہ عوام الناس کے ذمہ ہوتا ہے؛ جیسا کہ اکثر ممالک میں منجملہ ہمارے ملک میں ایسا ہوتا ہے کہ ابتدائی تعلیم سب کے لئے ضروری ہے اور اس کا خرچ بھی حکومت کے ذمہ ہے، لیکن یونیورسٹی کی تعلیم کا خرچ حکومت کے ذمہ نہیں ہے بلکہ حکومت یونیورسٹی میں فیس لے کر اعلیٰ تعلیم دیتی ہے، اگرچہ بعض ملکوں میں یونیورسٹی کی تعلیم بھی مفت ہوتی ہے۔

بعض حکومتوں میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ معاشرہ کے زیادہ سے زیادہ امور حکومت کے ذریعہ انجام پائیں، اور یہ طریقہ کار بڑے بڑے مالداروں کی ظالمانہ رفتار اور اپنے ذاتی مفاد کے لئے معاشرہ کے فوائد کو خطرہ میں ڈالنے والے افراد کے مقابلہ میں ایک عکس العمل ہے کیونکہ یہ جامعہ گمراہ معاشرہ کسی فکر رکھنے والا (نظریہ اور سوسیالیسٹ "Socialiste"، کمیونسٹ "Communist" ملکوں کا وجود میں آنا؛ مالدار ملکوں میں عوام الناس پر ہونے والے ظلم و ستم کا نتیجہ تھا کیونکہ مغربی ممالک میں غریبوں کے حق میں مالداروں نے اس قدر ظلم کیا جس کے نتیجہ میں یہ شدت پسند نظریہ وجود میں آیا کہ تمام کام حکومت کے ذمہ ہو، اور حکومت کو ہونے والے عام فائدوں کو تمام لوگوں کے درمیان برابر سے تقسیم کیا جائے تاکہ تمام لوگ اجتماعی زندگی کے امکانات سے بھرہ مند ہو سکیں، درحقیقت عام زندگی کے امکانات سے تمام لوگوں کا برابر ہونا اور عوام الناس سے ظلم کو دور کرنا؛ معاشرتی، سیاسی اور معاشی مسائل میں یہ نظریہ سوسیالیسٹ کا ہے جو دس بیس سال پہلے سے کافی رنگ لایا ہے اور میٹریالیزم (Materialism) نظریہ کے ساتھ نیز فقر و غربت کو دور کرنے اور تمام لوگوں میں مساوات ایجاد کرنے جیسے نعروں کے ذریعہ بڑے بڑے ملکوں میں (قدیم) روس اور چین وغیرہ میں حکومت کرنے لگا اور اس کے بعد سے مالدار ممالک بلوک "Bloc" کا سخت رقیب مانا جانے لگا۔

چنانچہ اس نظریہ کی جذابیت اور اس کے نعرے ہمارے ملک میں بھی بعض لوگوں کو بھت اچھے لگے اور ایک مدت تک اس نظریہ کی حمایت ہونی لگی، نیز بھت سے افراد اس کے طرفدار بن گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گذشتہ زمانہ میں (انقلاب اسلامی سے پہلے) ہمارے ملک میں بھی سوسیالیسٹ اور کمیونسٹ پارٹیاں تشکیل پائیں لیکن انقلاب اسلامی کی وجہ سے اس کی جڑیں ہل گئیں، اور اس کا بوریا بستر پلٹ گیا، تاریخی تجربہ نے یہ ثابت کیا کہ وہ حکومت (جو مالداروں اور صاحب قدرت لوگوں کو سوء استفادہ کرنے

سے روک تھام کے نعرہ سے برسریکار آتی ہے) اس کا سیاسی، اجتماعی اور معاشی معاملات میں تمام کاموں میں ذمہ داری لینا صحیح اور کارآمد نہیں ہے، اور جلد ہی ان کے خاتمہ کا باعث اور کمیونسٹی بلوک کے ممالک کا شیرازہ بکھرنے کا سبب ہے مخصوصاً ہمارے شمالی پڑوسی ملک کا حال سب نے دیکھا کہ کمیونسٹی نظریہ کی اجتماعی اور سیاسی بنیادیں کس طرح ہلکی اور روس جیسی عظیم طاقت کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا اور اس ملک کی شہنشاہیت کا جنازہ نکل گیا۔

قارئین کرام! مذکورہ نظریہ بھی فلسفہ سیاست میں ایک نظریہ ہے جس کی بنا پر حکومت معاشرہ کے مختلف امور میں زیادہ سے زیادہ دخالت رکھتی ہے، تاکہ مالداروں اور صاحب قدرت لوگوں کو ناجائز فائدہ اٹھانے سے روکا جاسکے (لیکن ہم اس وقت مذکورہ نظریہ کسی کمزوریاں نہیں بیان کرنا چاہتے) اس کے مقابلہ میں کمیونسٹ "c o m m u n i s t e"، سوسیالیسٹ "S o c i a l i s t e" اور لیبرل نظریات ہیں جن کی بنا پر معاشرہ کے تمام امور خود عوام الناس کے ذمہ ہوتے ہیں، اور اپنے کام میں آزاد ہوتے ہیں کہ جس طرح چاہیں عمل کریں اس نظریہ میں حکومت معاشرہ کے کاموں میں کم سے کم دخالت کرتی ہے نیز اس کی دخالت ضروری حد تک اور معاشرہ میں بد نظمی کو روکنے کے لئے ہوتی ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ لیبرل نظریہ میں چونکہ عوام الناس اقتصادی، سیاسی اور اجتماعی امور سے مکمل طور پر آزاد ہوتے ہیں اور جو افراد زیادہ امکانات اور قابلیت رکھتے ہیں تو وہ لوگ تمام ہی چیزوں سے خصوصاً معاشی امور میں بھت زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور دوسروں سے مقابلہ جیت جاتے ہیں جس کے نتیجہ میں اقتصادی کاروبار ان کو بھت زیادہ فائدہ پہنچاتا ہے، جبکہ ان کے مقابلہ میں کمزور اور غریب لوگ جن کے پاس کم امکانات ہوتے ہیں وہ مزید غریب اور کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

لوگوں کے درمیان یہ اختلاف اور معاشرہ کے بھت کم مالدار افراد کا عمومی اور ملی سرمایہ کا مالک بن جانا، نیز معاشرہ کے دوسرے طبقات میں فقر و غربت کا بڑھنا؛ یہ سب سبب بنتے ہیں کہ عوام الناس اعتراض کرے اور حکومت کے خلاف مظاہرے کرنے لگیں اور پھر ان کو سیاست میں آنے نہیں دیا جاتا، اس کے بعد کمیونسٹ نظام کا تشکیل پانا جس میں معاشرہ کے غریب لوگوں کا زیادہ دھیان رکھا جاتا ہے لیکن لیبرل ملکوں میں بھی حکومت کے خلاف مظاہروں اور انقلاب سے روکنے کے لئے کم درآمد لوگوں کو کچھ سھولتیں دی جاتی ہیں۔

اس وقت یورپی ممالک جن کے بھت سے ملکوں میں لیبرل نظام کسی حکومت ہوتی ہے ان میں بھی سوسیالیسٹ "S o c i a l i s t e" پارٹیاں اپنی کارکردگی دکھاتی ہیں، یہاں تک کہ بعض حکومتوں میں سوسیالیسٹ یا سوسیال ڈیموکریٹک پارٹیاں کامیاب ہوتی ہیں مثلاً انگلینڈ کے پارلیمنٹ کے انتخابات میں "کارگر پارٹی" کبھی کبھی اکثریت سے کامیاب ہو جاتی ہے صرف اسی وجہ سے کہ اس کا نظریہ سوسیالیسٹ ہے اور اس نظریہ میں غریب اور کم درآمد لوگوں کو خیال رکھا جاتا ہے اور یہ بھی اس وجہ سے ہوتا ہے کہ کھیں معاشرہ کا غریب اور کم درآمد طبقہ حکومت کے خلاف انقلاب برپا نہ کر دے؛ کیونکہ جب معاشرہ کے

تقریباً سبھی طبقات کے لئے عام سھولتیں مھیا ہوں گی تو پھر غریب عوام الناس حکومت کے خلاف قدم نہیں اٹھائیں گے عوام الناس کی سھولیات میں جن چیزوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

۱- اپابج اور بے کار لوگوں کے لئے بیھ۔

۲- میڈیکل بیھ۔

۳- سرکار کی طرف سے کم درآمد لوگوں کے لئے مکان بنوانا اور ان کو کم سے کم کرایہ پر دینا۔

حکومتی سیاسی فلسفہ میں ایک دوسرے کے مخالف نظریات پائے جاتے ہیں:

پھلا نظریہ سوسیا لیسٹی ہے جس میں معاشرہ کو اصل مانا جاتا ہے اور معاشرہ کے مفاد کو ذاتی مفاد پر مقدم کیا جاتا ہے، کیونکہ اس نظریہ میں معاشرہ پر توجہ کی جاتی ہے چنانچہ اس نظریہ کو عملی بنانے کے لئے حکومت کی ذمہ داریوں اور دخالت میں اضافہ ہو جاتا ہے، اور معاشرہ کے اجتماعی امور میں حکومت کی ذمہ داریوں کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے تاکہ عمومی سرمایہ کو غارت ہونے اور غریب و مستضعف لوگوں پر ظلم و ستم ہونے سے روک تھام کر سکے۔

دوسرا نظریہ لیبرل ہے جس میں خاص دلیلوں کے تحت اس چیز پر اعتقاد رکھا جاتا ہے کہ حکومت کو معاشرہ کے امور میں کم سے کم دخالت کرنی چاہئے۔

قارئین کرام! آج کل تقریروں، اخباروں، مقالوں اور کتابوں میں جو لکھا جاتا ہے کہ حکومت کو کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ دخالت کرنی چاہئے انہیں دو نظریات کی بنا پر ہے اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ یورپی اور مغربی ممالک میں اکثر لیبرل نظریہ پایا جاتا ہے اور ایسی حکومتوں میں (وہ ادارے بھی جو ہمارے ملک میں سرکاری ہوتے ہیں) اکثر ادارے پرائیویٹ ہوتے ہیں، مثلاً مذکورہ ممالک میں محکمہ ڈاک یا محکمہ ٹیلی فون سرکاری نہیں ہوتے بلکہ پرائیویٹ ہوتے ہیں، اور ڈاک کا سارا کام، نیز مختلف شھروں میں فون وغیرہ کی خدمات پیش کرنا پرائیویٹ کمپنیاں کرتی ہیں، وہاں پر حکومت صرف منصوبہ بندی اور نظارت کرتی ہے اسی طرح بجلی، پانی اور معاشرہ کے دیگر ضروریات کو پرائیویٹ کمپنیاں کرتی ہیں لیکن ہمارے ملک میں یہ چیزیں حکومت کے ذمہ ہوتی ہیں۔

۱۔ اسلامی نظریہ کے تحت حکومت کیسی ہونا چاہئے

قارئین کرام! یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ نظریات میں سے اسلام کس نظریہ کو مناسب سمجھتا ہے؟ کیا حکومت کی وسیع پیمانے پر دخالت کو پسند کرتا ہے یا حکومت کی کم سے کم دخالت اور معاشرہ کے امور کو عوام الناس کے سپرد کرنے کو پسند کرتا ہے؟ جیسا کہ ہم نے پہلے جلسے میں عرض کیا کہ عوام الناس کا وسیع پیمانے پر مختلف میدان میں شرکت کرنا حقیقت میں ”جامعہ مدنی“ کے ایک معنی میں سے ہے، اور اس معنی کے لحاظ سے اجتماعی کاموں کو خود عوام الناس پر چھوڑ دیا جانا چاہئے کیونکہ جب

ہم اسلامی اصول کی بنیاد پر حکومت کے سلسلہ میں اسلامی نظریہ کو دریافت کرنا چاہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں اسلام کا رویہ درمیانی ہے؛ جو آرزوں اور حقیقت دونوں میں شامل ہوتا ہے۔

وضاحت:

بہت سی وہ تھیوری جو یونیورسٹیوں، حوزات علمیہ یا دیگر جلسوں میں بیان ہوتی ہیں؛ بہت اچھی اور دلربا ہوتی ہیں، لیکن ایک لحاظ سے یہ فقط خیالی اور آرمانی ہوتی ہیں جن کا عملی

میدان میں کوئی وجود نہیں ہوتا مثلاً یہ مفروضہ کہ عوام الناس کا کردار اتنا بلند کرنے کے لئے کوشش کی جائے تاکہ پھر وہ قانون کی خلاف ورزی نہ کرے اور پھر ان کو کسی روکنے والے قانون یا حکومت کی ضرورت نہیں ہے اس فرضیہ کا تصور بہت اچھا ہے؛ لیکن عملی میدان میں کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے اور وہ بھی اس حد تک کہ اس کو مجری قانون (حکومت) کی کوئی ضرورت نہ ہو دوسری طرف اس وجہ سے کہ معاشرہ میں ہمیشہ قانون کی خلاف ورزی ہوتی رہی ہے یہ بات بھی قابل قبول نہیں ہے کہ حکومت کی طرف سے اتنی سختی کی جائے کہ پھر کوئی قانون شکنی کی ہمت نہ کر سکے جیسا کہ بعض مارکسسٹ "Marxist"، فاشیسٹ^(۴) "Fasciste" اور پولیس کی حکومتوں میں ہوتا ہے کہ سرکاری قوانین پر شدت کے ساتھ عمل کیا جاتا ہے، اور پولیس اور فوج اس طرح سے مجرموں کے ساتھ برتاؤ کرتی ہے کہ (اس کو دیکھ کر) پھر کوئی قانون شکنی کی ہمت نہیں کرتا جس کا نمونہ ہمارا پڑوسی ملک عراق ہے جس نے ہم کو ۸ سال تک جنگ کرنے پر مجبور کیا کیونکہ اس ملک میں فوجی حکومت ہے جو ہر قسم کی مخالفت اور اعتراض کا گلا گھونٹ دیتی ہے یہاں تک کہ اگر کسی سے کوئی چھوٹی سی بھی حرکت خلاف قانون دکھی گئی تو اس کو عدالت کے فیصلہ کے بغیر ہی گولی مار دی جاتی ہے یا کسی دوسرے طریقہ سے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

معاشرہ کے غریب اور کم درآمد لوگ جس وقت رشوت اور مہنگائی کا بازار گرم دیکھتے ہیں اور ان کے سامنے مشکلیں آتی ہیں تو یہ آرزو کرتے ہیں کہ اے کاش ان رشوت خور اور گران فروش لوگوں سے شدت کے ساتھ برتاؤ کیا جائے اور ان میں سے چند لوگوں کو سزائے موت دیدی جائے تاکہ پھر کوئی رشوت خوری اور گرانفروشی کی جرات نہ کرے!! اس طرح کے واقعات سوسیا لسیٹی ممالک میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن ہمیں اس سلسلہ میں اسلامی نظریہ دیکھنا چاہئے کہ اسلام مجرموں اور خلاف ورزی کرنے والوں سے شدت کے ساتھ برتاؤ کو کیسا سمجھتا ہے؟ کیا اسلامی نظریہ کے تحت مجرموں سے اس قدر شدت کے ساتھ پیش آنا صحیح ہے کہ اس کے بعد کوئی بھی خلاف ورزی کی جرات نہ کرے؟ یا مجرموں کے ساتھ اس قدر شدت نہ کی جائے بلکہ ان کو حتی الامکان آزادی دی جائے حکومت کی دخالت اور قوانین کا لاگو کرنا صرف معاشرہ میں آشوب اور ظلم و ستم سے روک تھام کے لئے ہو۔

قارئین کرام! قرآن کریم اور احادیث شریف سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام کی نظر میں اسلامی حکومت ایک درمیانی اور معتدل راستہ اختیار کرے۔

اسلام کے فوجداری قوانین؛ بعض جرائم، اور بعض عفت کے منافی اعمال پر بھت سخت سزائیں معین ہیں، لیکن اسلام ان جرائم کو ثابت کرنے کے لئے خاص شرائط اور بعض محدودیت کا قائل ہے جن کی وجہ سے صرف کم ہی جرائم عملی میدان میں ثابت ہو سکیں، اور ان قوانین کے نتیجہ میں سخت سزائیں بھت کم ہی موارد (مثلاً سال میں ایک یا دو مورد) میں دی جاتی ہیں۔

مثلاً قرآن مجید میں چور کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جِزَاءً بِمَا كَسَبَا﴾ (۵)

”چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو کہ یہ ان کے لئے بدلہ ہے“

﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ

الْآخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۶)

”زنا کار عورت اور زنا کار مرد دونوں کو سو سو کوڑے لگائیں اور خبردار! دین خدا کے معاملہ میں کسی مروت کا شکار نہ ہو جانا اگر تمہارا ایمان اللہ اور روز آخرت پر ہے اور اس سزا کے وقت مومنین کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہئے۔“

لیکن اس طرف سے اسلام نے زنا کے ثابت ہونے کے شرائط بھت سخت قرار دئے ہیں کیونکہ اسلام کا حکم یہ ہے کہ زنا کرنے والے کو یہ سزا اس وقت دی جاسکتی ہے جبکہ چار شاہد (گواہ) عادل اپنی آنکھوں سے زنا ہوتے دیکھیں اور گواہی دیں، اور سب کے سب گواہی دینے کے لئے عدالت میں حاضر ہوں، اور اگر چاروں عادل گواہی دینے کے لئے عدالت میں حاضر نہ ہوتے تو نہ صرف جرم ثابت نہیں ہوگا بلکہ ان پر ”حدّ قذف“ (۷) جاری ہوگی، کیونکہ ان کی گواہی قابل قبول نہیں ہے اور خود ان کو ایک مومن پر تہمت لگانے کے جرم میں کوڑے لگانے جائیں گے۔

اسی طرح اسلام اجتماعی مسائل میں، حکومت کو معاشرہ کی تمام ہی ضرورتوں کو پورا کرنے یہاں تک کہ غیر ضروری ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتا اور نہ ہی حکومت کو مکمل طریقہ پر دخالت سے روکتا ہے؛ بلکہ حکومت کی دخالت زمان و مکان کے لحاظ سے ہوتی ہے اور معاشرہ کی بعض ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔

کبھی کبھی اس طرح کے حالات پیدا ہوتے ہیں کہ ”جامعہ مدنی“ کی شکل ”مدینۃ النبی“ کی شکل پر ہو جس کی بنیاد یہ ہے کہ جو کام عوام الناس خود انجام دے سکتے ہوں، تو اس میں خود اپنی مرضی سے شرکت کریں مثلاً تعلیم و تربیت، بجلی، پانی وغیرہ جیسی ضرورتوں کا خود انتظام کریں؛ مگر بعض خود غرض اور فرصت طلب افراد ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں اور ان کا لالچ اور دوسروں کے حقوق کو غصب کرنے کی وجہ سے معاشرہ کے غریب طبقہ کو ان کے حقوق سے محرومی کا سبب ہوتا ہو تو اس صورت میں حکومت

کی ذمہ داری یہ ہے کہ خود غرض اور مالدار لوگوں سے مقابلہ کرنے کے لئے اجتماعی میدان میں اترے، اور کمزور لوگوں کے حقوق کا دفاع کرے، یا دوسرے طریقوں سے اپنا کردار نبھائے:

مثلاً اگر پرائیویٹ کمپنی ٹیلیفون خدمات بھت مہنگی کر دے تو پھر حکومت کو اپنی طرف سے جو سستے داموں میں ٹیلیفون خدمات پیش کرے یا خدمات کرنے والے محکموں کو کلی طور پر اپنے ذمہ لے لے۔

۸۔ متحد حکومتوں کے نقائص

قارئین کرام! مذکورہ نظریہ کی بنا پر اسلامی نظریہ کی اصل یہ ہے کہ معاشرہ کی ضرورتیں خود عوام الناس کے ذریعہ پوری ہوں، لیکن اگر خود غرض، فائدہ پرست اور مال و دولت کے لالچی افراد یا اس طرح کے گروہ کی وجہ سے دوسروں کے حقوق ضائع ہو رہے ہوں تو پھر حکومت کو عملی میدان میں اترنا چاہئے، اور مناسب طریقہ کار، زمان و مکان کے لحاظ سے مصلحتوں کی رعایت کرتے ہوئے؛ خلاف ورزیوں سے روک تھام کے لئے ضروری قدم اٹھانے کیونکہ یہی راستہ درمیانی اور معتدل ہے، کیونکہ عملی طریقہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ معاشرہ کی تمام فعالیتوں کو حکومت کے ذمہ قرار دینا؛ بھت سی دلیلوں کی بنا پر صحیح اور مفید نہیں ہے مثلاً اگر حکومت؛ معاشرہ کی تمام ہی ضرورتوں کو پورا کرنا چاہے تو پھر اس کو بھت بڑے سسٹم کی ضرورت ہے اور تقریباً (بیس فی صد) لوگوں کو سرکاری نوکریاں دینی پڑیں گی اور اس طرح کے طریقہ کار پر تین اشکال ہوتے ہیں:

پہلا اشکال:

اگر تمام ہی کام سرکاری طریقہ سے انجام دئے جائیں تو پھر حکومت کو ایک بھت بڑے خرچ کی ضرورت ہے نیز معاشرہ کے لئے بھی بھت سی مشکلات پیش آسکتی ہیں۔

دوسرا اشکال:

(یہ اہم اشکال ہے) جس وقت اس طرح کا بھت بڑا سسٹم بنے تو اس کے درمیان خلاف ورزی بھی زیادہ ہوگی، جس وقت کم، محدود اور بہترین افراد پر یہ سسٹم مشتمل ہو تو اس میں خلاف ورزی بھی کم اور بھت معمولی ہوگی، لیکن اگر ایک عظیم سسٹم بنایا گیا اور تمام امور میں دخالت کرنے کا حق اس کو ہو گیا تو پھر اس میں خلاف ورزی اور ناجائز فائدہ اٹھانے کے امکانات بھی زیادہ ہو جائیں گے مثال کے طور پر اگر حکومت مہنگائی روکنے کے لئے کوئی ادارہ بنائے جو دکانوں پر جا کر اس سلسلہ میں رپورٹ تیار کر کے حکومت تک پہنچائے لیکن اگر ہر دکان کے لئے ایک معائنہ کرنے والا معین کرے تو پھر آپ اندازہ لگائیں کہ کتنے لوگوں کو

نوکری دینی ہوگی، اس کے علاوہ ان کے درمیان بھی خلاف ورزی زیادہ ہوں گی، اور ان میں سے بھت سے لوگ دکانداروں سے رشوت لیں گے تاکہ ان کے خلاف رپورٹ نہ بھیجیں جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت کو ان معائنہ کاروں پر ایک اور ادارہ بنانے کی ضرورت ہوگی۔

جبکہ تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس طرح کی منصوبہ بندی کامیاب نہیں ہوتی ہے اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوا ہے بلکہ خلاف ورزیوں اور رشوت خوری میں اضافہ ہوا ہے۔

تیسرا اشکال:

یہ اشکال (بھی) اسلام کی نظر سے اہم ہے، کیونکہ اسلام اس لئے آیا ہے کہ عوام الناس اپنی مرضی اور اختیار سے خود سازی اور نیک کام میں رغبت حاصل کریں، طاقت کے بل بوتے پر نہیں کیونکہ انسان کا کام اس وقت با اہمیت ہوتا ہے جب وہ اپنی مرضی اور اختیار سے انجام دے، لیکن اگر کسی کام کو مجبوری میں انجام دیا ہے تو پھر اس کام پر وہ معنوی اثر نہیں ہوگا جو اسلام چاہتا ہے اور اصلی مقصد پورا نہیں ہوگا۔

حوالے

(۱) ٹونالیٹر اس حکومت کو کھتے ہیں جو ایک گروہ کے نفع میں قوانین بنائے اور اپنے مخالفین کو مخفی پولیس وغیرہ کے ذریعہ نابود کرنے کی درپے ہو، (مترجم)

(۲) وہ مادی فلسفہ جو معنویات کا منکر ہے اور صرف مادہ کو پہنچاتے ہیں نیز خلقت کائنات کو مادہ کے اجزاء کی حرکت سے جانتے ہیں، (مترجم)

(۳) وہ چند متحد ملک جن کی سیاسی روش ایک ہو (مترجم)

(۴) ظالمانہ طریقہ حکومت، جو پہلی عالمی جنگ کے بعد اٹلی میں رائج تھا لیکن آج کل ڈکٹیٹر شپ "Dictatorship" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، (مترجم)

(۵) سورہ مائدہ آیت ۳۸

(۶) یسورہ نور آیت ۲

(۷) "حد قذف" زنا کی تھمت لگانے والے پر ۸۰ کوڑے لگائے جاتے ہیں، جس کی صراحت سورہ نور کی آیت نمبر ۴ میں وارد ہوئی ہے (مترجم)

اٹھائیسواں جلسہ

اسلامی حکومت اور جائز آزادی اور اقدار کی رعایت کرنا

۱۔ حکومت کی ضرورت پر ایک اشارہ

گذشتہ جلسوں میں توہ مجریہ (حکومت) کے فلسفہ پر گفتگو ہوئی، تاکہ اس کے سمجھنے کے بعد یہ معلوم ہو جائے کہ حکومت کے وظائف اور کیا کیا شرائط ہیں، اور اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لئے کیا شرائط ہونے ضروری ہیں؟ اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا حکومت کے فرائض میں سے ایک فریضہ قوانین کو جاری کرنے کی ضمانت ہے، جو دنیا بھر کی تمام حکومتوں میں مقبول ہے، اسی طرح اسلامی حکومت میں بھی جس میں قوانین یا تو براہ راست شریعت مقدسہ سے لئے جاتے ہیں یا وہ قوانین ان افراد کے ذریعہ مرتب ہوتے ہیں جن کو شریعت کی طرف سے اجازت حاصل ہوتی ہے، لہذا قوانین کو جاری ہونا چاہئے پہلے درجہ میں خود عوام الناس کو قوانین پر عمل کرنا چاہئے اور ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت اور اپنے وظائف پر عمل کرنا چاہئے، نیز معاشرتی، گھریلو اور بین الاقوامی روابط؛ اسلامی قوانین کے تحت ہونے چاہئیں۔

اپنے وظائف کو انجام دینے اور اجتماعی قوانین پر عمل پیرا ہونے کے لئے ایک مصمم ارادہ ہونا چاہئے، کیونکہ عوام الناس پہلے اپنے ذاتی مفاد کے بارے میں سوچتے ہیں اور اجتماعی امور کے بارے میں کم ہی فکر کرتے ہیں، خصوصاً اس وقت جبکہ اجتماعی امور انجام دینے میں ان کا کوئی خرچ یا نقصان ہو، اس صورت میں ان کے درمیان بھت کم رجحان پایا جاتا ہے، مگر وہ افراد جو بہترین تربیت یافتہ ہوں اور معاشرہ کے فوائد کو اپنے مفاد پر ترجیح دیتے ہوں اس بنا پر اجتماعی امور میں اکثر خلاف ورزی اسی بنیاد پر ہوتی ہے کہ عوام الناس میں اجتماعی ذمہ داریوں کا زیادہ احساس نہیں پایا جاتا، اسی وجہ سے کچھ لوگوں کا ان قوانین کو جاری کرنے کی ضمانت اپنے ذمہ لینا ضروری ہے تاکہ عوام الناس کو اجتماعی قوانین پر عمل کرنے کے لئے آمادہ کریں، اور مخالفت کرنے کی صورت میں ان کو سزا بھی دلائیں۔

لہذا ایسی حکومت کا ہونا ضروری ہے جو (ضرورت کے وقت) اپنی طاقت کے ذریعہ ان قوانین پر عمل کرائے، اور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا کہ ہر معاشرہ میں شروع ہی سے اس کی ضرورت کے تحت قوانین بنائے جاتے ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص کسی کے مال کو غصب کرنا چاہے تو اس کی سزا معین کی جاتی ہے تو اگر کسی نے اس قانون پر عمل نہ کیا اور دوسرے کے مال پر ہاتھ بڑھایا تو قانون کے رکھوالے اس کو سزا دیتے ہیں بعض حالات میں بات واضح نہیں ہوتی جس کے نتیجہ میں اختلاف اور کشمکش پیدا ہوتی ہے یہاں تک کہ بعض موقع پر ایسے حالات بن جاتے ہیں کہ طرفین میں سے کوئی ایک بھی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہتا لیکن چونکہ حق (بات) ظاہر نہیں ہے لہذا اپنے وظیفہ کو معین کرنے میں غلطی کر جاتے ہیں، ایسے ہی حالات کے لئے ”توہ قضائیہ“

(عدالت) کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے تاکہ وہ قوانین کو ان کے مصداق پر منطبق (ٹیلی) کرے اور یہ طے کرے کہ کون حق پر ہے؟ اور اگر عدالت کی طرف سے فیصلہ ہونے کے بعد طرفین میں پھر بھی اختلاف باقی رہا اور اس فیصلہ کو نہ مانا تو اس موقع پر پولیس کے ذریعہ اس فیصلہ کو منوایا جاتا ہے لہذا یہ (بھی) طے ہو گیا کہ عدالت کا ہونا بھی ضروری ہے، البتہ ہمارے بیان کے مطابق عدالت کو قوہ مجریہ کے تحت ہونا چاہئے، لیکن بھت سے سیاسی فلاسفہ کے نزدیک قوہ قضائہ کو حکومت اور پارلیمنٹ سے مستقل ہونا چاہئے۔

اس تقسیم کے تحت پارلیمنٹ کا کام قوانین بنانا، افراد کے حقوق کو معین کرنا اور خلاف ورزی کرنے والوں کی سزا معین کرنا ہے، مثال کے طور پر پارلیمنٹ کے ذریعہ قانون معین کیا جاتا ہے کہ فلاں خرید و فروخت صحیح ہے یا باطل ہے، اس کے بعد مقرر شدہ قوانین کے تحت معاملہ ہوتا ہے لیکن اگر اس قانون کے منطبق کرنے میں شک ہو جائے اور معلوم نہ ہو سکے کہ معاملہ صحیح ہے تاکہ لین دین ہو سکے، یا باطل ہے؛ المختصر یہ کہ طرفین کے درمیان اختلاف ہو جائے تو اس صورت میں عدالت جانا ہوگا اور چونکہ عدالت کی ذمہ داری کلی قوانین کو ان کے مصداق پر منطبق کرنا ہے اور قاضی کے فیصلہ کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ مثلاً زید، خالد کو فلاں مقدار میں مال دے، تو اگر طرفین نے یہ فیصلہ مان لیا ہے اور قانون کے مطابق عمل کیا تو ان کے درمیان معاملہ ختم ہو جائے گا، ورنہ حکومت کو درمیان میں آنا ہوگا اور پولیس کے ذریعہ زید سے مال لے کر صاحب حق (خالد) کو دینا ہوگا۔

ہم نے عرض کیا کہ حکومت کے اصل وظائف میں سے ایک وظیفہ اجتماعی قوانین اور احکام کو جاری کرنے کی ضمانت ہے، لیکن اس بات پر بھی توجہ رہے کہ قوانین جاری کرنا فقط حکومت میں منحصر نہیں ہے بلکہ دوسروں (عوام الناس) کو بھی قوانین جاری کرنے چاہئیں، جس طرح سے حکومت کی ذمہ داری صرف قوانین کو جاری کرنا نہیں ہے بلکہ وہ بعض مواقع پر قوانین بھی بنا سکتی ہے جیسا کہ ”تفلیک قواہ“ (تینوں قدرتوں کا مستقل ہونا) کی بحث میں بیان کریں گے، کیونکہ قانون گذاری اور قوانین کو جاری کرنے میں جدائی ممکن نہیں ہے اور ان کے درمیان رابطہ دنیا کی تمام ہی حکومتوں میں مقبول ہے، یعنی درحالیہ حکومت کا کام قوانین کا جاری کرنا ہے لیکن بعض مواقع پر قوانین اور مقررات بھی بنانے ہوتے ہیں دوسری طرف پارلیمنٹ بھی بعض اجرائی کاموں میں دخالت کرتا ہے اور بعض موارد میں بعض اجرائی امور پارلیمنٹ میں طے پاتے ہیں؛ مثال کے طور پر تیل وغیرہ کے سلسلے میں دوسری حکومتوں اور بیرونی کمپنیوں سے معاملہ کرنا جبکہ معاملہ کرنا ایک اجرائی کام ہے، لیکن بغیر پارلیمنٹ کے طے کرنا ممکن ہے لہذا ان قدرتوں کے درمیان کوئی سرخ خط (لائن) نہیں ہے، جس سے ایک دوسرے کے کاموں میں بالکل دخالت نہ کر سکے، نہ حکومت قوانین بنانے کی قدرت رکھتی ہو اور نہ پارلیمنٹ اجرائی امور میں دخالت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، بھر حال یہ قدرتیں اپنے مخصوص مختلف کام رکھتی ہیں۔

اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ مذکورہ ٹکوئی تقسیم (قوہ مجریہ، قوہ قضائیه اور پارلیمنٹ) دنیا کی تمام ہی حکومتوں میں مقبول ہے، لیکن اسلامی حکومت قانون گذاری کے سلسلہ میں دوسری حکومتوں سے مختلف ہے: لائیک حکومتوں میں قانون گذاری کا معیار لوگوں کے دنیاوی اور اجتماعی امور ہوتے ہیں، لہذا قانون کو طے کرنے کے علاوہ ان کو جاری کرنے کا سلیقہ بھی اسی لحاظ سے ہوتا ہے لیکن اسلامی نقطہ نظر سے قانون گذاری میں دنیاوی امور کے علاوہ اُخروی اور معنوی مصلح کو بھی نظر میں رکھا جاتا ہے، بلکہ قوانین مرتب کرتے وقت معنوی مصلح کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اسلامی حکومت اور سیکولر اور لائیک حکومتوں میں یہی بنیادی اور اصل فرق ہے اور ظاہر سی بات ہے کہ ایسی (اسلامی) حکومت کی ذمہ داری بھی دوسری حکومتوں کے نسبت زیادہ ہوتی ہے؛ یعنی (اسلامی) حکومت لوگوں کو اجتماعی امور کی رعایت کرنے اور ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنے سے روکنے نیز ہرج و مرج (بد امنی) سے روک تھام کے علاوہ اسلامی اقدار کی بھی رعایت کرے اور ان کو جامہ عمل پہنائے۔

۲۔ انسانی کردار میں اصل اولیٰ

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ انسان کی مہم اور برجستہ صفات میں سے انتخاب اور اختیار کی قوت ہے، اسی وجہ سے انسان؛ حیوانات اور فرشتوں سے فرق رکھتا ہے؛ کیونکہ حیوانات کے کام ان کی شہوت کے تحت ہوتے ہیں جن میں انتخاب کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی اور اگر اتفاقی طور پر انتخاب ہوتا بھی ہے تو وہ بھی شہوت کی وجہ سے ہوتا ہے یعنی ان کا انتخاب عقل و فکر کی بنیاد پر نہیں ہوتا اگر ہم دیکھتے ہیں کہ کسی حیوان کی تربیت کے ذریعہ اس کو بعض چیزیں سکھادی جاتی ہیں اور وہ اپنے مالک (مربی) کے اشارہ کے مطابق کام کرتا ہے یا کسی گھوڑے کی ایسی تربیت کی جاتی ہے جس سے وہ مالک کے بتائے ہوئے راستہ پر ہی چلتا ہے؛ تو اگرچہ یہاں پر (حیوان کی طرف سے) انتخاب ہوتا ہے لیکن یہ انتخاب بھی غرائز اور شہوات کی بنا پر ہوتا ہے۔

لیکن فرشتوں میں ملکوتی اور آسمانی صفات ہوتے ہیں، ان میں گناہ و معصیت اور حق کی خلاف ورزی کا مادہ نہیں پایا جاتا ان کا شمار مقدرین اور مقربین میں ہوتا ہے ان کا مقام؛ عالی اور پاک و پاکیزہ ہوتا ہے، لیکن ان میں بھی انتخاب کا مادہ نہیں ہوتا، حقیقت میں ان کے اندر عبادت اور خداوند عالم کی بے چون و چرا اطاعت کا مادہ پایا جاتا ہے لیکن یہ انسان، خلیفہ خدا اور امانت الہی کا حامل ایک الگ ہی مخلوق ہے اس کے سامنے ہمیشہ دو راستے اور دو جذبے سامنے رہتے ہیں ایک خدا کی طرف اور دوسرا شیطان کی طرف ان میں سے ایک راستہ کو انتخاب کرنے کی صلاحیت اس میں ہونا چاہئے، ورنہ اگر اس سے انتخاب کی قدرت سلب کر لی جائے اور مجبوراً کسی ایک راستہ پر لگا دیا جائے تو اس میں انسانی خصوصیات اور امتیازات ختم ہو جائیں گے۔

لہذا انسانی کردار اور اس کی تربیت میں چاہے وہ انفرادی مسائل میں ہو یا گھریلو مسائل میں اور چاہے اجتماعی اور بین الاقوامی مسائل ہوں سبھی میں اس کے لئے انتخاب کی راہ ہموار ہونا چاہئے تاکہ اپنے انتخاب کے ذریعہ صحیح راستہ کو اپنائے؛ نہ یہ کہ اس پر کوئی راستہ تھوپ دیا جائے لیکن کبھی کبھی اجتماعی مسائل انسان پر سختی کا تقاضا کرتے ہیں درحقیقت قوہ مجریہ اور حکومت ایک ثانوی مصلح کی بنا پر ہے نہ اصل اولیٰ کی بنا پر، یعنی اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ معاشرہ کے لئے ایک حکومت کا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ قوانین کو نافذ کرے یہاں تک کہ بعض حالات میں حکومت اپنی قدرت کے بل بوتے پر مجرموں کو بھی قوانین کی رعایت کرنے پر مجبور کرے، یہ اصل اولیٰ کے برخلاف ہے کیونکہ اصلی اولیٰ یہ ہے کہ قانون عوام الناس کے اختیار میں ہو وہ اپنی مرضی اور اپنے ارادے سے اس پر عمل کریں اور کوئی (بھی) اس کی مخالفت نہ کرے، کوئی شخص بھی ایک دوسرے پر ظلم نہ کرے، رشوت نہ لے، چوری نہ کرے اور لوگوں کی جان و مال پر ہاتھ نہ بڑھائے لیکن اگر دیکھنے میں یہ آئے کہ ہمیشہ معاشرہ میں اس طرح کی خلاف ورزی ہوتی رہی ہیں، تو اس صورت میں پولیس کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ قانون کی خلاف ورزی ہونے سے روک تھام کرے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو پھر پوری دنیا میں تباہی اور فساد پھیل جائے گا اور جو افراد صحیح راستہ پر چلنا (بھی) چاہتے ہیں ان کے لئے راستہ بند ہو جائے گا۔

لہذا معاشرہ کی اکثریت کے لئے صحیح راستہ کے انتخاب کی راہ ہموار رہنے کے لئے جراثیم پیشہ اور خلاف ورزی کرنے والوں کی روک تھام ضروری ہے اور ضرورت کے تحت ان کو سزا بھی دینا ہوگی تاکہ ترقی اور پیشرفت کا موقع فراہم رہے، ورنہ بعض جسمانی یا علمی قدرت اپنی شیطانی چالوں کی بنا پر معاشرہ کے مصلح کو خطرہ میں ڈال دیں گے جس سے انسان کو پیدا کرنے کا الہی مقصد پامال ہو جائے گا۔

یہ بات بجا ہے کہ انسان کو آزادی اور اختیار کی بنا پر صحیح راستہ کا انتخاب کرنا چاہئے لیکن یہ آزادی نامحدود نہیں ہے اور دوسروں کو اتنا اختیار نہیں دینا چاہئے تاکہ وہ دوسروں کے انتخاب کا راستہ ہی بند کر دیں، اور قرآنی اصطلاح کے مطابق دوسروں کو خدائی راستہ پر چلنے سے روک دیں۔^(۱)

لہذا طے یہ ہوا کہ خلاف ورزی کرنے والوں کا سدباب کیا جائے تاکہ وہ مومنین کو خدا کے راستہ پر چلنے سے نہ روکیں، لیکن اس بات پر بھی توجہ رہے کہ خلاف ورزی کی روک تھام اور قوانین کو جاری کرنے کے لئے حکومت کے زور اور طاقت کا استعمال بھی خاص قوانین کے تحت اور بھت ہی ظرافت اور باریکی کے ساتھ ہونا چاہئے جن مواقع پر اسلام معاشرہ کے فوائد کے پیش نظر طاقت اور زور کے استعمال کی اجازت دیتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ اس بات کا دھیان بھی رکھتا ہے کہ اس وقت بھی انتخاب کی راہ مسدود نہ ہونے پائے، خلاف ورزی کرنے والے کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا رہے مگر جرم اتنا خطرناک ہو کہ معاشرہ کے مصلح و فوائد کی حفاظت کرنے اور معاشرہ میں فساد و تباہی سے روک تھام کی غرض سے مجرم کو سزائے موت دینا پڑے۔

۳۔ سزا دینے کے سلسلہ میں اسلام کا تربیتی پہلو

اسلام نے بعض جرائم کے لئے بھت سخت سزا معین کی ہیں، لیکن ان کو ثابت کرنے کے بھی سخت طریقہ پیش کئے ہیں جن سے جرم کا ثابت کرنا بھت مشکل ہوتا ہے دوسری طرف اگر کوئی خطرناک جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے لئے سزا بھی ایسی ہی سخت معین کی ہے تاکہ دوسروں کے لئے بھی عبرت ہو اور وہ اس کو دیکھ کر اس طرح کے جرائم کا ارتکاب نہ کریں کیونکہ سزا کے فلسفہ میں ایک حکمت یہ ہے کہ لوگ اس سزا کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں جس کے نتیجے میں جرائم کم سے کم ہوں لہذا اس مقصد تک پہنچنے کے لئے جرم کے لحاظ سے سزا بھی ہونا چاہئے اور خطرناک جرائم کے لئے سزا بھی سخت سے سخت ہونا چاہئے، مثال کے طور پر چوری کے لئے کم سزا معین کی جائے مثلاً ایک مقدار جرمانہ یا کم مدت کے لئے قید، اس طرح جو لوگ چوری کرتے ہیں ان کے لئے وہ سزا (ایک حد تک) آسان ہو، تو اس صورت میں معاشرہ میں ہونے والی چوریوں کو نہیں روکا جاسکتا، جس کے نتیجے میں خداوند عالم نے سزا کی جو حکمت رکھی ہے وہ پوری نہیں ہوگی۔

لیکن اگر جرائم ثابت کرنا آسان ہو جائے اور لوگوں کو آسانی سے سزا ہو جایا کرے تو پھر معاشرہ میں سزا زیادہ ہو جائے گی کیونکہ بھت سے لوگ جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں، جس کے نتیجے میں بھت سے خاندان کی حیثیت اور آبرو خاک میں مل جائے گی، اسی وجہ سے اسلام نے جرم کو ثابت کرنے کے طریقوں کو سخت قرار دیا ہے مثلاً زنا کے سلسلہ میں اسلامی سزا سخت ہے یہاں تک کہ اسلام نے حکم دیا ہے کہ زنا کار مرد اور عورت کو عوام الناس کے سامنے سزا دی جائے اور انسانی احساسات اور ہمدردی ”حدود الہمی“ (اسلامی سزا) کے آڑے نہ آئیں معاشرہ سے اخلاقی برائیوں کو دور کرنے کے لئے زنا کی سزا عوام الناس کے سامنے دی جائے، ایسا نہ ہو کہ کسی مسلمان کی عزت و آبرو کے خیال سے اس کو چھوڑ دیا جائے لیکن دوسری طرف سے جرم کو ثابت کرنے طریقے ایسے سخت قرار دئے ہیں تاکہ کم ہی لوگوں کے جرم ثابت ہوں، اور کم ہی افراد سزائے اعمال تک پہنچ پائیں۔

زنا کے سلسلہ میں اسلام کا حکم یہ ہے کہ چار عادل افراد گواہی دیں کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے ان کو زنا کرتے دیکھا ہے، یہاں تک کہ اگر تین افراد گواہی دیں اور چوتھا آدمی گواہی کے لئے نہ ہو تو ملزم کو بری کر دیا جائے گا اور قاضی ان تینوں کو سزا دے گا اور ان پر ”حد قذف“ (۲) جاری ہوگی۔

اسلامی احکام میں اس طرح کی ظرافت، باریکی اور دقت خصوصاً سزا کے سلسلہ میں اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ اسلام کا مقصد بلند و عالی اہداف کو جامہ عمل پہنانا اور عالی ترین اقدار کی رعایت کرنا ہے نیز معاشرہ کی حقیقتوں کی رعایت کرنا بھی ہے، اور صرف خیالی اور تصوراتی چیزوں پر اکتفاء نہیں کرتا درحقیقت معاشرہ کی ترقی کے لئے اسلامی طریقہ کار وہی ہے جس کو اسلام نے معین کیا ہے اور وہ ”آرمان گرانی“ (خیالی اور تصوراتی دنیا) اور ”واقع گرانی“ (حقیقت) کا درمیان راستہ ہے جس میں دونوں چیز

شامل ہیں اسلام بلند اقدار کی رعایت ضروری مانتا ہے اور اس معاشرے کے اقدار کو خطرہ میں پڑ جانے کی اجازت نہیں دیتا؛ جیسا غیر اسلامی معاشرہ میں کیا کیا فسادات نظر نہیں آتے جس سے بھت زیادہ فساد اور بھت سی رسوائی سامنے آتی ہیں لہذا اسلامی معاشرہ کو ان برائیوں سے دور رکھنے کے لئے مجرموں کے لئے سخت سزا مقرر کی گئیں ہیں، دوسری طرف اسلام واقع گرا ہے اور یہ جانتا ہے کہ معاشرہ میں بعض لوگوں سے جرائم ہوں گے اسی وجہ سے حتی الامکان ان جرائم کو ثابت نہ ہونے کے لئے سخت طریقہ کار مقرر کئے ہیں الغرض قانون جاری ہونا چاہئے اور ان کو جاری کرنے والا ضامن ہونا چاہئے تاکہ اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے تو طاقت کے ذریعہ اس کو جاری کیا جاسکے، اس کے علاوہ انسانی خلقت کے اغراض و مقاصد کی بھی رعایت ہونا چاہئے اور وہ یہ ہیں کہ انسان کا کردار اختیاری اور اپنی مرضی سے ہو، دوسری طرف معاشرہ کے امور پر توجہ ہونا چاہئے تاکہ بے لگام آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے معاشرہ کے مصالح کو خطرہ میں نہ ڈال دیا جائے۔

۳۔ حکومت کے مخصوص ثابت اور متغیر کام

جس وقت ہم قوانین کو دیکھتے ہیں تو ان میں بھت سے قوانین عوام الناس سے متعلق ہوتے ہیں جن پر عمل کرنا عوام کی ذمہ داری ہوتی ہے اور ان میں حکومت کا کام صرف کنٹرول کرنا، لوگوں کے قوانین کا لحاظ رکھنے کے سلسلہ میں منصوبہ بندی تیار کرنا اور خلاف ورزی سے روک تھام کرنا ہوتا ہے لیکن بعض قوانین خود حکومت سے متعلق ہوتے ہیں، اور خود حکومت کو ان پر عمل کرنا ہوتا ہے بلکہ عوام الناس ان پر عمل کرتی ہے کیونکہ قوانین کا یہ حصہ شہریوں کی ضرورتوں اور اقتصادی، سرمایہ گذاری اور خدمات سے متعلق ہوتا ہے جس کو عوام الناس انجام نہیں دے سکتی، اور عوام الناس ان کو انجام دینے کی قدرت نہیں رکھتے یا اگر قدرت رکھتے ہیں لیکن پھر بھی رضا کارانہ طور پر کوئی ان کو انجام نہیں دیتا، جن کے انجام نہ پانے سے معاشرہ کو نقصان کا سامنا کرنا ہوتا ہے؛ لہذا اس بات ایک منظم تنظیم اور ہم اہنگ کمیٹی بنام حکومت کو اس کام کی ذمہ دارہ سنبھالنے کی ضرورت ہے مثال کے طور پر بیرونی دشمن کے مقابلہ میں ملک کا دفاع کرنا، جنگ کرنا اور اس سلسلہ میں اسلحہ وغیرہ فراہم کرنا، یا پھیلنے والی خطرناک بیماریوں جیسے فلج اطفال (بچوں کا فلج) کے لئے "واکسیناسین" "vaccination" لگانا جو پورے ملک میں ایک معین دن صرف حکومتی پیمانہ پر ہی ممکن ہو سکتا ہے، اسی طرح عام صفائی یا بیماریوں کے لئے ہاسپٹل وغیرہ کا انتظام کرنا، یا ایفون وغیرہ جیسی نشہ آور چیزوں سے مقابلہ اور ان کے آنے جانے کے راستوں کو بند کرنا، اگرچہ عوام الناس بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ تا حد امکان لوگوں کو اس کام سے روک سکتے ہیں لیکن وسیع پیمانہ پر اس عظیم برائی کی روک تھام کرنا عوام الناس کے بس کی بات نہیں ہے، اسی طرح ان برائیوں کا مقابلہ جو معاشرہ میں کافی پھیل چکی ہیں وغیرہ وغیرہ یہ سب کام حکومت ہی کر سکتی ہے۔

قوانین کی تیسری قسم (عوام الناس) کی ضرورتیں ہیں جن کو خود عوام الناس بھی اور حکومت بھی انجام دے سکتی ہے لیکن زمانہ کے لحاظ سے ان اجتماعی امور کو انجام دینے کا طریقہ کار مختلف ہو جاتا ہے کیونکہ معاشرہ کے بھت سے امور مختلف زمانوں میں محدود طریقہ پر خود عوام الناس کے ذریعہ انجام پاتے رہے ہیں، لیکن آج کل کے لحاظ سے ان کو انجام دینے کی قدرت عوام الناس میں نہیں ہے اور اگر یہ ذمہ داریاں عوام الناس کے سپرد کر دی جائیں تو پھر وہ پوری نہیں ہو پائیں گی، جس کے نتیجہ میں معاشرہ کے مصالح پورے نہیں ہونگے؛ اسی وجہ سے حکومت کو اس سلسلہ میں قدم اٹھانا ضروری ہوتا ہے جیسے بچوں کا تعلیمی سلسلہ، اگرچہ بچوں کی تعلیم خود والدین کی ذمہ داری ہوتی ہے لیکن آج کل کے حالات اس طرح کے ہیں کہ اگر ملک میں تعلیمی ادارے نہ ہوں تعلیم سے متعلق قوانین الزامی اور ضروری نہ ہوں اور مذکورہ ادارے اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داری نہ نبھائیں تو پھر تعلیمی ترقی رک جائے گی اور جھل و نادانی کا رواج بڑھتا چلا جائے گا۔

اسی طرح آج کل کے ترقی یافتہ دور میں عام صفائی اور عام روشنی کا مسئلہ ہے اور یہ بھی حکومت کی ذمہ داری ہے، جب کہ گذشتہ زمانے میں حکومتوں کی یہ ذمہ داری نہیں ہوتی تھی اور بھت سی چیزوں کا تو بالکل وجود ہی نہیں تھا جیسے محکمہ ٹیلوینز، لہذا یہ بات مسلم ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں حکومت کی بعض نئی ذمہ داریاں پیدا ہو گئی ہیں اور وہ ذمہ داریاں جن کو خود عوام الناس بھی انجام دی سکتی ہے لیکن چونکہ کوئی رضا کارانہ طور پر تیار نہیں ہوتا اور اگر حکومت بھی ان ذمہ داریوں کو انجام نہ دے تو پھر معاشرہ کا برا حال ہو جائے گا، جس کے نتیجے میں اسلامی معاشرہ علم، ٹکنالوجی اور صنعت میں پیچھے رہ جائے گا، اور اس کے علمی اور معنوی مصالح پورے نہیں ہو پائیں گے، کیونکہ معنوی ترقی اور کمال؛ علم ہی کے زیر سایہ ہوتا ہے، معاشرہ میں علم ہی نہ ہو تو اس میں معنوی ترقی نہیں ہو سکتی۔

قارئین کرام! ہماری بیان شدہ باتوں کے ذریعہ حکومت کی اہمیت، اس کا ثابت ڈھانچہ اور اس کے ارکان واضح ہو جاتے ہیں، حکومت کے مقومات اور اس کے عناصر کے نہ ہونے پر حکومت کھوکھلی ہو جاتی ہے، اور وہ عناصر درج ذیل ہیں:

- ۱۔ قوانین مدنی (شہری قوانین) اور معاشرہ کے حقوقی قوانین کو جاری کرنے کی ضمانت، تاکہ اگر کوئی مخالفت کرے تو حکومت اپنی طاقت کے ذریعہ عوام الناس کو ان پر عمل کرنے پر مجبور کرے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دے۔
- ۲۔ معاشرہ میں ہمیشہ ضروری ثابت مصالح کو پورا کرنا، جن مصالح میں زمان و مکان کے بدلنے سے تبدیلی نہیں آتی، اور ان کو وسیع پیمانے پر صرف حکومت ہی انجام دے سکتی ہے مثلاً معاشرہ میں امن و امان کا برقرار کرنا حکومت کی ہمیشگی ذمہ داری ہوتی ہے، چاہے اس ملک کے عوام کی تعداد لاکھوں، کروڑوں اور اربوں ہی کیوں نہ ہو؟۔

لیکن وہ متغیر مصالح جو ہمیشہ حکومت کے ذمہ نہیں ہوتے اور اگر حکومت ان کاموں کو انجام نہ دے تو خود عوام الناس ان کو انجام دے سکتے ہیں لیکن آج کل کے نئے حالات ان ذمہ داریوں کو حکومت کے کاندھے پر رکھ دیتے ہیں، نیز نئی پیش آنے والی ضرورتیں حکومت کے مقومات میں قرار نہیں پاتیں۔

۵۔ قوانین جاری کرنے کے طریقہ کار میں اسلامی اور غیر اسلامی حکومتوں میں فرق

اب جبکہ حکومت کی اہمیت اور اس کے وظائف معلوم ہو گئے ہیں، تو اسلامی حکومت اور دوسری حکومتوں کا فرق مختصر طور پر بیان کرنا مناسب ہے: اسلامی حکومت قوانین کے سلسلہ میں سیکولر اور لائیک حکومت سے بھت زیادہ فرق رکھتی ہے اور اسلامی حکومت کا دائرہ دوسری حکومتوں سے وسیع تر ہے؛ کیونکہ اسلامی حکومت میں معنوی اور روحانی مصالح کو بھی اہمیت دی جاتی ہے، اسی طرح قوانین جاری کرنے کا طریقہ کار بھی دوسری حکومتوں سے مختلف ہوتا ہے مثال کے طور پر دنیا کی تمام حکومتیں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں درآمد کی محتاج ہوتی ہے جس کا ایک حصہ ٹیکس وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے اسلامی حکومت بھی ولی فقہ کی اجازت سے لوگوں سے ٹیکس حاصل کرنے کے لئے قوانین مرتب کرتی ہے اور ان کو نافذ کرتی ہے چنانچہ ٹیکس کے سلسلہ میں بھی اسلامی حکومت دوسری حکومتوں سے فرق رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام؛ مالیات اور ٹیکس وغیرہ کے سلسلہ میں بھی انسانی وجود کے فلسفہ کو پیش نظر رکھتا ہے۔

یعنی اسلام اس بات پر زیادہ زور دیتا ہے کہ انسانی کام اور اس کی کارکردگی اپنے انتخاب اور مرضی سے ہوں جن کے سبب اس کی معنویات میں اضافہ ہو مالیات وصول کرنے میں حکومت اپنی قدرت بھی استعمال کر سکتی ہے اور لوگوں کو ٹیکس دینے پر مجبور کر سکتی ہے اور ترقی یافتہ ممالک میں تاکہ لوگوں کے ذہن پر ٹیکس وغیرہ گراں نہ گزرے اس لئے مختلف طریقے اپنائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کے اعتراضات وغیرہ کم ہو جاتے ہیں جن میں ایک طریقہ یہ ہے کہ روزانہ کا وہ سامان جو عوام الناس ہر روز خریدتی ہے اسی میں ٹیکس رکھا جاتا ہے، اور عوام الناس اشیاء کی قیمت کے علاوہ ایک مقدار ٹیکس بھی حکومت کو ادا کرتی ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ (مذکورہ طریقہ پر) ٹیکس ادا کرنے سے کسی کو کوئی ثواب اور جزا نہیں ملتی؛ لیکن اسلام اس موقع پر بھی انسان کے معنوی کمال کو مد نظر رکھتا ہے اسی وجہ سے لوگوں کو مالیات دینے پر مجبور نہیں کیا ہے اور خمس جیسے اسلامی ٹیکس کو جمع کرنے کے لئے کسی نمائندہ کو نہیں بھیجتا (جیسا کہ شیعہ فقہ میں ذکر ہوا ہے کہ اسلامی حکومت خمس کو زبردستی نہیں لیتی خصوصاً ”ارباح مکاسب“ (تجارت وغیرہ کی آمدنی) کا، ان چیزوں میں اگرچہ خمس واجب ہو چکا ہے لیکن خود مومنین اپنی مرضی اور رغبت سے اپنے سال کا حساب کر کے خمس نکالیں) اسی طرح زکوٰۃ میں اگرچہ اسلامی حکومت زکوٰۃ کو جمع کرنے کے لئے اپنا نمائندہ بھیجتی ہے، لیکن اس میں بھی لوگوں کی آزادی کا خیال رکھا جاتا ہے اسی وجہ سے جب زکوٰۃ جمع کرنے والے افراد مومنین کے پاس پہنچتے

ہیں تو زکوٰۃ کی مقدار کو خود معین نہیں کرتے بلکہ خود مومنین حاصل شدہ جنس کی مقدار بیان کرتے ہیں تاکہ اس کی زکوٰۃ کا حساب کر کے، اور اس کو جمع کیا جاسکے یہاں پر (بھی) حقیقت حال جاننے کے لئے زکوٰۃ دینے والے کو مجبور نہیں کیا جاتا کہ زکوٰۃ دینے والا سچ کھ رہا ہے یا جھوٹ بول رہا ہے، مگر جبکہ اس کا جھوٹ واضح ہو رہا ہو اور اسلامی حکومت کا نقصان ہو رہا ہو، یا ان افراد کے لئے جو علی الاعلان کہتے ہیں کہ ہم زکوٰۃ نہیں دیں گے، چنانچہ ان مواقع پر اسلامی حکومت اپنے طریقوں سے زکوٰۃ ادا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

قارئین کرام! معلوم یہ ہوا کہ اسلامی حکومت کا دوسری حکومتوں پر ایک امتیاز یہ ہے کہ قوانین کو جاری کرنے کے طریقہ کار میں اسلامی اقدار کا لحاظ رکھا جائے، اور اس موقع پر عوام الناس کی آزادی، ان کے انتخاب اور انسانی اقدار و شرافت کے طرفدار افراد اس نکتہ پر توجہ کریں کہ اسلام نے عوام الناس کی معقول آزادی کو مکمل طور پر نظر میں رکھا ہے، اور اس بات کی کوشش ہے کہ مومنین اپنی مرضی سے اپنے وظائف پر عمل کریں، جس کی بنا پر معنوی ترقی اور کمال کے درجات پر فائز ہوں اور اگر بعض موارد میں اسلام شدت سے پیش آتا ہے اور بعض لوگوں کے مطابق تشدد (شدت پسندی) سے کام لیتا ہے، تو وہ اس وجہ سے ہے کہ دوسرے افراد کے معنوی کمالات حاصل کرنے کی راہ مسدود نہ ہو جائے اور اگر بعض لوگوں کو سخت سزا دی جانے کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اس کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں، اور وہ اس طرح کے کام کرنے سے باز رہیں جس کے نتیجے میں معاشرہ میں مادیات اور معنویات کی ترقی ہو بھر حال اسلامی نقطہ نظر سے انفرادی آزادی مطلق (نامحدود) نہیں ہے اور جب یہ آزادی معاشرہ کے لئے نقصان دہ ہو تو پھر یہ آزادی محدود ہو جاتی ہے، اور ضرورت کے وقت یہ آزادی محدود کر دی جاتی ہے اور ضرورت کے وقت تشدد سے بھی کام لیا جاتا ہے، بعض مجرموں کو کوڑے لگتے ہیں اور بعض کے ہاتھ کاٹے جاتے ہیں اور بعض حالات میں بھت ہی کم تعداد میں مجرموں کو سزائے موت بھی دی جاتی ہے لیکن یہ تمام سزائیں اس وجہ سے ہیں کہ ان کو دیکھ کر مجرمین عبرت حاصل کریں اور قانون کے مطابق عمل کریں۔

ظاہر سی بات ہے کہ جب اسلام نے چوری کرنے اور عوام الناس کے چین و سکون اور امنیت کو ختم کرنے والے کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہے، تاکہ دوسرے اس سے عبرت حاصل کریں اور چوریاں کم ہوں، اور اس رسوائی میں پھنسنے کے راستے کم ہوں لیکن اگر اسی چوری کے لئے آسان سے آسان سزا رکھی جاتی مثلاً چور کو کچھ مدت کے لئے قید کرنا یا ایک مقدار میں جرمانہ ادا کرنا تو پھر چوروں کی تعداد بھت زیادہ ہو جاتی، اور ممکن تھا جو لوگ کسی جرم کی بنا پر زندان میں ہوں تو چوروں کے ساتھ رہنے سے وہ بھی چوری کرنا سیکھ جاتے۔ قارئین کرام! ہم حقیقت کہنے سے نہیں ڈرتے اور واضح طور پر کہتے ہیں کہ اسلام میں شدت عمل اور (سخت) سزائیں اور غیروں کے مطابق تشدد ہے مجرموں اور فاسدوں کے لئے بھی تشدد روا ہے اور کفار اور اسلام کے دشمنوں کے لئے بھی؛ جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾^(۱)

”محمد (ص) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لئے سخت ترین اور آپس میں انتہائی رحم دل ہیں“
اسی طرح خداوند عالم لوگوں کو عبرت دینا اور مجرم کو ذلیل کرنا ضروری سمجھتا ہے:

﴿وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾^(۲)

”اور اس سزا کے وقت مومنین کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہئے“

قارئین کرام! آپ حضرات نے ملاحظہ فرمایا کہ اسلام اور قرآن بعض موارد میں تشدد کے ساتھ عمل کرنے اور مجرم کو ذلیل کرنے کو ضروری سمجھتا ہے، اور ہم ان آیات کو قرآن سے نہیں مٹا سکتے اگر اس طرح کی سزا کو بعض لوگ انسانی شرافت کے خلاف سمجھتے ہیں تو ہم عرض کرتے ہیں کہ اجتماعی مصلح کی حفاظت کے لئے بعض مواقع پر مجرموں اور فاسدوں کے ساتھ انسانی شرافت کے خلاف کام واجب اور ضروری ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی سزا حقیقی خشنونت نہیں بلکہ عوام الناس کی اجتماعی معقول آزادی سے بھرہ مند ہونے کی راہ ہموار کرنا اور اس کا ایک مقدمہ ہے۔

حوالے:

(۱) ”الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ اضَلَّ اَعْمَالَهُمْ“ (سورہ محمد آیت اول) جن لوگوں نے کفر کیا اور لوگوں کو راہ خدا سے روکا خدا نے ان کے اعمال کو برباد کر دیا (اضافہ مترجم)

(۲) ”حَدِّقْ زَنَا كِي تَهْمْت لَانِ وَالْا لَ ۸۰ كُو ۷ لَانِ جَانِ ۷ هِنِ، جِس كِي صِرَا حْت سُو رِه نُو ر كِي اَ يْت نَمْبِر ۴ مِي ۷ اِر د هُو ۷ ۷ هِي (مترجم)

(۳) سورہ فتح آیت ۲۹

(۴) سورہ نور آیت ۲

اٹیسواں جلسہ

اسلامی حکومت کی ذمہ داری کے بارے میں نظریات

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

جیسا کہ ہم نے گذشتہ جلسوں میں عرض کیا کہ اسلامی سیاسی نظام میں حکومت کی اہمیت اور اس کے قوانین کو نافذ کرنے کی ذمہ داری کی معرفت اس بات پر مبنی ہے کہ حکومت کی تشکیل خصوصاً اس سلسلہ میں اسلامی آئیڈیل کی شناخت کی جائے اسی طرح ہم نے حکومت کے وظائف اور ذمہ داریوں کے بارے میں بیان کیا تھا جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ ان قوانین کو جاری کرنے کی ضمانت جو براہ راست عوام الناس کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ کیفری اور سزائی قوانین کا جاری کرنا جو براہ راست حکومت کے ذمہ ہوتے ہیں؛ یعنی اگر بعض لوگوں نے قوانین اوّلی پر عمل نہ کیا اور ان کی خلاف ورزی کی تو ان لوگوں کو سزا دے نا حکومت کی ذمہ داری ہے۔

۳۔ معاشرہ کی ان ضرورتوں کو پورا کرنا جن کو صرف حکومت ہی انجام دے سکتی ہے اور وہ انفرادی یا گروہی شکل میں انجام نہیں دی جا سکتیں جس کی بہترین مثال بیرونی دشمن کے مقابلہ میں دفاع ہے، عوام الناس اور گروہوں کی قدرت سے بالاتر ایک قدرت (حکومت) ہو جو اس کام کو اپنے ذمہ لے، (اور بیرونی دشمن کو دندان شکن جواب دے سکے)۔

۴۔ ان ضرورتوں کو پورا کرنا جو پہلے مرحلہ میں حکومت کے ذمہ نہیں ہیں بلکہ خود عوام الناس بھی ان امور کو انجام دے سکتی ہے، لیکن بعض وجوہات کی بنا پر وہ عملی جامہ نہیں پہن پاتی ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی خاص فرد ذمہ دار ہوتا ہے مثلاً عام صفائی اور دیگر خدمات وغیرہ جن کو خود عوام الناس بھی انجام دے سکتی ہے لیکن ان کاموں کو انجام دینے میں رغبت نہیں پائی جاتی، یا ان کے وسیع ہونے یا ان میں مشکلات ہونے کی وجہ سے ان کے لئے خاص طریقہ پر منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کام کو حکومت ہی انجام دے سکتی ہے۔

۵۔ حکومت کی مہم ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری معاشرہ کے عام درآمدی مناجسے فائدہ اٹھانا ہے جس کو اسلامی ثقافت میں ”انفال“ کہا جاتا ہے، مثلاً جنگل، دریا، تیل اور گیس، یا سونے چاندی کی کانیں وغیرہ جن کا کوئی مخصوص مالک نہیں ہوتا اور کسی کو ان سے ذاتی طور پر فائدہ اٹھانے کا حق (بھی) نہیں ہوتا، تو انہیں چیزوں کے پیش نظر اس بات کی ضرورت ہے کہ ان چیزوں کی حفاظت کے لئے کوئی کمیٹی (یا حکومت) ہو تاکہ ان معدنوں سے صحیح فائدہ اٹھا کر معاشرہ کی اصلاح کے لئے خرچ کیا جاسکے۔

ظاہر سی بات ہے کہ حکومت کے وظائف اور اس کی مخصوص ذمہ داریوں کی شناخت کے بعد اس کے وجود کا فلسفہ بھی (آسانی) سے سمجھا جاسکتا ہے اسی طرح عام طور پر اس کی اہمیت بھی معلوم ہو جاتی ہے، لیکن اس نکتہ پر توجہ ضروری ہے کہ اسلامی حکومت کا خاص امتیاز یہ ہے کہ وہ مادی امور جن کو عام حکومتیں بھی انجام دیتی ہیں ان کے علاوہ معاشرہ میں معنوی اور روحانی امور کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوتا ہے، اسی لئے اسلامی شعاری حفاظت کرنا، دینی عام معلومات کا فراہم کرنا اور اسلام و اسلامی مقاصد کو بہتر سے بہتر رواج دینا اسلامی حکومت کی مخصوص ذمہ داری ہے۔

۲۔ اسلامی حکومت کے عہدہ داروں کے شرائط

اب جبکہ معلوم ہو گیا کہ اسلامی حکومت کی عظیم ذمہ داریاں ہوتی ہیں تو پھر حکومت کے مختلف عہدہ داروں میں کن شرائط کا ہونا ضروری ہے کیونکہ عہدہ داروں کے شرائط بھی ان کے وظیفوں کے لحاظ سے ہونا ضروری ہیں، اور جس قدر وظائف عظیم اور مہم ہونگے اسی لحاظ سے اس کے عہدہ داروں کے شرائط بھی عظیم ہونا ضروری ہیں، اور چونکہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری دوسری حکومتوں سے زیادہ ہوتی ہے تو اس کے عہدہ داروں کے لئے بھی مہم شرائط ہونا ضروری ہیں ہر حکومت میں قوانین کو نافذ ہونا چاہئے، لیکن لائیک حکومتوں کی نسبت اسلامی حکومت کے قوانین کا دائرہ وسیع تر ہے جیسا کہ ہم نے قانون کے سلسلہ میں عرض کیا کہ غیر دینی حکومتوں میں قوانین کو صرف معاشرہ کی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بنایا جاتا ہے، جیسا کہ سیاسی فلاسفہ کہتے ہیں کہ حکومت کی ذمہ داری صرف اجتماعی طور پر امن و امان قائم کرنا اور ہرج و مرج (بد امنی) سے روک تھام ہے، لہذا اس طرح کے اہداف آسان شرطوں کے ساتھ پورے ہو سکتے ہیں، لیکن اگر اس مقصد کے ساتھ ایک عظیم ہدف معنوی مصلح اور دینی والہی اقدار کا اضافہ ہو جائے (جیسا کہ قانون اساسی (بنیادی قوانین) میں موجود ہے اور ان کو نافذ کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے) تو اسلامی حکومت کے عہدہ داروں کے شرائط دیگر حکومتوں کے عہدہ داروں سے سخت ہو جائیں گے۔

قارئین کرام! ہم اپنے اس مقدمہ کو بیان کرنے کے بعد مناسب سمجھتے ہیں کہ قوانین نافذ کرنے والے عہدہ داروں کے شرائط بیان کریں، (لہذا ہم عرض کرتے ہیں کہ) قوانین کے نافذ کرنے والے عہدہ داروں کے عام طور پر تین شرائط ہیں جن کے بارے میں تمام حکومتوں میں کوشش کی جاتی ہے کہ وہ شرائط عہدہ داروں میں ہونے چاہئے، اور اسلامی حکومت کے عہدہ داروں کے شرائط کے سلسلہ میں قرآن و حدیث میں بیان شدہ دلائل کے علاوہ ایسے عقلی (اور منطقی) دلائل ہیں جن میں انسان اعتراض نہیں کر سکتا:

الف۔ قانون کی پہچان

جو شخص قانون کو نافذ کرنے کا عہدہ سنبھالنا چاہتا ہے تو اس کے لئے اس سے آگاہی ضروری ہے نیز اس کے شرائط اور اس کو جاری کرنے کا طریقہ کار بھی جانتا ہو اگر کوئی شخص قانون نہ جانتا ہو تو اس کو نافذ بھی نہیں کر سکتا، جس کی بنا پر قانون کو نافذ کرنے میں غلطی کر بیٹھے گا اور اپنی ذمہ داری کو ہی نقصان پہنچائے گا اور چونکہ اسلامی حکومت کے قوانین اسلامی اصول کے مطابق ہوتے ہیں تو ہر عہدہ دار اور مدیر کے لئے اپنے ماتحت انجام پانے والے امور کے بارے میں شرعی قوانین کا علم ہونا ضروری ہے کیونکہ ان قوانین کے تحت کام کرنا اس کی ذمہ داری ہے اور جو شخص کسی کام کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتا ہے تو اس کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنا خاص اہمیت رکھتا ہے اور چونکہ جیسی ذمہ داری ہوتی ہے اسی لحاظ سے اس کی اہمیت ہوتی ہے مثال کے طور پر کسی انسان کو ایک چھوٹی سی ذمہ داری دی جاتی ہے تو اس کے قوانین اور مقررات بھی محدود ہوتے ہیں لیکن کبھی اس کی ذمہ داری اس سے بڑھ کر ہوتی ہے جیسے ڈپٹی کمشنر تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ماتحت مختلف اداروں، ان میں نافذ ہونے والے قوانین اور ان کی دیکھ بھال کے بارے میں پوری معلومات رکھتا ہو، اسی طرح ذمہ داریاں بڑھتی رہتی ہے، یہاں تک کہ وزیر اور وزیر اعظم یا صدر مملکت جو ملک کا سب سے بڑا عہدہ ہوتا ہے اس کے لئے مختلف قانون کے بارے میں مزید معلومات کا ہونا ضروری ہے، لہذا اس عظیم عہدہ کے لئے وہی شخص لیاقت رکھتا ہے جو دوسروں سے زیادہ قوانین کے بارے میں علم رکھتا ہو۔

ب۔ اخلاقی صلاحیت

اسلامی حکومت کے عہدہ دار، مدیر اور کارگزاروں کو قوانین کے بارے میں معلومات رکھنے کے علاوہ ان میں اخلاقی شائستگی ہونا (بھی) ضروری ہے تاکہ اپنے عہدے اور موجود امکانات سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے، اور ان کو اپنی ذمہ داری کو صحیح طور پر نبھاتے ہوئے ان کو کام میں لائے، اور اس میں ذاتی مفاد یا کسی خاص گروپ کا فائدہ اس کو اپنے وظائف پر عمل کرنے سے نہ روکے ممکن ہے کوئی شخص قوانین کو خوب اچھی طرح جانتا ہو لیکن اگر اس قانون کو جاری کرنا اس کے نفع میں نہ ہو تو ہو سکتا ہے وہ اپنے فائدہ کے لئے قانون کو پامال کر دے اس کی مثال دنیا کے مختلف ممالک میں دیکھنے کو ملتی ہے کہ ملک کے بڑے بڑے عہدہ داروں نے کتنا غضب کیا (کیسے کیسے گھوٹالے کئے) جن کی خبریں دنیا بھر کے مختلف ممالک میں دیکھنے کو ملتی ہیں کہ مثلاً فلاں ملک کا صدر مملکت فلاں گھوٹالے کی وجہ سے جیل بھیج دیا گیا فلاں وزیر یا فلاں عہدہ دار کو فلاں سزا ہو گئی اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ قوانین کو اپنے حق میں مانع دیکھتے ہیں، (لہذا ان کو پامال کرتے ہوئے اپنے منافع کو ترجیح دیتے ہیں)، ان میں تقویٰ اور اخلاقی صلاحیت نہیں پائی جاتی کہ جس کی وجہ سے معاشرہ کو اپنی ذات پر ترجیح دیں اسی وجہ سے وہ قوانین کو پامال کر دیتے ہیں۔

لہذا طے یہ ہوا کہ قانون کے رکھوالوں کے لئے اخلاقی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے اور اس قدر تقویٰ ہونا ضروری ہے کہ اپنی ہوا و ہوس اور ذاتی مفاد کا مقابلہ کریں اور (ہمیشہ) حق کو مقدم رکھیں۔

ج۔ مدیریتِ مہارت اور تجربہ

قانون کے ذمہ دار افراد قانون کو صحیح طریقہ سے جاری کریں اور ان کو خاص اور جزئی موارد میں منطبق کرنے کے لئے کافی حد تک تجربہ اور مہارت کا ہونا ضروری ہے، اور صرف قوانین کے بارے میں معلومات ہونا کافی نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے کہ بھت سے لوگ قوانین کو اچھی طرح جانتے ہوں اور تقویٰ اور صلاحیت بھی رکھتے ہوں لیکن قوانین کو جاری کرنے کا تجربہ اور مہارت نہ ہو، اور عملی میدان میں قوانین کو اس کے مصداق پر تطبیق نہ کر سکتے ہوں لہذا حکومت کے بڑے عہدہ دار کسی ایسے شخص کو ذمہ دار قرار نہ دیں جو کافی مقدار میں مہارت اور تجربہ نہ رکھتا ہو لہذا مدیریت کو ٹریننگ بخشنے کے لئے اس شرط کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔

قارئین کرام! دنیا کے تمام ہی ممالک میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ حکومت کے عہدہ داروں میں یہ شرط ہونا چاہئے؛ اسی طرح اسلام نے بھی حکومت کے عہدہ داروں کے لئے ان تین شرائط کو لازم اور ضروری جانا ہے اور ان کو بھت زیادہ اہمیت دی ہے، لیکن دوسری شرط؛ یعنی تقویٰ اور اخلاقی صلاحیت پر اسلام نے بھت زیادہ توجہ دی ہے جبکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں دوسری دو شرطوں پر توجہ دی جاتی ہے اور عہدہ داروں کے لئے تقویٰ و عدالت پر زیادہ دھیان نہیں دیا جاتا ہاں اس شرط کو فقط اس حد تک ضروری سمجھتے ہیں کہ بعض حکومتی عہدوں کے لئے جن اشخاص کو منتخب کرتے ہیں وہ جرائم میں ملوث نہ ہو۔

۳۔ عہدہ داری کے شرائط کا نصاب معین کرنے کی ضرورت

قارئین کرام! ایک قابل توجہ نکتہ جس پر مختلف سیاسی مکتب میں توجہ کی جاتی ہے وہ (مذکورہ) شرائط کے مختلف درجات ہیں جو اقدار کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں مثلاً جس طرح تقویٰ کے مختلف درجات ہوتے ہیں جس کا سب سے کمترین درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے واجبات کو انجام دے اور گناہوں سے اجتناب کرے، اس کا ایک درجہ وہ ہے جس پر اولیاء اللہ اور دینی عظیم پیشوا مثل امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ یا وہ افراد جن کا مقام معصومین علیہم السلام سے قریب ہوتا ہے؛ فائز ہوتے ہیں، اور اس درجہ کے ہوتے ہوئے ان کے خیال و فکر میں بھی ناجائز تصور نہیں آتے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکومتی عہدوں کو حاصل کرنے کے لئے کس درجے کا تقویٰ؛ معیار اور ملاک قرار دیا جانا چاہئے، اور اگر تقویٰ کا بلند ترین درجہ معیار قرار دیں تو پھر ایک مشکل پیدا ہو جائے گی کہ اس طرح کے افراد بھت کم ہوتے ہیں جو شاید ملک کے عظیم اور مہم عہدوں کے لئے ہی کافی ہو، لیکن دوسرے عہدوں کے لئے کافی نہ ہوں گے، اور اگر کمترین درجے والے تقویٰ کو معیار قرار دیں تو وہ مقام عمل میں سود مند نہیں ہوتا جس کی بنا پر خلاف ورزیاں ہوتی رہیں گی، اور جس کے نتیجے میں اپنے مقصد تک

نہیں پہنچا جاسکتا یہ مسئلہ انسانی کردار کے مختلف بنیادی مشکلات اور مسائل کے حل کے مقابلہ میں ہے، لیکن بعض افراد کا یہ ماننا ہے کہ عہدہ داری کے لئے یا تمام تر اخلاقی صلاحیت پائی جائیں اور اگر تمام صلاحیت نہ ہوں تو پھر کسی بھی صلاحیت کا ہونا ضروری نہیں ہے، ”یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں“ یعنی یا تو انسان میں بلند ترین صفات ہونا چاہئے یا بالکل بھی صفات کا ہونا ضروری نہیں ہے اور یہ نظریہ انسانی علوم کے مختلف شعبوں میں جن میں سے ایک فلسفہ اخلاق بھی ہے؛ پایا جاتا ہے۔

۳۔ اخلاقی صفات کے بارے میں ”کانٹ“ کے نظریہ کی رو

جو لوگ اخلاقی فلسفہ سے آشنائی رکھتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ جرمنی فیلسوف ”کانٹ“ کا ایک نظریہ ہے جس کے بھت زیادہ طرفدار (بھی) پائے جاتے ہیں، اس کا نظریہ یہ ہے کہ وہ اخلاقی صفت اس وقت اہمیت پیدا کرتی ہے جب وہ بلند ترین درجے پر فائز ہو اور کسی دوسری چیز پر توجہ کئے بغیر اس کو اپنایا جائے، محبت، احساسات اور معاشرہ کی وجہ سے نہ ہو، یعنی اگر انسان کوئی نیک کام کرنا چاہے تو فقط اس کو اس کے نیک ہونے کی وجہ سے انجام دے، اس پر مرتب ہونے والے اثر (ثواب) کے لئے نہیں، اور نہ اپنی خواہش کو پورا کرنے یا محبت کی تسکین کے لئے، لہذا اگر کوئی ماں آدھی رات بچے کے رونے کی آواز سن کر اپنی میٹھی نیند سے بیدار ہو کر بچے کو اپنی گود میں لے لے اور اس کو دودھ پلائے، اگرچہ عوام الناس کی نظر میں یہ کام با اہمیت ہے، لیکن کانٹ کے نزدیک اس کام کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے کیونکہ ماں نے اپنی مامتا اور بچے سے شدید محبت کی وجہ سے اس کو دودھ پلایا ہے اور اگر وہ اس بچے کو دودھ نہ پلائے تو پریشان ہو جائے گی، درحقیقت ماں نے اس بچے کو دودھ پلا کر اپنی مامتا کو ٹھنڈا کیا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کام کو معاشرہ کی بھلائی کے لئے انجام دے یا عوام الناس کے اعتماد کو جلب کرنے کے لئے سچ بولے، تو ان کاموں کی کوئی ارزش و اہمیت نہیں ہے سچائی کی اہمیت اس وقت ہے جب صرف اس کی خوبی کو مد نظر رکھ کر سچ بولے۔

قارئین کرام! جیسا کہ آپ حضرات نے ملاحظہ فرمایا کہ کانٹ نے اخلاقی اقدار کے لئے بھت سخت شرائط بیان کئے ہیں جس کے تحت بھت کم افراد ہی اس کے مصداق مل پائیں گے، اور بھت ہی کم افراد اخلاقی اقدار والے مل پائیں گے؛ کیونکہ یہ اخلاق کبھی تو مامتا کی وجہ سے یا اور کبھی اجتماعی فائدہ کی وجہ سے یا اخروی ثواب کے لئے ہوتا ہے۔

لہذا اگر اخلاقی صفات میں تمام صفات پائے جائیں تو وہ صحیح ہے لیکن اگر ان میں کچھ شرائط نہ پائے جائیں تو اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے اسی طرح دوسری چیزوں میں بھی منجملہ سیاست اور حکومت کے بارے میں، کہ وہ حکومت برحق ہے جس کے تمام عہدہ دار اعلیٰ شرائط پر فائز ہوں اور اگر ایسے افراد موجود ہوں تب کھیں حق کی حکومت کی بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔

اسلامی انقلاب سے پہلے ہمارے معاشرہ میں بھی بعض دیندار افراد لیکن سخت دل اور کج فکر رکھنے والے اس طرح کا نظریہ رکھتے تھے اور کھتے تھے: اگر اسلامی حکومت بنانا چاہتے ہیں تو جب ہمارے معاشرہ میں سلمان فارسی جیسے افراد کی تعداد کافی مقدار میں موجود ہوں گی تاکہ ایسے ہی افراد کو شہر کا حاکم بنایا جائے، اور جب تک ہمارے پاس ایسے افراد نہ ہوں تو پھر ہمیں انقلاب لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ان تنگ نظر لوگوں کا نظریہ تھا کہ حضرت امام زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کے ظہور تک اسلامی انقلاب کے لئے راستہ ہموار نہیں ہوگا، لہذا ہمیں انقلاب کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور ہمیں انتظار کرنا چاہئے یہاں تک کہ حضرت امام مہدی (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) اپنے تین سو تیرہ ممتاز ساتھیوں کے ساتھ آکر انقلاب برپا کریں اور عدل و انصاف کی حکومت قائم کریں ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ اس وقت تقویٰ اور اخلاقی صفات کے مالک افراد نہیں ہیں لہذا انقلاب برپا کرنا صحیح نہیں ہے متقی اور مخلص افراد کی تعداد اس قدر ہو کہ حکومت کے مہم عہدے ان کے سپرد کئے جاسکیں، تاکہ وہ معاشرہ کو صحیح طریقہ سے چلا سکیں اور معاشرہ میں کسی طرح کا نقص و عیب پیدا نہ ہو سکے۔

قارئین کرام! اس نظریہ پر چھوٹے سے چھوٹا اشکال یہ ہے کہ اس طرح کی نمونہ حکومت کسی بھی وقت نہیں بن سکتی، اور جب تک تقویٰ اور اخلاق سے مزین ایسے افراد کی تعداد حد نصاب تک نہ پہنچے اسلامی حکومت کی فکر کرنا ہی بے کار ہے؛ تو اس صورت میں معاشرہ میں فساد و تباہی پھیلتی چلی جائے گی، اور اجتماعی و سیاسی مثبت پہلو کی طرف ترقی ہونے کے بجائے ان کا راستہ بالکل محدود ہو کر رہ جائے گا۔

۵۔ اقدار اور وظائف کے بارے میں اسلامی درجہ بندی نظریہ

مذکورہ ایک پہلو والے اقدار کے نظریہ کے برخلاف؛ بعض حکومتوں میں چاہے انفرادی کردار ہو یا اجتماعی اور سیاسی مختلف مراتب اور مختلف نمونے پیش کئے گئے ہیں: اول درجہ میں ایک آئیڈیل (نمونہ) پیش کیا جاتا ہے اس کے بعد دوسرے درجے والے نمونے اور کمترین شرائط والے نمونے، اس کے بعد مجبوری والے نمونے پیش کئے جاتے ہیں اسی طرح اسلام نے مختلف مواقع پر درجات والے نمونے بیان کئے ہیں مثال کے طور پر اسلام نے انسان پر تمام شرائط کے ساتھ نماز واجب کی ہے لیکن اگر انسان مجبوری کی حالت میں ہو تو پھر وہ کامل شرائط ضروری نہیں ہوتے، بلکہ وہ اس وقت سے مخصوص ہیں جب انسان ان شرائط اور اجزاء پر قدرت رکھتا ہو، لیکن مجبوری یا اضطراری حالت میں وہ شرائط کم ہو جاتے ہیں مثال کے طور پر جن مواقع پر انسان کے لئے غسل کرنا واجب ہو جاتا ہے لیکن اگر پانی موجود نہ ہو یا پانی اس کے بدن کے لئے نقصان دہ ہو، یا اگر اس کا وظیفہ وضو کرنا ہو لیکن ٹھنڈا پانی اس کے لئے نقصان دہ ہو اور وہ وضو نہ کر سکتا ہو، تو اسلام ”یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں“ کے نظریہ کو قبول نہیں

کرتا اسلام یہ نہیں کہتا کہ نماز صرف اس صورت میں واجب ہے جب تمام شرائط موجود ہوں اور نماز کو تمام تر مقدمات اور شرائط کے ساتھ بجالاتے اور اس کے علاوہ نماز نہیں ہوگی، بلکہ اسلام نے اس طرح کے مواقع پر اسی لحاظ سے وظیفہ معین کیا ہے، چنانچہ مذکورہ صورت کے بارے میں فرمایا کہ اگر انسان وضو اور غسل کے ذریعہ نماز نہیں پڑھ سکتا تو تیمم کے ساتھ نماز پڑھے، اور اگر کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھی جاسکتی تو بیٹھ کر پڑھے، اور اگر کوئی شخص بیٹھ کر بھی نہیں پڑھ سکتا تو لیٹ کر پڑھے، اور اگر ہاتھ پیر اور زبان کو حرکت نہیں دے سکتا لیکن ہوش میں ہو تو اس سے بھی نماز ساقط نہیں ہے تو اس نازک حالت میں بھی اسی حالت کے لحاظ سے نماز واجب ہے۔

مقصود یہ ہے کہ اسلامی اقداری نظام میں کیفیت اور کمیت (تعداد) کے لحاظ سے سیاسی، اجتماعی اور شرعی وظائف کے درجات رکھے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک انسان کی حالت کے لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں، اول درجہ میں سب سے بلند درجہ مد نظر ہے اس کے بعد دوسرا درجہ اور پھر تیسرا درجہ یہاں تک انسان کی مجبوری کے لحاظ سے جس مقدار بھی انجام دے سکتا ہے اسی کو کافی گردانتا ہے۔

۶۔ عبادت کے بھی مختلف درجات ہیں

دوسری مثال جس سے کانٹ کے نظریہ کا فرق واضح ہو جاتا ہے؛ یہ ہے کہ اسلام عبادت کے سلسلہ میں مراتب اور درجات کا قائل ہے؛ کیونکہ سب سے بہترین عبادت وہ عبادت ہے جو صرف اور صرف خدا کی محبت اور اس کی شکرگذاری کے لئے انجام دی جائے جیسی عبادت حضرت علی علیہ السلام انجام دیتے تھے، جیسا کہ آپ اپنی مناجات میں عبادت کی توصیف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”إِلٰهِي مَا عَبَدْتُكَ خَوْفًا مِنْ عِقَابِكَ وَلَا طَمَعًا فِي ثَوَابِكَ وَلَكِنْ وَجَدْتُكَ أَهْلًا لِلْعِبَادَةِ فَعَبَدْتُكَ“ (۱)

”پروردگارا! میں تیری عبادت تیرے عذاب کے ڈر سے یا تیرے ثواب کے لالچ میں نہیں کرتا بلکہ تجھے عبادت کا حقدار پاتا ہوں تو تیری عبادت کرتا ہوں۔“

”إِنَّ قَوْمًا عَبَدُوا اللَّهَ رَغْبَةً فَتَلَكَ عِبَادَةُ الثُّجَّارِ وَإِنَّ قَوْمًا عَبَدُوا اللَّهَ رَهْبَةً فَتَلَكَ عِبَادَةُ الْعَبِيدِ وَإِنَّ قَوْمًا عَبَدُوا اللَّهَ شُكْرًا فَتَلَكَ عِبَادَةُ الْأَحْرَارِ“ (۲)

”بعض لوگ خدا کی عبادت؛ بخشش کی امید میں کرتے ہیں تو ایسی عبادت تاجروں کی عبادت ہے، اور بعض لوگ خدا کی عبادت اس کے خوف کی وجہ سے کرتے ہیں تو یہ غلاموں کی عبادت ہے، اور بعض لوگ خدا کی عبادت اس کے شکر کی وجہ سے کرتے ہیں اور یہی عبادت آزاد افراد کی عبادت ہے۔“

قارئین کرام! حضرت امیر المومنین علیہ السلام اپنے اس بیان میں سب سے بہترین عبادت اس عبادت کو قرار دیتے ہیں جو صرف اور صرف خدا کے شکر کے لئے بجالی جائے، اور اسلام بھی یہی چاہتا ہے کہ تمام مومنین اسی طرح عبادت کریں، لیکن یہ بات واضح ہے کہ تمام مومنین اس طرح کی قابلیت اور ہمت نہیں رکھتے کہ اس طرح کی عبادت بجالاسکیں، کیونکہ اس طرح کی عبادت صرف خالص اولیاء اللہ ہی انجام دے سکتے ہیں جن کا مقام اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ وہ جمال پروردگار میں محو ہو جاتے ہیں، اور اگر ان کو جھنم میں (بھی) لے جایا جائے تو وہ پھر بھی خدا کی عبادت اور اس سے مناجات کرنا ترک نہیں کریں گے یا اگر ان کو جنت سے محروم کر دیا جائے تو وہ پھر بھی خدا کی عبادت کو ترک نہیں کریں گے لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس طرح کے افراد لاکھوں میں ایک دو ہی مل پائیں گے۔

بھر حال اگر ہم کانٹ کے نظریہ ”یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں“ کو قبول کریں اور یہ مان لیں کہ اخلاقی نیکی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس عمل میں تمام شرائط اور قابلیت پائی جائے اور ذرہ برابر بھی اس کے شرائط میں کمی نہ ہو، تو پھر ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ عبادت اس وقت مقبول ہے جب عالی ترین اور بلند ترین درجہ پر فائز ہو، اور صرف خدا کے شکر کے لئے بجالی جائے؛ یعنی صرف خالص اولیاء اللہ کی عبادت مقبول ہوگی، اور جو لوگ جھنم کے خوف یا بھشت کے لالچ میں عبادت کریں تو اس کی عبادت قابل قبول نہیں ہے لیکن جیسا کہ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اسلام اس تنگ نظری کو قبول نہیں کرتا بلکہ مومنین کی سہولت، زخمتوں اور سختیوں کو دور کرنے کے لئے عبادت اور دیگر وظائف میں درجات رکھے ہیں، ایسے درجات جو کم سے کم شرائط سے شروع ہوتے ہیں اور بلند ترین درجات تک پہنچ جاتے ہیں جن میں تمام شرائط اور صلاحیتیں پائی جاتی ہیں، اور اگر کوئی انسان ان بلند درجات تک پہنچ جائے تو انسانی اور الہی کمال پر پہنچ جاتا ہے جیسے حضرت علی علیہ السلام اور آپ کے (خاص) شاگردوں کی عبادت؛ جس کی وجہ سے یہ حضرات معرفت کے بلند ترین مقام پر پہنچ گئے ہیں اور خدا کی بندگی کے عالی ترین مرتبہ پر فائز ہو چکے ہیں؛ لیکن جن کا درجہ ان سے کم ہے اور وہ لوگ جو ثواب کے شوق میں عبادت کرتے ہیں اس کی عبادت بھی خدا کے نزدیک مقبول ہے اسی طرح وہ لوگ جو اس درجہ سے بھی کم درجہ رکھتے ہیں اور جھنم کے خوف سے خدا کی عبادت کرتے ہیں ان کی عبادت بھی مقبول ہے اور یہ بھی اہمیت و ارزش کا ایک مرتبہ ہے۔

۱۔ اسلامی حکومت کے درجہ بندی شدہ نمونے

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے: اسلام کا نظریہ ”یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں“ نہیں ہے بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے ارزش اور اقدار کے مختلف مراتب ہیں، کم درجہ سے شروع ہو کر بلند ترین درجہ تک پہنچتے ہیں اسلامی سیاست میں بھی اسی طرح ہے: اسلام اول درجہ میں ایک نمونہ حکومت پیش کرتا ہے جو فقط خاص شرائط کے تحت اور ان افراد کے ذریعہ جن میں مکمل شرائط اور بہترین قابلیت پائی

جاتی ہے جن تک عام افراد نہیں پہنچ پاتے، حقیقت میں ویسی حکومت صرف انہیں افراد کے ذریعہ ہو سکتی ہے جو مقام عصمت تک پہنچے ہوئے ہیں اور ان کے کردار میں ذرہ برابر بھی کوئی خطا و غلطی کا تصور نہیں پایا جاتا بلکہ ان کی فکر بھی پاک و پاکیزہ ہوتی ہے، یہ اسلامی حکومت کی بلند ترین اور بہترین شکل ہے وہ حکومت جس کا رئیس ایسا شخص ہو جو نہ صرف یہ کہ ہوا و ہوس کے تحت معصیت نہ کرے بلکہ نا خواستہ میں بھی اس سے غلطی کا امکان نہ ہو، اور اس سے کوئی بھی خطا و لغزش نہ ہو، اور مکمل طور پر مصالح و منافع کی رعایت کرے، اور تمام اسلامی قوانین کے مجموعہ کو جانتا ہو، اور ان کو بہترین طریقہ سے جاری کرے اور یہ وہی نمونہ حکومت ہے جو انبیاء علیہم السلام اور پیغمبر اکرم (ص) اور کچھ مدت کے لئے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے ذریعہ وجود میں آئی۔

البتہ اس نمونہ حکومت سے بھی بالاتر ایک اور حکومت کا تصور کیا جاسکتا ہے جو کبھی بھی نہیں ہو سکتی اور وہ یہ ہے کہ رئیس حکومت میں معصوم کے علاوہ تمام فرماندار اور ریاستی حاکم تمام کے تمام معصوم ہوں۔ اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا اس طرح کی حکومت کبھی بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ کسی بھی زمانہ میں معصوم کی تعداد اس قدر نہیں ہو سکتی جن میں سے حکومت کے تمام عہدوں کے لئے معصوم کا انتخاب کیا جاسکے صرف وہی نمونہ حکومت ہو سکتی ہے جس کا رئیس معصوم ہو اور یہ بھی صرف اسی وقت تصور کی جاسکتی ہے کہ جب معصوم موجود ہو، اور وہ بھی اس صورت میں جب تمام رکاوٹیں ختم ہو جائیں۔

لہذا اسلامی سیاست میں حکومت کے لئے مختلف مراتب اور درجات موجود ہیں کہ اگر حکومت کی بہترین قسم کا امکان نہ ہونے کی صورت میں اس سے ایک درجہ کم والی حکومت اس کے قائم مقام بنے، لہذا اگر بلند ترین حکومت جس میں ریاست معصوم کی ہو؛ نہ بن سکے تو ہم اسلامی حکومت کی تشکیل سے صرف نظر نہیں کر سکتے، بلکہ اگر معصوم حاضر نہ ہو تو ایسے شخص کی حکومت ہو جو علم، تقویٰ اور مدیریت کے لحاظ سے معصوم سے شبہت رکھتا ہو (اگرچہ علم و تقویٰ اور مدیریت کا سب سے بلند درجہ معصوم کی ذات ہی میں تصور کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس کا علم اور اس کا کردار عصمت کے زیر سایہ ہوتا ہے)، اور اگر ایسا شخص بھی موجود نہ ہو تو پھر اس سے کم درجے والے کا انتخاب کیا جائے، اسی طرح کم سے کم درجے والے کا انتخاب کیا جائے، یہاں تک کہ نصاب حکومت کے نچلے درجہ تک پہنچ جائے، اور اگر اس نصاب سے کم درجہ ہے تو پھر اس حکومت کے اہداف محقق نہیں ہو پائیں گے، لہذا اس شکل کی حکومت کو کسی بھی وقت میں انتخاب نہیں کیا جاسکتا۔

قارئین کرام! اگر ہماری بیان شدہ باتوں پر توجہ کی جائے تو ولایت فقیہ کی حکومت کی دلیل خود بخود واضح ہو جائے گی، اور وہ یہ ہے کہ: اگر ہم شرعی اور تعبدی دلائل سے صرف نظر کر لیں تو اسلامی بہترین حکومت کا نمونہ معصوم کی حکمرانی کی صورت میں تصور کیا جاسکتا ہے، لیکن چونکہ اسلام میں اقدار کے مراتب اور درجات ہیں لہذا بغیر شک و شبہ کے حکومت کے بھی درجات ہیں، جس وقت معصوم کے نہ ہوتے ہوئے اس کے بہترین نمونہ ممکن نہ ہو تو ایسے شخص کو حکمرانی کے لئے انتخاب کریں جو معصوم سے زیادہ شبہات رکھتا ہو، اور وہ جامع الشرائط فقیہ ہے جو صلاحیت، قابلیت، علم، عمل اور مدیریت میں معصوم سے زیادہ شبہات رکھتا ہے اور امام کا جانشین شمار ہوتا ہے۔

پس ولایت فقیہ نظام کی دلیل یہ ہے کہ جب امام معصوم (ع) تک رسائی ممکن نہ ہو تو اس صورت میں جامع الشرائط فقیہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالے کیونکہ وہ قوانین سے آشنائی، تقویٰ منجملہ سیاسی اور اجتماعی تقویٰ میں، عام عدالت کی رعایت میں، قوانین کو جاری کرنے میں، حُسن تدبیر اور معاشرہ پر مدیریت میں، عملی میدان میں مہارت، قوانین کو جاری کرنے کے طریقہ کار کی شناخت میں، ہوائے نفس اور شیطان سے مقابلہ میں اور اسلام و مسلمین کے مصالح کو ذاتی اور گروہی منافع پر ترجیح دینے میں دوسروں پر فضیلت اور برتری رکھتا ہے۔

ہو سکتا ہے کوئی شخص یہ کھے کہ جب امام معصوم (ع) تک رسائی ممکن نہ ہو، تو پھر اسلامی حاکم کے لئے وہ شرائط ضروری نہیں ہیں؛ نہ فقہت اور علم کی شرط معتبر ہے اور نہ تقویٰ اور مدیریت کی قدرت، اور جو شخص بھی اپنے آپ کو مسلمانوں کی حکمرانی کے لئے ممبر کے طور پر پیش کرے اور وہ اکثریت سے جیت جائے تو اس کی حاکمیت اور حکومت معتبر اور نافذ ہے۔

حقیقت میں یہ فرضیہ اسی نظریہ ("یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں") پر مبنی ہے یعنی جب اعلیٰ قسم کے شرائط جو فقط معصوم (ع) میں ہو سکتے ہیں؛ والا شخص نہ ہو تو پھر کم تر درجہ والے شرائط کی ضرورت نہیں ہے، جب معصوم (ع) کا تقویٰ نہ ہو تو پھر حاکم کے لئے تقویٰ کی شرط نہیں ہے اور وہ فاسد انسان جو گناہ کبیرہ کا بھی مرتکب ہوتا ہے وہ بھی اسلامی حکومت کا صدر بن سکتا ہے یہاں تک کہ وہ شخص جس نے فقہ و فقہت کی بو بھی نہ سونگھی ہو وہ بھی اسلامی حکومت کا صدر بن سکتا ہے لیکن اسلامی سیاست کے تحت یہ نظریہ بغیر دلیل کے ہے اور باطل ہے، اور صرف مغربی ممالک میں رائج ڈیموکریٹک کے لحاظ سے ہے۔

اسلامی ممالک اور مسلمانوں کے درمیان اسلام سے معمولی معلومات رکھنے والے اور اپنے کو روشن فکر کہنے والے اپنی اسلامی معلومات کو مغربی کلچر سے مخلوط کمر کے مشکلات میں پھنس گئے ہیں، اور جب وہ ڈیموکریسی کو عملی طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نظریہ "یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں" کو قبول کر لیا ہے، یہ سادہ لوح مسلمان اس بات کو مانتے ہیں کہ اگر امام معصوم (ع) موجود ہوں تو پھر اسلامی معاشرہ میں انہیں کی حکومت ہونا چاہئے؛ لیکن اب جب کہ امام معصوم (ع) حاضر نہیں ہیں تو پھر معیار لوگوں کی اکثریت ہے اور عوام الناس کی مقبولیت کے علاوہ کوئی شرط ضروری نہیں ہے۔

قارئین کرام! مذکورہ نظریہ ذرہ برابر بھی اسلامی حقیقت سے سخت نہیں رکھتا اسلام خود اپنے سلسلہ میں مراتب کا قائل ہے اور ارزشی و اقدار کے سلسلہ میں مختلف مراتب پائے جاتے ہیں، اسی طرح ہم اجتماعی مسائل میں دیکھتے ہیں کہ بعض امور کے لئے خاص شرائط قرار دئے گئے ہیں لیکن اگر تمام شرائط موجود نہ ہوں تو پھر اس سے کم درجہ کے شرائط معتبر سمجھے جاتے ہیں ہم اپنی بات کو واضح کرنے کے لئے اسلامی اجتماعی احکام میں سے ”وقف“ کے بارے میں اشارہ کرتے ہیں:

احکام ”وقف“ کے سلسلہ میں بیان ہوا کہ اگر کوئی چیز کسی خاص کام کے لئے وقف کی جائے تو اس کو اسی کام میں استعمال کیا جانا چاہئے لیکن اگر وہ کام بالکل ختم ہو جائے اور اس کا وجود خارجی نہ ہو تو پھر اس کام میں استعمال کیا جائے جو اس سے نزدیک ہو مثلاً قدیم زمانہ میں بعض چیزوں کو حضرت امام حسین علیہ السلام کے زائرین کے سواروں (گھوڑے وغیرہ) کے لئے وقف کیا جاتا تھا اور اس کی درآمد سے حضرت سید الشہداء (ع) کے زواروں کے ان حیوانوں پر جن پر سوار ہو کر کربلا جاتے تھے؛ ان کے لئے گھاس وغیرہ خریدی جاتی تھی لیکن آج کل اس طرح کا کوئی سلسلہ نہیں ہے اور آج کل کوئی گدھے گھوڑوں پر سوار ہو کر کربلا نہیں جاتا بلکہ آج کل تو ہوائی جہازوں اور گاڑیوں سے سفر کئے جاتے ہیں، تو کیا اس طرح کی وقف شدہ چیزوں کو بالکل ہی چھوڑ دیا جائے اور ”یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں“ کے نظریہ کے تحت اس وقف شدہ شی کو بالکل ہی استعمال نہ کیا جائے، یا جس طرح اسلام نظریہ پیش کرتا ہے کہ اگر اعلیٰ ترین مرتبہ نہ ہو تو اس سے کم مرتبہ والے کو اخذ کیا جائے جو گذشتہ استعمال سے زیادہ شبہات رکھتا ہے، اور یہ کھیں کہ اب جب جانوروں کو گھاس کھلانے کا موقع نہیں ہے تو اس کی درآمد کو ان گاڑیوں کے تیل وغیرہ میں خرچ کیا جاسکتا ہے، جن کے ذریعہ کربلا جاتے ہیں؟ کیونکہ یہ کام گذشتہ استعمال سے زیادہ نزدیک ہے۔

اسی طرح اگر وقف کرنے والا اپنے بعد وصیت کرے کہ اس کے بعد اس کے لڑکوں میں سے سے ہی کوئی ایک اس کا متولی ہو لیکن متولی کے شرائط بیان کریں منجملہ یہ کہ متولی مجتہد ہو، تو اگر اس کی اولاد میں کوئی مجتہد نہ ہو لیکن ایسا لڑکا ہو جو اجتہاد کے قریب یا مجتہد متجزی ہو، تو کیا اس صورت میں وقف شدہ شے بغیر متولی کے رہے گی کیونکہ اس کے لڑکوں میں کوئی مجتہد نہیں ہے؟ یا اگر پہلا درجہ ممکن نہ ہو تو دوسرے درجہ کو اختیار کیا جائے گا؛ اور مجتہد نہ ہونے کی صورت میں قریب الاجتہاد کو اس کا متولی بنایا جائے؟

بھر حال شرعی، اجتماعی اور سیاسی مسائل میں ایسے بھت سے نمونے موجود ہیں جن کو عقل اور شریعت صاحب مراتب سمجھتے ہیں اسی طرح اسلامی حکومت میں حاکم اور صدر کے لئے مراتب اور درجات رکھے گئے ہیں کہ اگر اول درجہ یعنی امام معصوم (ع) نہ ہونے کی صورت میں وہ شخص حاکم بنے جو امام معصوم (ع) کا جانشین ہو اور ہر لحاظ سے معصوم (ع) سے قریب ہو، اور وہ جامع الشرائط ولی فقیہ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

حوالے:

(۱) بحار الانوار ج ۴۱ ض ۱۴

(۲) نصح البلاغہ، کلام ۲۳۸

تیسواں جلسہ

اسلامی حکومت سے ولایت مطلقہ فقیہ کی نسبت

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

قارئین کرام! ہماری یہ بحث ”اسلامی سیاسی نظریہ“ کے تحت ہے اور ہم نے اس بحث کو دو عام حصوں میں تقسیم کیا، جس کا پہلا حصہ قانون اور قانون گذاری کے سلسلے میں تھا اور دوسرا حصہ قانون جاری کرنے کا طریقہ کار اور معاشرہ کا نظام یا بالفاظ دیگر حکومت اور قوہ مجریہ کی اہمیت ہے دوسرے حصہ میں فلسفہ سیاست کے بارے میں لکھی گئی کتابوں میں مختلف نظریات اور مختلف طریقہ کار بیان کئے گئے ہیں، لیکن ہم نے اپنے لحاظ سے اس طریقہ کو اپنایا ہے کہ پہلے حکومت کی ضرورت کے بارے میں بحث کریں، تاکہ اس ضرورت کے تحت اس کے وظائف کی بھی پہچان ہو جائے اس کے بعد حکومت کی ذمہ داریوں کے پیش نظر اس کے اختیارات کے بارے میں بھی معلومات ہو جائے۔

آخری چند جلسوں میں ہماری بحث یہ تھی کہ حکومت کی مخصوص ذمہ داریوں میں سے معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنا بھی ہے وہ ضرورتیں جن کو انفرادی یا گروہی صورت میں انجام نہیں دیا جاسکتا یا ان کو انجام دینے والا کوئی نہیں ہوتا، اور اگر حکومت اپنا قدم نہ بڑھائے تو پھر وہ ضرورتیں پوری نہیں ہو پاتیں انہیں ضرورتوں میں سے کچھ اس طرح ہیں: دفاعی طاقت کو بڑھانا، بیرونی دشمن کے مقابلہ میں دفاع کرنے کے لئے مکمل طور پر تیاریاں کرنا، اور جنگ کو صحیح اور بہتر طریقہ سے ادارہ کرنا، اندرونی ناخوشگوار حالت سے مقابلہ کرنا، اندرون ملک میں امن و امان قائم کرنا، اسلامی قوانین اور مقررات (وہ قوانین جو اصل ہیں یا جن کو پارلیمنٹ طے کرتا ہے) کو نافذ کرنا، عمومی مال پر نظارت کرنا اور ان سے صحیح طریقہ سے فائدہ اٹھانا مثلاً انفال (جیسے معادن) کان) دریا اور جنگل وغیرہ) اور ان چیزوں کو استعمال کرنا جن کا کوئی خاص مالک نہیں ہے، اسی طرح معاشرہ کے ان لوگوں کی سرپرستی کرنا کم سن ہونے یا معلول (اپاہج) یا کم عقلی کی بنا پر سرپرستی کے نیاز مند ہوتے ہیں جن کا کوئی سرپرست نہیں ہوتا؛ نیز اسلامی حکومت کے سب سے مہم و وظیفہ یعنی اسلامی شعائر قائم کرنا، احکام اسلامی اور حدود اسلامی کو جاری کرنا نیز اسلامی قوانین کی خلاف ورزی سے روک تھام کرنا ہے، اس آخری وظیفہ کے علاوہ دیگر تمام ذمہ داریاں دنیا بھر کی حکومتوں کے بھی ہوتے ہیں، اور جو چیز اسلامی حکومت کو دوسری حکومتوں سے ممتاز بنا دیتی ہے یہی اہم اور عظیم وظیفہ ہے، درحقیقت اس کو اسلامی حکومت کے وظیفوں کی سر فہرست قرار دینا چاہئے۔

۲۔ اسلامی حکومت کے وظائف اور اختیارات کا برابر کا توسعہ

اسلامی حکومت کے وجودی فلسفہ اور اس کی ذمہ داریوں کی وضاحت کے بعد، حکومت کے وہ اختیارات جن کی بنا پر وہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتی ہے، روشن ہو جاتی ہیں؛ کیونکہ اگر حکومت کے ذمہ کچھ وظائف معین کئے جائیں، لیکن ان وظائف پر عمل کرنے کے لئے ضروری اختیارات نہ دئے جائیں تو وہ وظائف فائدہ مند نہیں ہو سکتے؛ چنانچہ روزمرہ کے مسائل میں یہ بات بالکل واضح و روشن دکھائی دیتی ہے مثال کے طور پر اگر کوئی شخص گھر میں کوئی کام اپنے بیٹے کے سپرد کرے لیکن اس کو انجام دینے کے لئے ضروری وسائل اس کو نہ دے یا کسی مزدور کو کسی کام کے لئے معین کیا جائے لیکن کام میں آنے والے وسائل فراہم نہ کرے یا اس کو وسائل کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ دے؛ تو بیشک کئے ایسا کام بے ہودہ اور لغو ہے اور ہر صاحب عقل ایسے شخص کی مذمت کرے گا۔

جس وقت کسی کو کوئی ذمہ داری دی جاتی ہے تو اس کام کے لئے ضروری اختیارات بھی دئے جاتے ہیں تاکہ ان کے استعمال سے اپنے وظائف کو پورا کرے، اسی بنا پر ہم جس وقت دوسری حکومتوں کے مقابلہ میں اسلامی حکومت کی مہم ذمہ داریوں کو ملاحظہ کرتے ہیں تو پھر اس حکومت کے اختیارات اور امکانات بھی دوسری حکومتوں سے زیادہ ہونے چاہئیں تاکہ بہترین طریقہ سے ان وظائف پر عمل پیرا ہو سکے اسلامی حکومت معاشرہ کی جائز ضرورتوں کو پورا کرنے قانونی اور جائز وسائل اور امکانات کو اختیار کرے؛ ورنہ وہ اپنے وظائف پر عمل ہی نہیں کر سکتی اس بات کو مزید روشن کرنے کے لئے ایک مثال عرض کرتے ہیں:

جب ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل ٹکنالوجی کی ہر روز ترقی ہو رہی ہے اور قدیم زمانے کے حالات بدل رہے ہیں اور انسانی معاشرہ کے لئے نئے نئے حالات پیدا ہو رہے ہیں تو پھر انسانی زندگی کے معاملات بھی مختلف طریقوں کے ہو جائیں گے، یہاں تک کہ اب انسان نے آسمان اور ہوا پر قبضہ کر لیا ہے جب تک انسان نے گاڑی نہیں بنائی تھی تو اس وقت گلی گوچے اور سڑک وغیرہ باریک ہوتی تھی جہاں سے صرف گدھا اور خچر وغیرہ ہی گذر سکتے تھے، پرانے شہروں کے بعض محلوں میں اب بھی اس طرح کی گلیاں موجود ہیں، لیکن اب جب کہ گاڑیوں کا زمانہ آگیا ہے اور اکثر لوگ گاڑیوں اور کاروں سے شہر میں آتے جاتے ہیں، تو اس بات کی ضرورت ہے کہ ان گلی گوچوں کو چوڑا کیا جائے اور ان کی جگہ بڑی سڑک بنائی جائے تاکہ گاڑیاں آسانی سے رفت و آمد کر سکیں، نیز احتمالی خطروں کی بھی روک تھام کی جاسکے۔

جس وقت حکومت یا حکومت کے کا گزار گلی گوچوں اور سڑکوں کو چوڑا کرنا چاہیں تو ان کو عوام الناس کے مکانوں کو توڑنا پڑے گا، تو اگر حکومت کی ذمہ داری ہو تو سڑکوں کو وسیع بنانے تاکہ رفت و آمد میں کوئی مشکل نہ ہو، لیکن اس کو لوگوں کے مکانوں کو توڑنے کا حق نہ ہو، تو حکومت سے ایسے کام کی درخواست لغو و بے ہودہ اور نہ ہونے والا ہے پس معلوم یہ ہوا کہ حکومت کو اپنی ذمہ

داریوں کو پورا کرنے کے لئے اس طرح کے اختیارات کا ہونا ضروری ہے اور اس ذمہ داری کو نبھانے کے لئے ضروری وسائل فراہم ہونا ضروری ہے؛ البتہ حکومت کو چاہئے کہ لوگوں کے ہونے نقصان کا جبرانہ ادا کرے اور ان کے لئے مزید سہولیات کا انتظام کرے تاکہ وہ لوگ دوبارہ اپنے مکان بنا کر زندگی بسر کریں۔

۳۔ حکومتی اختیارات سے ولایت مطلقہ فقیہ کی نسبت

قارئین کرام! حکومت اسلامی کے وظائف پر عمل کرنے کے لئے ضروری اور کافی اختیارات منجملہ عوام الناس کی ملکیت میں ضرورت کے موقع پر تصرف کرنے کا حق ہونے کو مطلق ولایت فقیہ کھا جاتا ہے۔

قرآن کریم، احادیث معصومین علیہم السلام اور فقہاء کرام کے بیانات میں لفظ ”حکومت“ کی جگہ لفظ ”ولایت“ کا استعمال ہوا ہے، اور ان چیزوں میں اس کلمہ کے استعمال کی دلیل سے صرف نظر کرتے ہوئے لفظ ”ولایت“ لفظ ”حکومت“ سے زیادہ مناسب ہے (جیسا کہ مقام معظم رہبری حضرت آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای دامت برکاتہ نے فرمایا ہے کہ لفظ ”ولایت“ کا بار لفظ ”حکومت“ سے زیادہ ہے کہ لفظ ”حکومت“ میں ایک طرح کی زور گوئی اور تکمیل پایا جاتا ہے) کیونکہ لفظ ”ولایت“ میں محبت اور عاطفہ شامل ہے؛ شاید اسی وجہ سے لفظ ”ولایت“، لفظ ”حکومت“ کی جگہ استعمال ہوا ہے بھر حال لفظ ”ولایت“ بالکل لفظ ”حکومت“ کی جگہ استعمال ہوا ہے اور جو شخص معاشرہ پر حکومت کو ضروری سمجھتا ہے شرعی لحاظ سے معاشرہ کے لئے ولایت کو ضروری سمجھتا ہے۔

چنانچہ اس مقدمہ کی بنا پر عرض کرتے ہیں کہ اگر یہ ولایت ان تمام اختیارات رکھتی ہو جن کے ذریعہ اپنے وظائف پر عمل کر سکے اور معاشرہ کی مختلف ضرورتوں کو جائز اور شرعی نقطہ نظر سے پوری کرے، تو اس ولایت کو ”ولایت مطلقہ“ کھا جاتا ہے لیکن اگر ”ولی امر“ کے لئے ضرورت کے وقت ولایت ہو یعنی صرف لوگوں کی جان و مال کے خطرہ کے وقت اس کو تصرف کرنے کا حق ہو اور اس کو گلی اور سڑکوں کی وسعت یا مختلف مقامات پر پارک بنانے یا شہر کو خوبصورت بنانے کی اجازت نہ ہو تو اس ولایت کو محدود اور غیر مطلق کھا جاتا ہے۔

۴۔ مخالفین کی طرف سے ولایت مطلقہ کے بارے میں شک و شبہات

قارئین کرام! جو کچھ ہم نے بیان کیا وہ چیزیں مخالفین بدینتی رکھنے والے عوام الناس (اور بالخصوص) جوانوں کے ذہنوں کو مخدوش کرنے کے لئے بیان کرتے ہیں اور ”ولایت فقیہ“ کی تھیوری کو برعکس پیش کر کے درج ذیل مغالطہ انجام دیا:

پھلے تو انھوں نے لفظ ”ولایت“ کے بارے میں شبہ ایجاد کیا کہ لفظ ”ولایت“ بچوں اور دیوانوں کے لئے استعمال ہوتا ہے ”ولی“ یعنی ”سرپرست“ اور جو بچے یا پاگل لوگ اپنی زندگی کو چلانے کے لئے کافی عقل و تدبیر نہیں رکھتے تو ان کو سرپرست کی ضرورت ہوتی ہے قارئین کرام! یہ مغالطہ بالکل واضح اور روشن ہے، اور جیسا کہ اہل بیت علیہم السلام کی ولایت بھی سرپرستی کے معنی میں نہیں ہے، لہذا یہاں پر بھی لفظ ”ولایت“ بالکل حکومت کے معنی میں ہے اور اس کے معنی اجتماعی امور کی تدبیر اور معاشرہ کے عظیم مدیریت کے ہیں ”ولایت فقیہ“ کے معنی یہ ہیں کہ جو حضرات خداوند عالم کی طرف سے معاشرہ کے عظیم امور کو چلانے کی اجازت رکھتے ہیں، نہ یہ کہ ”ولایت فقیہ“ کی حاکمیت اور حکومت کے تحت صرف بچے، دیوانے اور کم عقل لوگ ہیں

اس کے بعد لفظ ”مطلق“ میں شبہ ایجاد کیا اور اپنے بعض مقالوں میں یہاں تک کہہ دیا کہ ”ولایت مطلق“ کا اعتقاد رکھنا موجب شرک ہے، لہذا جو لوگ ”ولایت مطلق“ کے قائل ہیں در واقع وہ مشرک ہیں اور انھوں نے خداوند عالم کی ذات کے ساتھ شریک قرار دیا؛ کیونکہ خداوند عالم کے علاوہ کوئی مطلق نہیں ہے، اور انھوں نے ”ولی امر“ کو بھی مطلق قرار دیا ہے!!

قارئین کرام! واقعاً انسان اس طرح کی بچکانہ باتوں کا کیا جواب دے لیکن مختصر طور پر عرض کرتے ہیں کہ اولاً قرآن و روایات اور دوسری اسلامی تحریروں میں خدا کو ”مطلق“ نہیں کھا گیا ہے، اور عربی قواعد کے تحت بھی خداوند عالم کے لئے لفظ مطلق کہنا صحیح نہیں ہے لیکن اگر مسامحہ اور مطلق کے معنی میں دخل و تصرف کرتے ہوئے خدا کے لئے لفظ مطلق کو استعمال بھی کریں تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ خداوند عالم نامحدود ہے اور کسی طرح کا کوئی نقص و عیب نہیں رکھتا؛ لیکن کوئی بھی شخص کسی کے بارے میں اس طرح کا عقیدہ نہیں رکھتا ہمارا عقیدہ ہے کہ صرف خدائے واحد کمال مطلق رکھتا ہے اور ذرہ برابر بھی نقص و عیب نہیں رکھتا، اور اس کی ذات میں تمام صفات وجودی غیر متناہی طور پر پائے جاتے ہیں اور یہ بات مسلم ہے کہ اس طرح کے عقیدہ کا ملازمہ یہ نہیں ہے کہ اسلامی حکومت اپنے وظائف پر عمل کرنے کے لئے ضروری اختیارات بھی نہ رکھے، اور بنیادی طور پر ان دونوں (باتوں) میں کوئی ربط نہیں ہے۔ ”ولایت مطلق“ یعنی امت اسلامی کا حاکم اور رہبر، اسلامی معاشرہ کے مصالح کو جاری کرنے کے لئے ضروری اختیارات کا مالک ہوتا ہے، ولی فقیہ اسلامی معاشرہ کی بھلائی اور اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ضروری دخل و تصرف کر سکتا ہے اس مطلب کو مزید واضح کرنے کے لئے ایک مقدار ”اسلامی حکومت کی تھیوری“ پر روشنی ڈالیں گویا اس سے پہلے بھی اس مطلب پر اشارہ کیا جا چکا ہے۔

جس وقت اسلامی حکومت کے ڈھانچہ کی بات ہوتی ہے تو بعض لوگ فلسفہ سیاست کے بارے میں لکھی گئی کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس میں لکھی گئی قدیم زمانے سے آج تک کی حکومتوں کی قسمیں ملاحظہ کرتے ہیں مثلاً حکومت الیگارہ کی "Oligachy"^(۱)، اریسٹوکریسی، "Aristocracy"^(۲) شاہی، ڈیموکریسی وغیرہ، اور آج کل ڈیموکریسی بھی جمہوری اور مشروطہ سلطنت پر تقسیم ہوتی ہے اور جمہوری بھی یا پارلیمنٹی ہوتی ہے یا ریاستی، اس وقت یہ سوال کرتے ہیں کہ اسلامی حکومت مذکورہ اقسام میں سے کونسی قسم ہے؟ یا ان کے مقابلہ میں اس حکومت کی کوئی خاص شکل ہے؟ اگر اسلامی حکومت وہی جمہوری حکومت ہے تو یہ تو وہی ڈیموکریسی اور عوام الناس پر عوام الناس کی حکومت ہے اور اس بنا پر اسلام کی نظر میں حکومت کی کوئی خصوصیت اور امتیاز نہیں ہے اور اگر اسلامی حکومت کو بادشاہی حکومت کہا جائے تو پھر ایران کی اسلامی حکومت کو "جمہوری اسلامی" کیوں کہا جاتا ہے؟ بھر حال حکومت کی شکل کے سلسلہ میں کوئی نظریہ نہیں ہے اور اس سلسلہ میں عوام الناس کو اختیار دیا ہے تاکہ وہ جس طرح بھی چاہیں حکومت تشکیل دیں؛ یا حکومت کے سلسلہ میں اسلام نے کوئی نیا طریقہ ایجاد کیا ہے؟

اسلامی لحاظ سے حکومت کی شکل کے سلسلہ میں مختلف طریقوں سے بھت زیادہ بحثیں ہوئی ہیں اور اسلامی حکومت کی شکل کے لحاظ سے بھت سے سوالات کے جواب میں کہنے والوں نے کہا کہ اسلام نے حکومت کے سلسلہ میں کوئی خاص شکل بیان نہیں کی ہے اگرچہ یہ جواب کافی حد تک صحیح ہے لیکن اشکالات اور ابھام سے خالی نہیں ہے جس کی وضاحت کے لئے دو نکات کا بیان کرنا ضروری ہے:

الف۔ اسلامی قوانین کی وسعت اور ان کا نسخہ نہ ہونا

پھلانکتہ اسلام اور اسلامی قوانین کسی خاص زمانے اور کسی خاص جگہ سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ تمام زمانوں اور تمام معاشروں کے لئے نازل ہوئے ہیں اسلام کے ثابت اور غیر قابل تبدیل احکام اس طرح وضع کئے گئے ہیں جو تمام ہی معاشروں میں قابل اجراء ہیں دوسری طرف، ممکن ہے حکومت کسی چھوٹے معاشرہ کی ہو یا کروڑوں یا اربوں والی آبادی کی ہو جیسے چین اور ہندوستان کی حکومتیں جن کی آبادی ایک ارب سے بھی زیادہ ہے، بھر حال حکومت کی مختلف قسمیں ہو سکتی ہیں: مثلاً ایک سو گھر والے معاشرہ میں بھی حکومت ہو سکتی ہے اور ایک ارب والے معاشرہ میں بھی حکومت ہو سکتی ہے یہاں تک کہ پوری دنیا پر بھی ایک عالمی حکومت ہو سکتی ہے، اور انہیں حکومتوں کی اقسام کی بنا پر ان کے لئے ایک ایسا نمونہ پیش کیا جائے تو تمام قسموں کو شامل؟ یا حکومت کی کوئی خاص شکل معین نہیں کرنا چاہئے، یا اگر کوئی خاص شکل معین کی گئی تو پھر مسلم طور پر آج کل کی بعض حکومتوں سے ہم اہنگ ہوگی، اور دوسرے معاشروں کے لحاظ سے نہیں ہوگی؟ مثال کے طور پر اگر کہیں کہ ظہور اسلام کے وقت

اسلامی پیغام صرف بعض مقامات تک محدود تھا اور اس کے احکام صرف مدینہ منورہ کے چھوٹے معاشرہ کے لئے تھے، اور وہ حکومت جو رسول اسلام (ص) کے ذریعہ تشکیل پائی وہ اس زمانہ کے لئے مناسب تھی جس کی آبادی شاید ایک لاکھ سے زیادہ نہ ہو آئی اسلام کی پیش کردہ ”اسلامی حکومت“ کی شکل و صورت اسی طریقہ کی ہے جو صدر اسلام میں رسول اکرم (ص) کے زمانہ میں تھی، انہیں خصوصیات اور امتیازات کے ساتھ جو اس محدود آبادی میں مخصوص اخلاق اور ثقافت کے ساتھ ہے؟ یا نہ صرف یہ کہ اسلام نے حکومت کی کوئی خاص شکل بیان نہیں کی ہے بلکہ حکومت کے سلسلہ میں کسی طرح کی کوئی قید و شرط پیش نہیں کی ہے؟

قارئین کرام! حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام نہ پہلے گزینہ کو پسند کرتا ہے اور نہ دوسرے کو، بلکہ اسلام نے حکومت کی خاص شکل و صورت بیان کرنے سے بھی بالاتر غیر قابل تبدیل احکام کی بنا پر حکومت کی عام اور وسیع پیمانہ پر معرفی کی ہے، جن کے تحت تغیر اور تبدیلی کی بنا پر مختلف بھت سی شکلیں بن سکتی ہیں اسلام نے نہ عوام الناس کو بالکل ہی آزاد چھوڑا ہے کہ جو چاہیں کریں اور نا ہی حکومت کی کوئی خاص اور محدود شکل بیان کی ہے جس کو صرف کسی خاص زمان و مکان میں ہی نافذ کیا جاسکتا ہے اسلام کے پیش کردہ قوانین اس طرح کے ہیں جن کے تحت حکومت کی صحیح اور عقلانی شکلیں آسکتی ہیں البتہ حکومت کی وہ شکلیں اسلام کے عام اصول سے خارج نہ ہونے پائیں ہم اسلام کے معین کردہ قوانین اور حدود کو اسلامی حکومت کہتے ہیں ہو سکتا ہے ان قوانین کے تحت ایک وقت حکومت کی کوئی خاص شکل ہو اور کسی دوسرے زمانہ میں اس کی شکل و صورت دوسری ہو، لیکن یہ دونوں شکلیں حکومت اسلامی ہونے کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہوتیں۔

دوسرے الفاظ میں یوں عرض کیا جائے کہ اسلام نے حکومت کی کوئی خاص شکل و صورت بیان نہیں کی ہے لیکن اس حکومت کو اسلامی قوانین اور حدود سے باہر نہ ہونا چاہئے بلکہ اسلامی اصول کے ہم آہنگ اور مطابق ہو کیونکہ یہ مسئلہ علمی اور عقلی لحاظ سے دقیق اور ظریف ہے کہ اسلام کے ثابت اور غیر قابل تبدیل احکام روز قیامت تک کے لئے بنائے گئے ہیں جن میں کلی اور عظیم ڈھانچہ موجود ہے، اور ان کے مقابلہ میں جزئی اور قابل تبدیل احکام زمان و مکان کے لحاظ سے وضع ہوئے ہیں، انہیں قابل تبدیل احکام میں سے حکومتی احکام ہیں جو ہر زمانہ میں ولی فقیہ کے ذریعہ یا اس کے دستخط کے ذریعہ وضع ہوتے ہیں جن کی اطاعت اور پیروی کرنا واجب ہے۔

ب۔ اسلام کی طرف سے حکومت کے درجہ وار نمونے

دوسرا نکتہ: جیسا کہ ہم نے پہلے جلسے میں بھی عرض کیا تھا کہ کبھی کوئی شخص کسی مقصد کو سامنے رکھتا ہے، اور اس مقصد تک پہنچنے کے لئے کچھ نمونے شرائط مد نظر رکھے جاتے ہیں لیکن وہ شرائط فراہم نہیں ہوتے تو پھر اس کے بدلے میں دوسرے (اور کمتر) شرائط رکھے جاتے ہیں، یعنی اگر وہ اول درجہ کے نمونہ شرائط حاصل نہ ہوں تو پھر اس کی جگہ دوسرے درجہ کے شرائط کو ہی

انتخاب کیا جاتا ہے، اور اگر دوسرے درجے کے شرائط بھی نہ ہوں تو پھر بات تیسرے درجے پر پہنچتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اقدار اور ارزشی نظام تمامیت (مکمل) خواہ نہیں ہے اور ارزش کو فقط اعلیٰ درجے میں منحصر نہیں کرتا، کہ اگر اس اعلیٰ درجے کے شرائط میں ذرا بھی نقص وارد ہو گیا تو پھر اس کی کوئی ارزش اور اہمیت نہیں رہے گی بلکہ اسلام کے ارزشی نظام میں ارزشوں اور اقدار کے مختلف درجات ہیں، جس میں تمام شرائط پائے جائیں گے وہ بالاتر اور نمونہ اقدار کا مالک ہے اس کے بعد کم درجے والے شرائط کی بھی ایک اہمیت ہوتی ہے ایسا نہیں ہے کہ اگر اعلیٰ درجے کا مقصد حاصل نہ ہو تو بالکل ہی اس کو چھوڑ دیا جائے اور اس کے لئے کم درجے والی حالت کو قائم مقام نہ بنایا جائے۔

مقصد یہ ہے کہ اسلام نے حکومت کی ایک نمونہ اور آئیڈیل شکل پیش کی ہے اور وہ نمونہ شکل اس صورت میں رونما ہوگی جب امام معصوم حاضر ہو اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھالیں، جیسا کہ قرآن مجید میں اسی نمونہ کا انتخاب کر کے بیان کیا گیا ہے، ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَاولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ﴾ (۳)

”اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو جو تمہیں میں سے ہیں۔“
اور دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا ﴾ (۴)

”اور جو کچھ بھی رسول تمہیں دیدے اسے لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے رک جاؤ“

اگرچہ اسلام کا یہ نظریہ ہے کہ اول درجے میں حکومت کی ریاست امام معصوم (ع) فرمائیں چونکہ معصوم صاحب عصمت ہوتا ہے لہذا وہ بہترین طریقہ پر حکومت کو چلا سکتا ہے لیکن نہ تو ہمیشہ معصوم (ع) حاضر ہیں تاکہ براہ راست حکومت کو اپنے ہاتھوں میں لیں اور نہ ہمیشہ امام معصوم (ع) بسوط الید (آزاد) ہیں تاکہ حکومت تشکیل دیں اور اپنی قدرت کا مظاہرہ کریں؛ جیسا کہ ہمارے ائمہ علیہم السلام میں صرف حضرت علی علیہ السلام اور امام حسن علیہ السلام نے حکومت تشکیل دی وہ بھی کم مدت کے لئے، اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے بعد سے اس طرح کے حالات نہ تھے کہ ائمہ معصومین علیہم السلام حکومت تشکیل دیں، یا عوام الناس یا عوام الناس کی اکثریت نے ائمہ علیہم السلام سے نہیں چاہا کہ حکومت تشکیل دیں یا معاشرہ کے اہم افراد ائمہ (ع) کی تشکیل حکومت میں مانع تھے، جن کی وجہ سے ائمہ علیہم السلام کو ہمیشہ حکومت سے کنارہ کشی کرنا پڑی۔

۶۔ اسلامی نقطہ نظر سے ”حکومت میں حکومت“ کے نقشہ کی تاریخ

اگر حکومت کی باگ ڈور امام معصوم علیہ السلام یا عادل مومنین کے ہاتھوں میں نہ ہو بلکہ ظالم اور طاغوت کی حکومت ہو جائے، تو کیا اس صورت میں کوئی بھی حکومتی کام صحیح طریقہ پر انجام نہ دیا جائے اور تمام امور غاصب اور ظالم حاکم کے ہاتھوں میں چلے جائیں اور عوام الناس حکومت کے تمام امور کو چھوڑ دے؟ کیا نیک، صالح اور شائستہ افراد کسی بھی طرح کے حکومتی امور میں رسیدگی نہ کریں اور حتی الامکان معاشرہ کی رہبری نہ کریں؟ بے شک اسلام کا جواب نفی میں ہوگا، اور اس طرح کے حالات میں اضطراری اور مجبوری کا بدل رکھا ہے اور فرمایا ہے کہ: اگر امام معصوم علیہ السلام حاضر ہوں لیکن حکومت تشکیل دینے میں آزاد نہ ہوں یا امام معصوم (ع) حاضر نہ ہوں اور حکومت ان کے نیک اور صالح جانشینوں کے ہاتھوں میں نہ ہو، تو کیا اس صورت میں عوام الناس محدود موارد میں حکومتی امور کے سلسلہ میں کسی ایسے شخص کی طرف رجوع کریں جو معصوم سے زیادہ شبہت رکھتا ہو۔

بے شک معاشرہ میں ہمیشہ ذاتی، گھریلو اور اجتماعی مسائل میں اختلاف اور جھگڑا رہا ہے اور مال و ثروت، معاملات اور خرید و فروخت نیز شرکتوں میں جھگڑے ہوتے رہے ہیں مثلاً دو شریک اپنے حصے کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں یا ورثا میراث کے سلسلہ میں اختلاف کرتے ہیں یا میاں بیوی کے درمیان اختلاف ہوتے ہیں، لامحالہ ان تمام اختلافات اور جھگڑوں کو حل کرنے کے لئے ایک حکومت کا ہونا ضروری ہے تاکہ ان مواقع پر اس کی طرف رجوع کریں اور اپنے اختلافات کو حل کریں اور وہ ان کے اختلافات اور جھگڑوں کو حال کرے ظالم اور طاغوت کی حکومت کے ہوتے ہوئے عوام الناس کو یہ بھانہ نہیں کرنا چاہئے کہ چونکہ حق و انصاف کی حکومت نہیں ہے اور امام معصوم (ع) یا حاکم عادل کی ریاست نہیں ہے لہذا ظالم اور طاغوت کی حکومت پر راضی ہو جائیں اور حکومت کی مرضی پر راضی ہو جائیں اور اس سلسلہ میں کوئی تدبیر نہ کریں؛ بلکہ اگر خاص موارد میں کسی ایسے شخص کی طرف رجوع کرنا ممکن ہے جو اسلامی احکام کو صحیح طریقہ سے بیان کرے اور ان کو جاری کرے، تو اگر ایسا کوئی شخص ہے تو اس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، اسی وجہ سے ہمارے ائمہ معصومین علیہم السلام نے اس طرح کے حالات کے لئے ایک نقشہ پیش کیا ہے جس کو آج کل کی اصطلاح میں ”حکومت میں حکومت کی تشکیل“ کہا جاتا ہے۔

جس وقت حکومت ظالموں اور نااہلوں کے ہاتھوں میں ہو اور وہ معاشرہ پر حکومت کر رہے ہوں اور عوام الناس اس حکومت کے خلاف قیام کرنے اور اس حکومت کا تختہ پلٹنے کے کافی امکانات نہ رکھتے ہوں تو جن حکومتی مسائل میں سرکاری اور قانونی دفاتر کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے؛ تو اس موقع پر ضروری ہے کہ فقہاء، علماء اور ایسے لوگوں کی طرف رجوع کریں جو معصوم تو نہ ہوں لیکن اہل بیت علیہم السلام کے مکتب کے تربیت شدہ ہوں اور علم و تقویٰ کے بلند ترین درجہ پر فائز ہوں اور ان کا علمی اور اخلاقی مقام دوسروں کی نسبت معصوم سے زیادہ نزدیک ہو حتی الامکان اپنے حکومتی مسائل میں ایسے فقیہ کی طرف رجوع کریں جو علمی

لحاظ سے اتنی صلاحیت رکھتا ہو تاکہ اسلام کے احکام کا صحیح طریقہ سے استنباط کرے، اور قضاوت و فیصلوں کے لئے کافی مہارت رکھتا ہو؛ نیز تقویٰ کے بلند ترین درجات رکھتا ہو اور مورد اعتماد اور اطمینان ہو۔

”حکومت میں حکومت“ کے نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ ظالم و جابر حکومتوں میں چھوٹی چھوٹی اور محدود حکومتیں تشکیل دی جائیں تاکہ عوام الناس اپنے حکومتی مسائل میں مشکلات کم وقت ان کی طرف رجوع کر سکیں، جس کو ہماری اسلامی ثقافت میں ”ولایت مقیدہ“ (محدود ولایت) کہا جاتا ہے جو معصومین علیہم السلام کے زمانہ میں بھی فقہاء کرام رکھتے تھے اور امام معصوم علیہ السلام کی اجازت سے خاص موارد میں قضاوت اور امر و نہی کیا کرتے تھے، اور غیبت کے زمانہ میں بھی اگرچہ فقہا مکمل طور پر آزاد نہیں ہوتے تھے اور حکومت نہیں بنا سکتے تھے لیکن محدود مسائل میں اختلافات اور جھگڑوں نیز معاشرہ کے ضروری ترک شدہ امور جن کو ہماری فقہ میں ”امور حسبیہ“ کہا جاتا ہے؛ میں حکومت کیا کرتے تھے، اگرچہ ”ولایت مقیدہ“ ظاہری اور معنوی لحاظ سے ”ولایت مطلقہ فقیہ“ سے فرق رکھتی ہے۔

شیعہ تاریخ میں ہمیشہ فقہاء کی طرف سے ”ولایت مقیدہ“ جاری ہوتی رہی ہے، اور شیعہ افراد اطمینان اور مکمل رضایت کے ساتھ اجتماعی امور، اختلافات اور جھگڑوں میں فقہاء کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان سے ان کا حل طلب کرتے تھے اور شاید اس سلسلہ میں تاریخی پہلو اور ہمیشہ تاریخ میں اس کے موجود رہنے اور اس کی ضرورت کی وجہ سے کسی نے اس سلسلہ میں زیادہ اعتراضات اور شبہات وارد نہیں کئے ہیں، لیکن ”ولایت مطلقہ فقیہ“ کے سلسلہ میں چونکہ تاریخ کا حوالہ نہیں ملتا اور اس کی وجہ سے دشمنان اسلام کی زندگی خطرہ میں پڑ گئی نیز اس نے ناجائز منافع میں رکاوٹ پیدا ہو گئی جس کی بنا پر انھوں نے اس سلسلہ میں بھت سے اعتراضات اور شبہات پیدا کر دیئے۔

۱۔ حضرت امام خمینی (رہ) کی طرف سے ”ولایت مطلقہ فقیہ“ کا نقشہ

حضرت امام زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کی غیبت کے وقت سے انقلاب اسلامی ایران سے پہلے تک یہ احتمال دینا کہ ایک زمانہ میں جامع شرائط فقیہ کے ذریعہ حق و حقیقت کی حکومت کا قائم ہونا صرف ایک خواب تھا، یہاں تک کہ اگر انقلاب سے تیس چالیس سال پہلے خود اسی ملک کی عوام الناس سے کہا جاتا کہ ایک روز وہ آنے والا ہے جب ایک روحانی فقیہ کے ذریعہ اس شہنشاہی حکومت کا تختہ پلٹ جائے اور وہ خود حکومت کی باگ ڈور سنبھالے گا تو کسی کو یقین نہ آتا، اور اس طرح کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا جو فقط خواب کی طرح تھا یہ بالکل اس بات کی طرح تھا کہ اگر ہم کہیں کہ ایک زمانہ وہ آنے والا ہے جب انسان کسی چیز کا سہارا لئے بغیر آسمان میں پرواز کرنے لگے گا، کیونکہ اس طرح کا تصور فقط خواب میں کیا جاسکتا ہے اور ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔

اُس زمانہ میں یہ بات واقعاً ایک مذاق تھی کہ اگر کوئی کھے کہ ایک عالم دین اس طاغوت بادشاہ کی جگہ خود حکومت بنائے گا کیونکہ اس وقت لوگ یہی کہتے کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟! کیا ایسا شخص جو اپنی زندگی کو مشکل سے چلاتا ہو اور اپنے گھر میں بھی امنیت نہ رکھتا ہو اور کسی بھی وقت (مخفی) پولیس ان کے گھر میں آکر گرفتار کر سکتی تھی، یا ان کو جلاوطن کر دے یا جیل میں ڈال دے اور ان کو شکنجہ کرے تو کیا ایسا شخص حکومت تشکیل دینے کی قدرت حاصل کر سکتا ہے!!

اگرچہ گذشتہ زمانہ میں ”ولایت فقیہ“ کا ظاہری وجود نہیں تھا یہاں تک کہ عقلی طور پر اس کا احتمال بھی نہیں دیا جاتا تھا؛ لیکن اس کو علمی طور پر تصور کیا جاسکتا تھا جس میں کوئی اشکال بھی نہیں تھا، بہت سے فقہاء و مجتہدین نے ”ولایت فقیہ“ کی تھیوری کو بیان کیا ہے، اور اس سلسلہ میں تحقیق و بررسی کی ہے کہ اگر ایک زمانہ فقیہ کی حکومت کے لئے آجائے اور وہ فقیہ مسند حکومت پر تشریف فرما ہو، تو اس کی ولایت مطلق ہوگی یا مقید (اور محدود)؟۔

ائمہ معصومین علیہم السلام کے زمانہ کے برخلاف کہ جب ائمہ (ع) تقیہ میں ہوتے تھے اور مکمل طور پر آزادی نہیں ہوتی تھی، اور نہ ہی حکومتی مسائل میں کوئی دخالت کر سکتے تھے، مومنین صرف مخفی طور پر امام علیہ السلام سے ملاقات کرتے تھے اور اپنی بعض مشکلات منجملہ اختلافات وغیرہ کو بیان کرتے تھے تاکہ گواہ اور ثبوت کے بعد ائمہ (علیہم السلام) دونوں فریقوں کے درمیان فیصلہ فرماتے تھے، اسی طرح اس زمانہ کے برخلاف جس میں فقہاء حکومت سے دور رکھے جاتے تھے، اور حکومتی مسائل میں دخالت کا حق نہیں رکھتے تھے، تو اگر کسی زمانہ میں فقیہ و مجتہد کی حکومت بنانے کی راہ ہموار ہو جائے اور وہ حکومت تشکیل دینے کی قدرت رکھتا ہو، تو کیا اس کی ولایت صرف ضروری کاموں تک محدود رہے گی؟ جس کو اصطلاحاً ”امور حسبیہ“ کہا جاتا ہے، یا ظالم و ستمگر کی حکومت کی تمام تر قید و بند اور محدودیت ختم ہو جائے گی؟ جبکہ اسلامی سیاست کے لحاظ سے ولی فقیہ کی قدرت کے بارے میں کوئی محدودیت نہیں ہے، وہ امام معصوم (ع) کی طرح بسوٹ الید ہے جو حکومت تشکیل دے اور معاشرہ کے نظام کو چلانے میں امام معصوم (ع) کی طرح ہے لہذا دوسری قسم ”ولایت مطلقہ فقیہ کی تھیوری“ کے عنوان سے پیش ہوئی ہے۔

ہمارے بزرگوں میں ”ولایت مطلقہ فقیہ کی تھیوری“ کی وضاحت کے علاوہ اس کو عملی طور پر بھی محقق کر کے دکھانے والوں میں حضرت امام خمینی (رہ) تھے، جنہوں نے تقریباً چالیس سال پہلے اپنے درس میں اس سلسلہ میں بیان کیا کہ ایک فقیہ کسی خاص علاقہ میں حکومت تشکیل دے سکتا ہے اور وہ اس صورت میں تمام حاکم شرعی کے اختیارات رکھتا ہوگا، اور صرف ضروری اور امور حسبیہ میں منحصر نہیں ہوگا، وہ اسلامی معاشرہ کے تقاضوں کے تحت اسلامی قوانین کے تحت ولایت کو جاری کر سکتا ہے۔

جس وقت امام خمینی (رہ) نے اس نظریہ کو بیان کیا تو آپ کے شاگردوں نے حسن نیت اور آپ سے لگاؤ کی وجہ سے اس نظریہ کو قبول تو کر لیا لیکن ان کو دل سے یقین نہیں تھا کہ ایسا بھی زمانہ آئے گا یہاں تک کہ اس تحریک کا آغاز ہوا اور اہستہ اہستہ انقلاب آگیا، اور اسلامی حکومت کی تشکیل سے مذکورہ نظریہ عملی طور پر ظاہر ہو گیا۔

پس ”ولایت مطلقہ فقیہ“ یعنی وہ شخص جو اسلامی نظریہ کے مطابق حکومت کرنے کے شرائط رکھتا ہو، اور علم، تقویٰ اور معاشرہ کی رہبری کے سلسلہ میں امام معصوم (ع) سے زیادہ شباہت رکھتا ہو اور حکومت تشکیل دے، اور وہ معاشرہ کو ادارہ کرنے میں معصوم (ع) کے اختیارات رکھتا ہوگا اور جس وقت ولی فقیہ کے اس قدر وسیع اختیارات ہوں تو اس وقت ولی فقیہ کے تحت اسلامی حکومت کے تمام قوانین اور دستور العمل ولی فقیہ کی اجازت اور اس کے اذن سے مشروعیت (جواز) پیدا کرتے ہیں، اور ایک ایک کو براہ راست یا مستقل طور پر قانون گذاری کا حق نہیں ہوگا، اور نا ہی حکومتی قوانین کو جاری کرنے کا حق ہوگا، تمام حکومتی امور اسی کی اجازت سے قانونی ہونگے، اس کی حکومت میں قوانین کو جاری کرنے کا کوئی بھی عہدہ اسی کی طرف دیا جائے گا، یا اگر کسی خاص قانون کے ذریعہ اس کا انتخاب کیا جائے تو اس کو اسی وقت قانونیت ملے گی جب ولی فقیہ اس کی موافقت کر دے، لہذا چاہے قانون گذاری کا مسئلہ ہو یا قانون کو جاری کرنے کا مسئلہ جب تک ولی فقیہ کی اجازت نہ ہو تو کوئی بھی کام جائز نہیں ہے۔

جیسا کہ امام خمینی (رہ) مکرر ارشاد فرماتے تھے: ”اگر کوئی حکومت ولی فقیہ کی اجازت سے نہ ہو تو وہ طاغوت ہے۔“ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کی صرف دو قسمیں ہیں ایک حق کی حکومت اور دوسری طاغوت کی حکومت حق کی حکومت وہ حکومت ہے جس کی باگ ڈور ولی فقیہ کے ہاتھوں میں ہے اور حکومت کے تمام مسائل اسی کے ماتحت ہوں اور اسی کی اجازت سے مشروعیت پیدا کرتے ہیں، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو وہ حکومت باطل اور حکومت طاغوت ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَمَاذَا بَعَدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ﴾^(۵)

”اور حق کے بعد ضلالت کے سوا کچھ نہیں ہے“

۸۔ مقبولہ (روایت) عمر بن حنظلہ سے ولایت فقیہ

قارئین کرام! مذکورہ بیان کے مطابق، ولی فقیہ کے وسیع اختیارات قوانین شرع مقدس میں منحصر ہیں اور ان سے متجاوز نہیں ہونگے؛ کے پیش نظریہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ”ولایت مطلقہ فقیہ“ موجب شرک اور غیر خدا کو مطلق قرار دینا نہیں ہے؛ بلکہ اس کے برعکس ائمہ معصومین علیہم السلام سے نقل شدہ روایات کے مضمون کے لحاظ سے اگر کوئی شخص ولی فقیہ کے حکم اور فرمان کی نافرمانی کرے تو وہ مشرک ہے جیسا کہ عمر بن حنظلہ کی روایت میں موجود ہے:

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دو شیعہ افراد (جن میں دینی مسائل یا دنیوی مسائل اور میراث کے سلسلہ میں اختلاف تھا) کے بارے میں سوال کیا گیا کہ اپنے اختلافات کو دور کرنے اور اپنے فیصلہ کے لئے کس کی طرف رجوع کریں؟ تو امام علیہ

السلام نے ان کو ظالم اور طاغوت حاکم کی طرف رجوع کرنے سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ راویان حدیث اور دینی مسائل کے ماہر اور اہل فن کی طرف رجوع کریں، چنانچہ آپ ایک حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں:

”فَإِنِّي قَدْ جَعَلْتُهُ حَاكِمًا، فَإِذَا حَكَمَ بِحُكْمِنَا فَلَمْ يَقْبَلْهُ مِنْهُ فَإِنَّمَا اسْتَحَفَّ بِحُكْمِ اللَّهِ وَعَلَيْنَا رَدُّ، وَالرَّادُ عَلَيْنَا الرَّادُ عَلَى اللَّهِ وَهُوَ عَلَى حَدِّ الشِّرْكِ بِاللَّهِ“ (۶)

(میں اس (فقیہ اور دین میں ماہر شخص) کو تم پر حاکم قرار دیتا ہوں پس جس وقت وہ ہمارے حکم کے مطابق فیصلہ کرے اور کوئی اس کو قبول نہ کرے تو بے شک اس نے حکم خدا کو ہلکا قرار دیا ہے اور ہمارے حکم کو رد کیا ہے، ہمارے حکم کو رد کرنا خدا کے حکم کو رد کرنا ہے اور یہ خداوند عالم پر شرک کی حد ہے۔)

چنانچہ مذکورہ روایت کے پیش نظر اگر کسی جامع الشرائط فقہ نے حکومت تشکیل دی تو اگر کوئی شخص اس کی مخالفت کرے یا اس کے حکم کو رد کرے تو گویا اس نے ائمہ معصومین علیہم السلام کی مخالفت کی اور ان کی مخالفت خدا کے شرک کی حد تک ہے البتہ یہ شرک ربوبیت تکوینی میں شرک کی طرح نہیں ہے بلکہ ربوبیت تشریحی میں شرک ہے کیونکہ توحید کے اقسام و مراتب ہیں:

- ۱۔ توحید در خالقیت؛ یعنی خداوند عالم کی وحدانیت اور اس کی یکتائی کا اقرار کرنا۔

- ۲۔ توحید در الوہیت و عبودیت؛ یعنی خداوند عالم کے علاوہ رب اور مطلق قانون گزار نہ ہونے اور کسی کے لائق عبادت ہونے پر عقیدہ رکھنا۔

خود توحید ربوبی کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

۱۔ توحید ربوبیت تکوینی۔

۲۔ توحید ربوبیت تشریحی۔

”توحید در ربوبیت“ یعنی دونوں جہان کی تدبیر کو خداوند عالم سے مخصوص مانے اور اس بات پر عقیدہ رکھیں کہ گردش آفتاب و مہتاب، دن رات کا موجود ہونا، انسان و حیوانات کی موت و زندگی اور دیگر جاندار اشیاء کی حفاظت نیز دیگر حادثات خدا کی طرف سے ہوتے ہیں، وہی زمین و آسمان کی حفاظت کرتا ہے نیز اس وسیع و عرض دنیا میں جو چیز بھی پیدا ہوتی ہے، رشد کرتی ہے، اپنے بچے پیدا کرتی ہے اور پھر مر جاتی ہے یا کسی بھی طرح کے جو آثار رونما ہوتے ہیں وہ تمام کے تمام خداوند عالم کی تدبیر اور اس کے ارادہ کے تحت ہوتے ہیں، اور کوئی بھی واقعہ خداوند عالم کے دائرہ ربوبیت سے باہر نہیں ہے۔

”ربوبیت تشریحی“ صرف انسانوں کی اختیاری تدبیر سے متعلق ہوتی ہے برخلاف دوسری مخلوقات کے، کیونکہ انسان کی تمام حرکات و سکنات اور اس کی ترقی؛ اس کے اختیاری افعال کی بنا پر ہوتی ہے، کیونکہ خداوند عالم نے انسان کو راہ مستقیم کی ہدایت فرمائی ہے، اور اس کو خوب و بد کی پہچان کرا دی ہے، اور وہی انسان کی ذاتی اور اجتماعی زندگی میں قانون صادر فرماتا ہے۔

لہذا توحید اور اس کے اقسام کے بارے میں بیان شدہ مطالب کے پیش نظر اگر کوئی شخص توحید در خالقیت اور عبودیت نیز توحید ربوبیت تکوینی کو قبول کر لے لیکن اگر توحید ربوبیت تشریحی کو قبول نہ کرے تو وہ مشرک ہے، جس طرح سے حضرت شیطان بھی اسی شرک میں مبتلا ہوئے ہیں، کیونکہ شیطان خداوند عالم کی توحید در خالقیت کو قبول رکھتا تھا اسی طرح خداوند عالم کی توحید ربوبیت تکوینی کو بھی قبول رکھتا تھا، اسی وجہ سے اس نے کہا:

﴿ قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَا أَعْوَبِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴾^(۷)

”اس نے کہا پروردگار! جس طرح تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں ان بندوں کے لئے زمین میں ساز و سامان آراستہ کروں گا اور ان سب کو اکھٹا کروں گا۔“

قارئین کرام! جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ شیطان خداوند عالم کی تکوینی ربوبیت کا معتقد تھا، اور خداوند عالم کو اپنا پروردگار سمجھتا تھا، لیکن اس نے ربوبیت تشریحی کا انکار کیا اسی وجہ سے وہ مشرک ہو گیا جب خداوند عالم امام معصوم علیہ السلام کی اطاعت کو واجب قرار دیتا ہے تو اگر کوئی شخص اس کو نہ مانے اور اس (امام) کی اطاعت نہ کرے، تو اس نے خداوند عالم کی تشریحی ربوبیت کا انکار کیا ہے اور وہ تشریحی ربوبیت میں مشرک ہو گیا ہے اسی طرح اگر امام معصوم علیہ السلام کسی شخص کو اپنے طرف سے معین اور منصوب فرمائیں اور اس کی اطاعت دوسروں پر واجب قرار دیں تو اگر کوئی اس کو نہ مانے اور امام معصوم علیہ السلام کو تسلیم نہ کرے تو وہ بھی تشریحی ربوبیت میں شرک کا مرتکب ہوا ہے لہذا اگر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرمائیں: ولی فقیہ کی مخالفت ”علی حد الشکر باسہ“ (خدا پر حد شرک ہے)؛ تو امام نے کوئی مبالغہ نہیں کیا ہے اور حقیقت کو بیان فرمایا ہے، لیکن خالقیت یا تکوینی ربوبیت میں شرک نہیں؛ بلکہ اس کا شرک شیطان کی طرح تشریحی ربوبیت میں ہے۔

مذکورہ باتوں کے پیش نظر اسلامی نظریہ کے مطابق اسلامی حکومت کے مختلف مراتب ہیں اس حکومت کا بلند ترین نمونہ اس وقت وجود میں آسکتا ہے جب اس حکومت کی باگ ڈور پیغمبر یا امام معصوم علیہ السلام کے ہاتھ میں ہو اس سے کم مرتبہ کی حکومت وہ حکومت ہے جو جامع شرائط فقیہ کے ذریعہ تشکیل پاتی ہے، جو علم و عمل اور معاشرہ کی مدیریت کے لحاظ سے امام معصوم (ع) سے زیادہ شبہات رکھتا ہے اس سے کم مرتبہ والی حکومت کا بھی تصور پایا جاتا ہے (جیسا کہ فقہاء نے اپنی اپنی کتابوں میں اس بارے میں بھی بیان کیا ہے) اور وہ یہ ہے کہ اگر جامع شرائط فقیہ موجود نہ ہو یا اگر موجود ہے لیکن معاشرہ کی رہبری کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس وقت ولایت و حکومت عادل مومنین کے حوالے کی جائے گی؛ کیونکہ معاشرہ کو اس کے حال پر نہیں چھوڑا جاسکتا، اور اس کے لئے حکومت تشکیل نہ دی جائے لہذا طے یہ ہوا کہ اگر امام معصوم علیہ السلام حاضر ہوں تو ان کی حکومت ولایت بہتر میں اور مطلوب حکومت ہے، لیکن اگر امام معصوم (ع) حاضر نہ ہوں تو پھر وہ جامع شرائط فقیہ جو امام معصوم (ع) سے زیادہ شبہات رکھتا ہے اس کی حکومت ہونا چاہئے، لیکن اگر جامع شرائط فقیہ بھی موجود نہ ہو تو پھر ایسے عادل مومن کی حکومت ہو

جس کا تقویٰ اور عدالت اس حد تک ہو جس پر عوام الناس اعتماد کریں، اور اس کے احکام جاری کرنے پر راضی ہوں اگرچہ اس کا علم فقیہ کی حد تک نہ ہو۔

اگرچہ ہمارا نظریہ یہ ہے کہ ہمیشہ معاشرہ میں ایسے علماء، فقہاء اور بزرگان رہے ہیں جو معاشرہ کی رہبری اور مدیریت کی صلاحیت رکھتے ہیں، تاکہ معاشرہ کی رہبری کی عظیم ذمہ داری کا بار اپنے شانوں پر اٹھائیں، جیسا کہ خداوند عالم نے ہم پر احسان کیا کہ اس نے حضرت امام خمینی (رہ) جیسی عظیم نعمت سے سرفراز کیا، تاکہ معاشرہ کی بہترین طریقہ سے رہبری کریں، اور ان کے بعد ایسے شخص کا ذخیرہ کیا جو امام خمینی (رہ) کا خاص شاگرد اور ان کا خلف صالح ہے، جس میں زہد و تقویٰ، سیاسی فکر، مصالح مومنین کی رعایت، اسلامی معاشرہ کی رہبری اور مدیریت نیز دیگر مہم صفات میں امام خمینی (رہ) سے زیادہ مشابہ اور نزدیک ہے۔

۹۔ اسلام کی نظر میں تکلیک توا (قدرت کا جدا جدا ہونا) کا جائزہ

دوسری وہ چیز جس پر ہم نے زیادہ اشارہ کیا ہے اور کہ اس پر مزید روشنی ڈالنا مناسب ہے وہ تکلیک توا (قدرت کا جدا جدا ہونا) اور حکومتی ذمہ داریوں کی تقسیم ہے جیسا کہ آپ حضرات نے ملاحظہ فرمایا کہ اسلامی نقطہ نظر سے حکومت کی ایسی کوئی خاص شکل و صورت نہیں ہے جو مخصوص شرائط یا کسی خاص معاشرہ سے مخصوص ہو اسلام کے لحاظ سے حکومت ایسی بھی ہو سکتی ہے جس میں فقط چند خاندان شامل ہوں، یا بھت زیادہ آبادی والے ملک میں بھی حکومت ہو سکتی ہے، بلکہ عالمی معاشرہ کے لئے بھی حکومت ہو سکتی ہے ظاہر سی بات ہے کہ حکومت کی مخصوص ذمہ داریاں اور وظائف جن سے حکومت کا وجودی فلسفہ ظاہر ہوتا ہے (خصوصاً زیادہ آبادی والے ملک میں) تو یہ ذمہ داریاں ایک یا دو افراد کے بس کی بات نہیں ہیں۔

اندرونی امنیت، بیرونی دشمن سے مقابلہ، اقتصادی کارکردگی پر نظارت، بین الاقوامی امور پر نظارت، بین الاقوامی تعلقات کو طے کرنا نیز معاشرہ کی دوسری ضرورتیں اور ان سب میں مہم اسلامی شعار کو اقامہ کرنا، احکام اسلامی کے جاری ہونے پر نظارت اور ان کی حفاظت وغیرہ وغیرہ جیسی مہم ذمہ داریاں حکومت کے ذمہ ہوتی ہیں جن کے تحت ان کے لئے کام تقسیم ہونا چاہئے یہ تقسیم کار دو محور میں انجام پاتی ہے، ایک عمودی (طولی) اور دوسرا افقی (عرضی)؛ یعنی حکومتی کارکردگی کے یہ دونوں حصے ساق مثلث کے دو خطوں کو تشکیل دیتے ہیں، جو وسط سے ایک دوسرے کے راستہ کو نہیں کاٹتے، اور آخر میں ”راس ہرم“ (مرکزی نقطہ) پر پہنچ جاتے ہیں، سادہ الفاظ میں حکومت کو ہرم کے مانند سمجھیں، جیسا کہ سیاست دانوں نے اس شبہاہت کی بنا پر حکومت کو ”ہرم قدرت“ سے تعبیر کیا ہے، جس میں ایک مرکزی نقطہ ہوتا ہے اور اسی کے تحت ہرم ہوتی ہے، اسی طرح حکومت کی مرکزی قدرت ایک شخص کے پاس ہوتی ہے جس کے تحت تمام ادارے کام کرتے ہیں

جس وقت ہم حکومت کے عام معنی تصور کریں تو قدرت کا ہر ایک رخ حکومت کے وظائف کو تشکیل دیتا ہے ”مانٹسکیو“ کے زمانہ سے فلسفہ حقوق اور سیاست میں حکومتی قدرت کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: قوہ مقننہ (پارلیمنٹ) قوہ قضائہ (قضاوت و عدالت) اور قوہ مجریہ (قوانین کو جاری کرنے والی طاقت جو حکومت کی شکل میں دکھائی دیتی ہے)، حکومت کا ایک رخ قانون گذاری ہوتی ہے دوسرا رخ قضاوت (عدالت) اور تیسرا رخ قوانین کو جاری کرنا ہوتا ہے حکومت کی کارکردگی کا ایک حصہ کلی اور جزئی قوانین و مقررات بنانا ہوتا ہے اور دوسرا حصہ عوام الناس کے اختلافات اور جھگڑوں کے فیصلے کرتا ہے، اور تیسرا حصہ معاشرہ میں قوانین کو جاری کرتا ہے۔

۱۰۔ طاقت کے ایک ساتھ ہونے کا سبب

اگرچہ حکومتی کارکردگی اور اس کی قدرت کی مذکورہ تقسیم مناسب اور بجا ہے، لیکن اس بات پر بھی توجہ رکھنا ضروری ہے کہ ان تینوں حصوں کے درمیان خط کھینچنا آسان کام نہیں ہے یعنی یہ بات عملی طور پر ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم عام طور پر قوانین و مقررات اور آئین ناموں اور ان کے جاری کرنے کو جدا جدا کریں اور قوہ مجریہ کو بالکل کسی بھی طرح کے قوانین نہ بنانے کی اجازت نہ دیں، آج کل ان تمام ہی ممالک میں جن میں ڈیموکریسی سسٹم ہوتا ہے قدرت کی تقسیم کو قبول کیا گیا ہے، اور ان میں خواہ نا خواہ بعض چیزوں میں قانون گذاری اور ان کو جاری کرنے کے سلسلہ میں اختلاط (مخلوط ہونا) پایا جاتا ہے، جس کی سب سے واضح مثال کا پارلیمنٹ نظام میں مشاہدہ کیا جاتا ہے، کیونکہ ڈیموکریٹک نظام پارلیمنٹ اور ریاستی نظام کی طرف تقسیم ہوتا ہے۔

۱۔ پارلیمنٹی نظام

جو قدرت کے یکجا ہونے کی بنیاد پر ہوتا ہے، یعنی تمام تر قدرت پارلیمنٹ کے تحت ہوتی ہے جب عوام الناس کے ووٹوں سے مختلف پارٹیوں سے ممبران منتخب ہوتے ہیں تو ان کے ذریعہ پارلیمنٹ بنتا ہے، اور اسی میں سے مختلف وزیر اور وزیر اعظم بنائے جاتے ہیں، اور تمام بڑے بڑے عہدے اسی پارلیمنٹ کے ممبران میں سے ہوتے ہیں اس نظام میں پارلیمنٹ کی طرف سے مختلف وزراء کو مختلف اداروں کی ذمہ داری دی جاتی ہے، اور یہی پارلیمنٹ وزراء کو معزول بھی کر سکتا ہے۔

۲۔ ریاستی نظام

جس میں قدرت جدا جدا تقسیم ہوتی ہے اس نظام میں صدر مملکت پارلیمنٹ کی طرف سے انتخاب نہیں ہوتا اور وزراء صدر مملکت کی طرف سے منصوب ہوتے ہیں، اور پارلیمنٹ ان کو معزول نہیں کر سکتا، درمقابل پارلیمنٹ بھی قوہ مجریہ سے مستقل

اور جدا ہوتا ہے اس سسٹم میں ممبر آف پارلیمنٹ اور وزراء کابینٹ " Cabinet " میں ذاتی اور مانعۃ الجمع اختلاف ہوتا ہے یعنی صدر مملکت ممبر آف پارلیمنٹ میں سے وزیر نہیں بنا سکتا مگر اس وزیر کو جس نے پارلیمنٹ کی ممبری شپ سے استعفاء دیدیا ہو۔

ریاستی حکومت میں صدر مملکت براہ راست عوام الناس کے ذریعہ انتخاب ہوتا ہے اور اس میں ایک طرح طاقت کے دخل کا مشاہدہ ہوتا ہے، اور بعض قوانین و مقررات کو طے کرنا وزراء کابینٹ کی ذمہ داری ہوتی ہے آج کل ہمارے ملک میں بھت سی اجتماعی اور اقتصادی کارکردگی کے لئے حکومت کے قوانین کافی ہوتے ہیں؛ یعنی حکومتی کابینٹ کا جلسہ ہوتا ہے اور صلاح مشورہ کے بعد قوانین تصویب کئے جاتے ہیں، اور خود ان کو جاری بھی کرتی ہے لہذا بعض قوانین بنانے میں حکومت کو اجازت ہوتی ہے۔ دوسری طرف اگرچہ پارلیمنٹ کا کام قوانین بنانا ہوتا ہے لیکن بعض اجرائی کاموں کو بھی انجام دیتی ہے: مثال کے طور پر بیرونی کسپنیوں سے معاہدہ (اگریمنٹ) کرنا ایک اجرائی کام ہے اور قاعدہ کے مطابق حکومت کو کرنا چاہئے لیکن چونکہ یہ مسئلہ بھت مہم اور بنیادی ہے لہذا اس سلسلہ میں تمام پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے احتیاط کے ساتھ ضروری تحقیق و جائزہ کے بعد یہ قدم اٹھایا جاتا ہے تاکہ اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جاسکے، اور حکومت میں اس طرح کے معاہدہ کو بیان کرنے کے بعد ضروری تحقیق و بررسی کر کے پارلیمنٹ کے حوالے کیا جاتا ہے، اور جب پارلیمنٹ اس کی تائید کر دیتا ہے تو اس پر عمل درآمد ہوتا ہے۔

المختصر تکلیک قوا (قدرت کا جدا جدا ہونا) کا نظریہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ تینوں طاقتیں ایک دوسرے سے مستقل اور جدا ہوں، لیکن عملی میدان میں دنیا کے مختلف نظام میں بعض امور کے سلسلہ میں ان قوتوں میں اختلاط پایا جاتا ہے، البتہ یہ قدرتیں جس قدر بھی ایک دوسرے سے جدا جدا رہیں اور ہر قدرت ایک دوسرے سے مستقل ہوں تو پھر ایک دوسرے میں دخالت اور ناجائز فائدہ اٹھانے کا امکان کم پایا جاتا ہے۔

حوالے:

(۱) الیگارہی اس نظام حکومت کو کہتے ہیں جس میں مقتدر لوگوں کی حاکمیت ہوتی ہے

(۲) عمراء اور بادشاہوں کی حکومت جو نسلاً بعد نسل چلتی رہتی ہے

(۳) سورہ نساء آیت ۵۹

(۴) سورہ حشر آیت ۷

(٥) سورہ یونس آیت ٣٢

(٦) وسائل الشیخ ج ١ ص ٤٣

(٧) سورہ حجر آیت ٣٩

اکیسواں جلسہ

تفلیک قوا (قدرتوں کی جدائی) کے نظریہ کی تحقیق اور اس پر نقد و تنقید

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

جیسا کہ ہم نے گذشتہ جلسات میں عرض کیا کہ اسلامی حکومت کے بھت سے وظائف اور ذمہ داریاں ہوتی ہیں جن کی بنا پر اسلامی حکومت کا فلسفہ وجودی سمجھ میں آتا ہے وہ وظائف اور ذمہ داریاں جن کی اسلامی حکومت عہدہ دار ہوتی ہے ان کے لئے کچھ خاص اختیارات بھی ہونا ضروری ہیں جن کے تحت وہ اپنے وظائف اور ذمہ داریوں کو پورا کر سکتی ہے بھر حال تمام ہی حکومتوں بالخصوص اسلامی حکومت کی خاص ذمہ داریوں کی وجہ سے کاموں کی تقسیم بندی ہوتی ہے جو مہارت، لیاقت اور ذمہ داری کی قسم کی بنا پر عہدہ داران کو دی جاتی ہے بے شک یہ کاموں اور قدرتوں کی تقسیم ایک ضروری چیز ہے، کیونکہ اگر ایک محدود مقام جیسے کسی گاؤں وغیرہ کی حکومت کا مسئلہ ہوتا تو اس وقت کاموں کی تقسیم اتنی زیادہ ضروری نہ ہوتی لیکن چونکہ اسلامی حکومت ایک خاص علاقے سے مخصوص نہیں ہے لہذا اکثر موارد میں قدرتوں کی تقسیم نہایت ضروری ہے۔

اور چونکہ اسلامی حکومتی نظریہ پوری دنیا اور تمام زمانوں کے لئے ہے، لہذا اس کے لئے ایک ایسا نقشہ مرتب کیا گیا ہے جو عالمی اور دائمی ہے، اور کسی خاص علاقے اور خاص زمانہ سے مخصوص نہیں ہے، اسی وجہ سے اس کے لئے ایسے قوانین کا انتخاب کیا گیا ہے جو مختلف زمانہ اور مختلف مقامات کے لئے جاری ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں؛ بے شک کاموں اور قدرت کی تقسیم انہیں قوانین کے تحت ہوتی ہے۔

۲۔ تفلیک قوا (قدرتوں کی جدائی) کے نظریہ کی تاریخی حیثیت

قارئین کرام! جیسا کہ ہم نے گذشتہ جلسہ میں عرض کیا کہ حکومتی نظام کا ایک ہرم (وسیئہ اور طاقت) کی طرح تصور کیا جاسکتا ہے، جو مختلف شکلوں اور صورتوں سے تشکیل پاتا ہے، لیکن ان شکلوں کی تعداد تقریباً معاہدہ کے طور پر ہوتی ہیں چنانچہ حکومت کی یہ شکل قدیم زمانہ سے چلتی آرہی ہے، یونانی فلاسفہ منجملہ ”ارسطو“ کے زمانے سے حکومت کی یہی تین چھڑے والی تصویر پیش کی گئی ہے ان میں سے ایک چھڑہ ان لوگوں سے مخصوص ہوتا ہے جو معاشرہ کے صاحب عقل و خرد ہوتے ہیں، اور حکومت کے اس حصے کو (جسے آج کل ”قانون گذاری پاور“ (ممبر آف پارلیمنٹ) کا نام دیا جاتا ہے)؛ وہ لوگ تشکیل دیتے ہیں جو اپنی عقل و فکر کو

جروئے کار لاتے ہوئے معاشرہ کے نظام کے لئے ضروری قوانین مرتب کرتے ہیں اسی طرح ارسطو کے کلام میں دوسرے دو چھروں کا بھی تذکرہ ہے جو قوہ مجریہ (حکومت) اور قوہ قضائہ (عدل) پر منطبق ہوتی ہیں، اور وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ معاشرہ کے حکام اور اس کو چلانے والے۔

۲۔ عوام الناس کے فیصلے کرنے والے افراد۔

اسی طرح ان آخری صدیوں میں مغربی سیاست داں افراد نے بھی حکومت کے تین چھروں والا نظریہ پیش کیا ہے چنانچہ ان کے آخر میں ”مونٹسکیو“ نے بھی تفکیک قوا کے نظریہ کے تحت حکومت کو درج ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا ہے: قانون گذاری، عدلیہ، اور قوہ مجریہ، اور اسی وجہ سے اس نے ”روح القوانین“ نامی کتاب لکھی، جس میں ہر ایک قدرت کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے ”مونٹسکیو“ کی علمی اور نئے نظریات کے سلسلہ میں کی گئی کوشش کی وجہ سے تفکیک قوا کا مسئلہ اسی وقت سے مشہور ہو گیا یہاں تک کہ آج بعض لوگ اسی کو اس تھیوری کا مخترک کہتے ہیں۔

آج کل اکثر ممالک منجملہ ہمارے ملک میں بھی بنیادی قوانین اسی نظریہ کے تحت بنائے جاتے ہیں، اور تینوں طاقتوں کو استقلال اور ڈیموکریسی کے اصول میں شمار کرتے ہیں بین الملل (عالمی سطح) پر اسی ملک کو ڈیموکریٹک کہا جاتا ہے جس میں یہ تینوں طاقتیں ایک دوسرے سے الگ الگ اور مستقل ہوں اور ایک دوسرے پر مسلط نہ ہوں۔

۳۔ تفکیک قوا نظریہ کے دلائل پر ایک نظر

۱۔ چونکہ حکومت کی مختلف اور پیچیدہ ذمہ داریاں ہوتی ہیں جن کے سبب ان کے بارے میں کافی معلومات اور خاص مہارت کی ضرورت ہوتی ہے لہذا یہ سب کام ایک شخص سے نہیں ہو سکتا لہذا انہیں پیچیدگیوں کے پیش نظر کام اور قدرت کی تقسیم ضروری ہے اور چونکہ حکومت کی مختلف ذمہ داریاں ہوتی ہیں لہذا ان میں اختلاف اور ایک دوسرے کا مخالف ہونا بھی ممکن ہے تو اس صورت میں حکومت کے اسی خاص پھرے کے لحاظ سے عہدہ داروں کا بھی انتخاب ہوتا ہے اسی بنا پر حکومت کی تینوں طاقتیں تقسیم ہوتی ہیں اور انہیں کے تحت تمام حکومتی امور انجام پاتے ہیں، البتہ اس کی زیادہ تر فعالیت قوہ مجریہ کے تحت ہوتی ہیں: مثلاً جنگ اور دفاع سے متعلق مسائل، معاشرہ کے مستضعف اور کمزور لوگوں کی امداد کرنا، تعلیم و تربیت کا نظام اور علاج و معالجہ سسٹم وغیرہ یہ تمام محکمت قوہ مجریہ کے تحت ہوتے ہیں جبکہ عدلیہ کا کام صرف عوام الناس کے اختلافات اور جھگڑوں کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے، اور قانون گزار پاور (پارلیمنٹ) کا کام فقط قوانین بنانا ہوتا ہے، اس کے علاوہ دوسرے مخصوص کام نیز معاشرہ اور ملک کی دوسری ضرورتوں کا پورا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

قوہ مجریہ کی عظیم اور وسیع ذمہ داریوں کے پیش نظر ہو سکتا ہے اس کو عدلیہ اور پارلیمنٹ کے برابر رکھ دیا جائے اور اس کو ایک قدرت کا نام دیدیا جائے لیکن خود حکومت کا ایک پہلو نہیں ہوتا بلکہ مختلف ذمہ داریوں اور وظائف کی بنا پر اس کے ایک سے زیادہ پہلو ہوتے ہیں اور اس قدرت کی تقسیم کی بنا پر ہر ایک محکمہ پر ایک قدرت کا اطلاق ہو سکتا ہے، اس صورت میں اس کے بھت سے پہلو دکھائی دے سکتے ہیں، اور اس کے، تحت ہر وزارت خانہ اس کے ایک پہلو کو تشکیل دیتا ہے۔

بھر حال حکومتی نظام کی مختلف ذمہ داریوں کی بنا پر قدرت کی جو تین قسمیں کی گئی ہے، اور اس تقسیم کو آج کی دنیائے سیاست نے بھی قبول کیا ہے اور وہ ایک معاہدہ کے عنوان سے مشہور ہے، لہذا اس تقسیم میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

قارئین کرام! یہاں پر ایک سوال یہ باقی رہتا ہے کہ کیا حکومت کی مختلف ذمہ داریوں کا ہونا اس تقسیم اور استقلال کے لئے کافی ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ مختلف ذمہ داریوں کا ہونا صرف تفکیک قوا پر ایک توجیہ تو ہو سکتی ہے لیکن اس کو اس سلسلہ میں علت تامہ (مکمل طور پر علت) قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ جب ہم قوہ مجریہ کو دیکھتے ہیں تو اس میں بھی مختلف ذمہ داریاں ہوتی ہیں جن میں آپس میں زیادہ تعلق بھی نہیں ہوتا؛ مثلاً جنگ اور دفاع کا مسئلہ، میڈیکل وغیرہ لیکن اس کے بعد بھی یہ تمام چیزیں قوہ مجریہ کے تحت ہوتی ہیں اور اگر ذمہ داریوں کے مختلف ہونے ہی کو قدرت کے زیادہ ہونے کا سبب قرار دیں تو پھر دسیوں مستقل قدرتیں ہونا چاہئیں تھیں۔

۲۔ تفکیک قوا اور تکونی تقسیم کی مہم ترین دلیل اور توجیہ وہی ہو جس کی بنا پر مونٹسکیو نے تفکیک قوا کا یہ نظریہ پیش کیا ہے: چونکہ انسانی فطرت میں ایک دوسرے پر سلطنت اور ظلم کی طرف جھکاؤ پایا جاتا ہے، اور اگر تینوں طاقتیں ایک شخص یا ایک گروہ کے تحت ہوتیں تو پھر اس (حکومت) سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے زیادہ امکانات پائے جاتے، کیونکہ اس صورت میں وہی گروہ قانون گزار بھی ہے اور فیصلے کرنے کی ذمہ داری بھی اسی کی ہے اور قوانین کو جاری کرنے کا عہدہ بھی اسی کے پاس ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ ہر انسان اپنے مفاد میں قانون بناتا ہے اور پھر اپنے ہی حق میں فیصلے کرتا ہے، اس طرف سے قوانین کو جاری کرنے کی ذمہ داری بھی اسی کی ہے لہذا ناجائز فائدہ اٹھانے کے بھت سے راستے ہموار ہو جاتے اسی بنا پر مونٹسکیو کا ماننا تھا کہ راہ اعتدال کو برقرار رکھنے اور ظلم و جور سے روک تھام اور ناجائز فائدہ اٹھانے سے روکنے کے لئے تینوں قدرتوں کا الگ الگ ہونا ضروری ہے۔

قارئین کرام! گذشتہ مطالب کے پیش نظریہ بات معلوم ہو گئی کہ قدرتوں کا مستقل ہونا اس لئے ضروری ہے، کہ ناجائز فائدہ اٹھانے کا سدباب ہو جائے خصوصاً قوہ مجریہ کے لئے جو جب عدلیہ بالکل مستقل ہو تو پھر سب کے فیصلے قوانین کے تحت ہوں گے، اور کوئی بھی سزا سے نہیں بچ سکتا، اور تمام ہی افراد عدلیہ کے مقابلہ میں جواب دہ ہوں گے، کیونکہ اس صورت میں عدلیہ بڑے سے بڑے حکومتی عہدہ دار کو عدالت کے کٹھیرے میں کھڑا کر سکتی ہے، اور اگر انہوں نے قوانین کی خلاف ورزی کی ہے تو اس کو سزا دے سکتی ہے اسی طرح اگر قانون گزار طاقت (پارلیمنٹ) نے اسلامی قوانین کی مخالفت کی ہے تو اس صورت میں

عدلیہ ان کے خلاف کارروائی کر سکتی ہے اسی طرح اگر قانون گزار طاقت مستقل ہوگی تو وہ (بھی) قانون گذاری کے سلسلہ میں کسی (عدلیہ اور حکومت) سے متاثر ہو کر قانون نہیں بنائے گی اور ممبر آف پارلیمنٹ قوانین بناتے وقت مکمل طور پر مستقل اور آزادی کے ساتھ قوانین بنائیں گے اور کسی بھی طاقت کے تحت متاثر قرار نہیں پائیں گے، اور دوسرے سے وابستہ ہونے کا احساس بھی نہیں کریں گے۔

۳۔ تفلیک قوا کو بالکل محدود کرنا ناممکن

سیاست داں حضرات نے ڈیموکریسی کے لئے تینوں طاقتوں کو مستقل ہونا شرط قرار دیا ہے، البتہ یہ استقلال عملی طور پر حاصل ہونا چاہئے اور نظریہ کے لحاظ سے بھی، کیونکہ ہو سکتا ہے کوئی نظام تفلیک قوا کے نظریہ کے تحت ہو اور یہ تصور کیا جائے کہ تینوں طاقتیں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں، اور کسی ایک طاقت سے بھی متاثر نہیں ہے لیکن عملی میدان میں ایک طاقت دوسری طاقت پر تجاوز کر جائے اور اپنے حکمرانی چلانے کی کوشش کرے۔

اگر ہم دنیا بھر کی ڈیموکریسی حکومتوں پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ بھت ہی کم ایسی حکومتیں ہیں جن میں تینوں طاقتیں ایک دوسرے سے مکمل طور پر الگ الگ ہوں، مثلاً عدلیہ اور پارلیمنٹ؛ حکومت سے متاثر نہ ہوں اور یہ تو ظاہر سی بات ہے کہ جب عدلیہ کے تمام اخراجات حکومت کے ہاتھ میں ہوں اور انتخابات حکومت کے ذریعہ انجام پاتے ہوں تو پھر بھت ممکن ہے کہ حکومت چند پارٹیوں کے مقابلہ میں اسی طرح اپنی حکومت کو برقرار رکھے؛ اور جب حکومت اس کے ہاتھ میں ہوگی تو دوسری طاقتیں بھی اسی کے اختیار میں ہوں گی۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا بھر کی مختلف حکومتوں میں حکومت کے عہدہ دار افراد کبھی علی الاعلان اور کبھی مخفی طور پر دوسری حکومتوں میں دخالت کرتے ہیں اور ان پر زور دیتے ہیں، خصوصاً وہ ممالک جن میں پارلیمنٹی نظام ہوتا ہے اور پارلیمنٹ کے ذریعہ ہی حکومتیں عہدہ داروں کا انتخاب کرتی ہیں، یعنی ممبر آف پارلیمنٹ براہ راست عوام الناس کے ذریعہ چنے جاتے ہیں اور پھر یہی ممبر اپنی اکثریت سے حکومت کے لئے عہدہ داروں کا انتخاب کرتے ہیں۔

اسی طرح ریاستی نظام جن میں صدر مملکت کا انتخاب خود عوام الناس کرتی ہے اور اجرائی قدرت صدر مملکت کے اختیار میں ہوتی ہے؛ ان میں حکومت پارلیمنٹ اور عدلیہ میں دخالت کرتی ہے، خصوصاً بھت سے وہ ممالک جن میں صدر مملکت کو وٹو "Veto" کا حق ہوتا ہے، اور وہ پارلیمنٹ کے قوانین کو بے اثر کر سکتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ پارلیمنٹ باید و شاید طور پر اپنے نظریہ کو حکومت پر لاگو نہیں کر سکتا، ممبر آف پارلیمنٹ قوانین بناتے ہیں، اپنی بحث و گفتگو کے بعد اکثریت سے کسی قانون کو

پاس کرتے ہیں، لیکن چونکہ خود بنیادی قوانین نے صدر مملکت کو وٹو کا حق دیا ہے لہذا ان کے بنائے ہوئے قوانین بے اثر ہو جاتے ہیں۔

ہماری نظر میں کوئی ایسا ملک نہیں ہے جس میں تینوں طاقتیں ایک دوسرے سے مستقل ہوں، اور کسی ایک طاقت کے تحت تاثیر نہ ہوں اور ایک دوسرے میں کسی طرح کی کوئی دخالت نہ کرتی ہوں، خصوصاً قوہ مجریہ جو دوسری طاقتوں پر زیادہ نفوذ رکھتی ہے، فقط بنیادی قوانین میں استقلال کے نام سے موجود ہے جبکہ حقیقت میں تینوں طاقتیں مستقل اور ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے، بلکہ حکومت ان پر مسلط ہوتی ہے۔

اور چونکہ تینوں طاقتیں ایک دوسرے میں دخالت کرتی ہیں لہذا ان تینوں طاقتوں کے کام کے درمیان ایک ثابت حد بندی معین کرنا واقعاً مشکل ہے جیسے قانون گذاری والے مسائل ہوں یا قوانین جاری کرنے والے مسائل یا اس کے برعکس، یعنی اجرائی مسائل کو قانون گذاری کے حوالے سے جدا کرنا مشکل ہے ہم خود اپنے ملک میں اور دوسرے ممالک میں یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مسائل جو قانون گذاری کا پہلو رکھتے ہیں لیکن وہ (بھی) حکومت کے ذمہ ہیں مثال کے طور پر بنیادی قوانین کے تحت بعض قوانین حکومتی کابینٹ کے سپرد کئے جاتے ہیں جن کو طے کر کے جاری کیا جاتا ہے اگرچہ ان قوانین پر اسپیکر کے دستخط ہونا (بھی) ضروری ہوتے ہیں، لیکن کبھی کبھی صرف ان قوانین کا پارلیمنٹ میں بھیج دینا ہی کافی ہوتا ہے بعض حکومتوں میں اسپیکر کے دستخط کرنا یا پارلیمنٹ میں بھیجنا ضروری بھی نہیں ہوتا، بلکہ خود حکومتی کابینٹ میں پاس ہونے سے وہ قانونی شکل اختیار کر لیتے ہیں، اور ان کو نافذ کر دیا جاتا ہے لیکن وہ موارد میں جن میں اسپیکر کے دستخط اور اس کا تائید کرنا ضروری ہوتا ہے، ان میں (بھی) دستخط اور تائید کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی اور صرف دکھاوٹی پہلو ہوتا ہے کیونکہ حکومتی کابینٹ کوئی بھی قانون بنا دے تو پھر اسپیکر کو اس پر دستخط کرنا ہی ہوتا ہے اور اگر یہ فرض کر لیں کہ اسپیکر کے دستخط دکھاوے کے طور پر نہیں ہیں تو کیا اسپیکر کے دستخط کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس قانون کو ممبر آف پارلیمنٹ نے بنایا ہے؟!

بھر حال بعض ایسے مسائل جو قانون گذاری کے پہلو رکھتے ہیں اور ان پر بحث و گفتگو کے ذریعہ ان کو پاس کرنا پارلیمنٹ کے ذمہ ہوتا ہے، لیکن ان کی فوری طور پر ضرورت ہے اور اگر وہ فوراً تصویب نہ ہوئے تو معاشرہ میں خلل پیش آجائے گا تو اس صورت میں خود حکومتی کابینٹ کو اس طرح کے قوانین بنانے کا حق دیا جاتا ہے دوسری طرف بعض وہ مسائل جو اجرائی پہلو رکھتے ہیں لیکن ان کی اہمیت کے پیش نظر بنیادی قوانین ان کو جاری کرنے کے لئے پارلیمنٹ کو مصوب کرنے اور اس کی تائید کرنے کی شرط کرتا ہے مثلاً جنگ، اقتصاد اور تیل وغیرہ کے سلسلہ میں بیرونی کمپنیوں سے معاہدہ کرنا یہ سب کام اجرائی پہلو رکھتے ہیں لیکن بنیادی قوانین کے مطابق پارلیمنٹ کا پاس کرنا ضروری ہے قارئین کرام! ہمارا مقصد یہ ہے کہ تھیوری اور نظری لحاظ سے پارلیمنٹ اور قوہ مجریہ کے وظائف میں مکمل طور سے جدائی کرنا صحیح اور منطقی نہیں ہے۔

حکومتی نظام میں پارلیمنٹ اور قانون گزار مجلس کے علاوہ دوسری شوری اور مجالس بھی ہوتی ہیں جن کا کام بھی ایک طرح سے قانون گذاری ہوتا ہے مثال کے طور پر ہمارے ملک میں ”شوری انقلاب فرہنگی“ بھی بعض چیزوں کو تصویب کرتی ہے جن کو قانون کی جگہ سمجھا جاتا ہے، اور ان قوانین کی شکل ایسی ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ شوری اسلامی مجلس اور ممبر آف پارلیمنٹ کے ذریعہ تصویب ہو جاتے ہیں، لیکن ہمارے ملکی نظام کے ثقافتی اہمیت کی خاطر اور ثقافتی سلسلہ میں سیاست اور طریقہ کار کو طے کرنے کی ذمہ داری ان افراد پر ہوتی ہے جو اس سلسلہ میں کافی تجربہ اور مہارت رکھتے ہوں اسی طرح بعض دوسرے مخصوص ادارے ہوتے ہیں جن کا شمار قوہ مجریہ میں ہوتا ہے، اور قانون کو جاری کرنے والوں کی طرح تصیم گیری کرتے ہیں اور قانون گذاری پہلو نہیں رکھتے، مثلاً ”شوری عالی امنیت“ اور ”شوری عالی اقتصاد“ جو اس سلسلہ کے ماہرین افراد پر مشتمل ہوتی ہیں، جن کی مہارت اور دقت عقلی دوسری کی نسبت زیادہ ہوتی ہے جو ملک کے اہم اور اسٹریٹیجک "Strate'gique" مسائل میں اپنی دقت اور ظرافت کے ساتھ عمل کرتی ہے۔

قارئین کرام! ہماری گذشتہ باتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تینوں طاقتوں کا مکمل طریقہ سے مستقل اور الگ الگ ہونا چاہیے تھیوری "Theory" کے لحاظ سے ہویا عملی (پریکٹیکل) "Practical" اعتبار سے ایک مشکل کام ہے، خصوصاً حکومت کے مخصوص کاموں کا پارلیمنٹ کی ذمہ داریوں سے الگ کرنا لیکن جیسا کہ دیکھنے میں آتا ہے کہ یہ طاقتیں ایک دوسرے میں دخالت کرتی ہیں، خصوصاً بھت سے ملکوں میں حکومت؛ پارلیمنٹ اور عدلیہ میں دخالت کرتی ہے اسی وجہ سے اس طرح کی مداخلت سے روک تھام کے لئے ایک طریقہ سے معاہدہ کرنا ضروری ہے۔

۵۔ تینوں طاقتوں پر ایک ناظر اور ہم اہنگ کرنے والی طاقت کی ضرورت

قارئین کرام! دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر درحقیقت تینوں طاقتوں میں مطلق اور مکمل طور جدائی ہو جائے اور ہم پارلیمنٹ کو مستقل طور پر دیکھنا چاہیں جو دوسری دونوں طاقتوں سے کوئی بھی عہدا دار کا رابطہ نہ رکھتا ہو، اسی طرح قوہ مجریہ یا عدلیہ کو مستقل طور پر دیکھنا چاہیں اور اس تقسیم میں تھیوری اور پریکٹیکل طور پر کسی طرح کی کوئی مشکل پیش نہ آئے تو ملک کی ترقی کے سلسلہ میں پیش آنے والے اہم امور میں بھت بڑی مشکل میں پھنس جائیں گے، اور وہ مشکل یہ ہوگی کہ حکومت میں ایک قسم کا شدید اختلاف پیدا ہو جائے گا؛ گویا ایک ہی ملک میں تین حکومتیں ہوں گی، جن میں سے ہر ایک اپنے لحاظ سے کارکردگی میں مشغول ہے جس کا ایک دوسرے سے بالکل کوئی واسطہ نہیں ہے۔

المختصر ایک طرف حکومت کی کارکردگی کا مختلف ہونا اور ان کا پیچیدہ اور وسیع ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ طاقتیں تقسیم ہونا چاہئیں، اور حکومت کے لئے مختلف پہلو مد نظر رکھے جائیں، اور ان تینوں طاقتوں کی ذمہ داری کی وجہ سے ایک حکومت کے

لئے بھت سے چہرے تصور کئے جائیں جس کے نتیجے میں ایک حکومت مثلث القاعدہ یا مخمس القاعدہ ہو جائے جس کی وجہ سے اس حکومت کے مختلف چہرہ دکھائی دیں دوسری طرف سے عوام الناس اور معاشرہ کے نظام کی وحدت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ حکومت میں ایک وحدت اور ان کا منجم ہونا ضروری ہے تاکہ اسی کے زیر سایہ تمام نظام کی وحدت اور اتحاد نیز طاقتوں کے درمیان ایک ہم اہنگی برقرار رہے اسی طرح ان تینوں طاقتوں کی کارکردگی پر بھی نظارت ہو سکے۔

لہذا ہم اسلامی حکومت کے لئے دو قسم کی مصلحت اندیشی کے روبرو ہیں: ایک طرف سے ہمیں طاقتوں اور ذمہ داریوں کی تقسیم کو قبول کرنا ہے کیونکہ حکومت کی مختلف کارکردگی کی الگ الگ قسمیں ہیں اور ایسے ماہر افراد جو اپنی مہارت اور تجربہ کے ذریعہ مختلف ذمہ داریوں کو نبھاسکیں، بھت ہی کم ہیں، اور شاید ایسے افراد کا وجود ہی نہ ہو، لہذا ان طاقتوں کا تقسیم کرنا ضروری ہے، اور ہر حصہ کی مخصوص ذمہ داریاں اسی فن میں ماہر افراد کے سپرد کی جائے دوسری طرف، چونکہ معاشرہ کو ایک اتحاد اور وحدت کی ضرورت ہے؛ کیونکہ اگر ان طاقتوں میں اختلاف اور ٹکراؤ ہونے کا امکان ہے، لہذا ان تینوں طاقتوں کو ہم اہنگ کرنے سے ایک اہم طاقت کا ہونا ضروری ہے تاکہ اگر ان طاقتوں میں اختلاف ہو جائے تو وہ طاقت ان کے درمیان اس اختلاف کو دور کر سکے، اور ادھر معاشرہ میں اتحاد کے پیش نظر اپنا بنیادی کردار ادا کرے کیونکہ وہ معاشرہ جس پر تین طاقتیں مستقل طور پر اپنا اپنا حکم چلاتی ہیں؛ اس کو ایک متحد اور ہم اہنگ نہیں کھا جاسکتا اور خواہ نخواستہ ایک طرح کا اختلاف اور ٹکراؤ پیدا ہو جائے گا۔ اس مشکل کو حل کرنے اور ان طاقتوں میں اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے، نیز اختلاف کو حل کرنے کے لئے سیاست دانوں نے بھت سی راہ حل بیان کی ہیں جن کا بیان کرنا اس وقت ممکن نہیں ہے، اور ہم صرف اسلامی راہ حل پیش کرتے ہیں۔

۶۔ ولایت فقیہ معاشرہ کے اتحاد کا مرکز

قارئین کرام! گذشتہ جلسات میں بیان شدہ مطالب کے پیش نظر جن میں اسلامی حکومت کی مختلف صورتیں اور اس کے اقداری درجات کے بارے میں عرض کیا کہ اسلامی حکومتوں کی بعض صورتیں نمونہ ہیں، اور ان میں سے بعض اس سے کم تر درجہ کی ہیں، کہ اگر بلند ترین اور نمونہ حکومت تشکیل نہ ہو سکے تو اس سے کم تر درجہ والی حکومت تشکیل پائے گی؛ یہاں پر ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ اسلامی نظام میں اس مشکل کے بارے میں بہترین چارہ جوئی بیان کی گئی ہے کیونکہ نمونہ حکومت میں ایک معصوم ذات کو بر سر اقتدار ہونا چاہئے، اور اسی کے ہاتھوں میں طاقت و قدرت ہونی چاہئے، اور یہ ظاہر سی بات ہے کہ جب (معصوم علیہ السلام) کے ہاتھوں میں قدرت ہوگی تو تو معاشرہ میں وحدت و اتحاد اور قدرتوں میں ہم اہنگی پیدا ہو جائے گی، اور اپنی قدرت سے اختلافات اور قدرتوں کے درمیان ٹکراؤ کا خاتمہ فرمادیں گے اس کے علاوہ ہر قسم کی خودخواہی، ذاتی مفاد اور پارٹی بازی سے جدا رہیں گے؛ کیونکہ معصوم وہ ہے جس میں کسی طرح کا کوئی غیر الہی تصور نہیں پایا جاتا (البتہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ اسلامی حکومت کی نمونہ صورت (آئیڈیل شکل) صرف امام علیہ السلام کے حاضر ہونے کی صورت ہی میں ممکن ہے۔

اسی طرح اسلامی حکومت کی دوسرے درجے میں وہ حکومت ہے جس میں صاحب اقتدار وہ شخص ہو جو امام معصوم علیہ السلام سے زیادہ مشابہ اور نزدیک ہو، اور ضروری شرائط کے علاوہ امام معصوم کے بعد تقویٰ اور عدالت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہو ایسی شخصیت کو ولی فقیہ کہا جاتا ہے؛ معاشرہ کی وحدت، قدرتوں کو ہم آہنگ کرنے والی اور عہدہ داران کی کارکردگی پر ناظر اور نگراں ہوتی ہے، نیز حکومت کے لئے اہم راہنمائیاں، رہبری اور اہم سیاست گذاری اسی ذات کے ذریعہ ہوتی ہے۔

قدرت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے ”مونٹسکیو“ نے قدرتوں کی جدائی کا نظریہ پیش کیا جس کو تقریباً سبھی لوگوں نے قبول کیا اور وہ ایک حد تک مفید بھی ہے؛ لیکن اس نظریہ سے اصل مشکل کا حل نہیں ہوتا کیونکہ اگر حکومت کے عہدہ داران (تینوں طاقتوں میں) اخلاقی صلاحیت اور تقویٰ الہی سے مزین نہ ہوں اور قدرت تقسیم ہو جائے اور تین حصوں میں بٹ جائے، تو اس صورت میں معاشرہ کی برائیاں اور خود حکومت بھی تین حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اس صورت میں اگر ہم قوہ مجریہ کی برائیاں کم ہوتی دکھائی دیتی ہیں تو اس کی وجہ اس دائرہ کا محدود ہونا ہے اور صرف قدرت کا ایک حصہ اس کے پاس ہے لہذا ہمیں اس چیز پر خوش نہیں ہونا چاہئے کہ قوہ مجریہ (حکومت) کے جرائم اور فساد کم ہو گئے ہیں کیونکہ بعض مفسد عدلیہ کی طرف منتقل ہو گئے ہیں اور بعض پارلیمنٹ کی طرف جو غالباً قوہ مجریہ کے تحت تاثیر ہوتی ہے، اور ان سے خلاف ورزیاں اور مفسد سرزد ہوتے ہیں۔

لہذا ان طاقتوں کے مفسد اور ایک دوسرے میں دخالت کرنے سے روک تھام کا بہترین طریقہ عہدہ داروں کے لئے تقویٰ الہی اور اخلاقی صلاحیت کی سفارش کرنا ہے اور ہر عہدہ دار اپنے عہدہ کے لحاظ سے تقویٰ اور اخلاقی صلاحیت کا مالک ہو، اگر عہدہ عظیم اور بڑا ہے تو اس کا تقویٰ اور اخلاقی صلاحیت بھی دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ہو، اور اسی قانون کے تحت جو شخص اس اسلامی قدرت کی صدارت کر رہا ہو وہ سب عہدہ داروں میں سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو، نیز مدیریت اور قوانین کی معلومات بھی بہتر ہیں ہوں اسی وجہ سے اسلامی نظام میں قدرتوں کے درمیان اختلافات کو روکنے، مفسد کو دور کرنے اور ٹکراؤ وغیرہ سے روک تھام، نیز معاشرہ کے اتحاد و وحدت کو برقرار رکھنے والے رہبر کے لئے دوسرے حکومتی عہدہ داروں سے زیادہ تقویٰ اور عدالت کی شرط رکھی گئی ہے تاکہ عوام الناس اس کی عدالت اور تقویٰ پر اطمینان رکھتے ہوئے اس کی اطاعت کریں اور اس کو اپنی مشکلات حل کرنے والا سمجھیں اس صورت میں اگر تینوں قدرتوں میں کچھ خامیاں اور مشکلات پیدا ہو جائیں تو اس عظیم الشان رہبری کے زیر سایہ برطرف ہو جائیں، اور معاشرہ کی مشکلات بھی رفتہ رفتہ دور ہو جائیں جیسا کہ اس بیس سال کے زمانہ میں ہم مقام رہبری کا مشکل کشاء اور، سعادت بخش کردار دیکھتے آئے ہیں۔

بیسواں جلسہ

اسلامی نظام کے اعتقادی عظمت بیان ہونے کی ضرورت

۱۔ اسلامی حکومت کی تھیسز "The' s i s" کی پہچان کے مختلف طریقے

ہم نے گذشتہ جلسوں میں اسلامی حکومتی نظام کے مختلف ڈھانچوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ حکومتی نظام ایک چند پہلو طاقت کی طرح ہے جس کی صدارت اس شخص کے پاس ہو جو بالواسطہ یا بغیر واسطہ خداوند عالم کی طرف منصوب ہو اور یہ نقشہ سیاسی فلسفہ میں ایک تھیوری "Theory" کے نام سے بیان ہوتا ہے، لیکن اس کو ثابت کرنا کہ واقعاً یہ نقشہ اسلامی بہترین نظریہ ہے جس کو حکومت اور اسلامی معاشرہ کی عظیم مدیریت کے لئے پیش کیا جانا واقعاً مزید علمی اور دقیق مطالعہ کی ضرورت ہے؛ اسی وجہ سے اس سلسلہ میں بھت سے ایسے سوالات ہیں جن کے جوابات کے لئے ماہرین اور فقہاء کرام کو بہترین علمی اور دقیق تحقیقات کے بعد جوابات پیش کرتے ہیں، البتہ ان سوالات کے جوابات کو تین مرحلوں میں جواب دیئے جاسکتے ہیں:

الف۔ مختصر شناخت:

کبھی کبھی انسان اپنے وظیفہ اور ذمہ داری کی پہچان کے لئے ماہرین کی طرف رجوع کرتا ہے، تاکہ وہ اپنے علمی قواعد کے تحت اس کا وظیفہ معین کریں، مثلاً عوام الناس کا مراجع تقلید کی طرف رجوع کرنا، اور ان سے استفتاء کرنا اور شرعی امور میں اپنے وظیفہ کو معین کرنے کی درخواست کرنا، اسی طرح ہر صنف کے ماہرین کی طرف رجوع کرنا؛ جیسے کسی مریض کا ماہر ڈاکٹر کے پاس جانا اور اس سے علاج کرنے کی درخواست کرنا، اسی طرح کسی بلڈنگ یا مکان کا نقشہ بنوانے کے لئے کسی بلڈر کی طرف رجوع کرنا اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس کو مختصر سا جواب دیا جاتا ہے اور اس میں علمی اصول کی تفصیل بیان نہیں کی جاتی، بلکہ درحقیقت اس علم کا ما حاصل اور خلاصہ بیان کیا جاتا ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت کے سلسلہ میں مختصر اور اجمالی شناخت ہمارے معاشرہ کے لئے واضح ہے اور جس وقت سے ہمارے ملک میں اسلامی حکومت قائم ہوئی ہے تو کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہوگا جس کو اسلامی حکومت کی حقیقت کے بارے میں معلومات نہ ہوگی شاید اسلامی انقلاب سے پہلے بھت کم ہی ایسے افراد ہوں گے جو اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ کے بارے میں آگاہ نہ ہوں، اور ان کے لئے مختصر طور پر اس تھیوری کی معلومات فراہم کی جائے لیکن (الحمد للہ) آج کل کسی شخص کو اسلامی

حکومت کے بارے میں مختصر اور اجمالی شناخت کے بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں ہے (بلکہ اس سلسلہ میں عام شناخت اور معلومات رکھتے ہیں) البتہ ایسا بھی نہیں ہے کہ اسلامی حکومت کے بارے میں تفصیل اور مکمل وضاحت کی ضرورت نہ ہو، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ ولایت فقیہ اور اسلامی حکومت کی اصل تھیوری عوام الناس کے لئے حل شدہ اور روشن ہے، یہاں تک کہ ہمارے مخالفین اور دشمن بھی اس سلسلہ میں معلومات رکھتے ہیں، جبکہ وہ اپنی تمام تر طاقت انقلاب اور اسلام کی مخالفت میں خرچ کرتے رہتے ہیں لیکن ادھر چونکہ ہماری عوام نے اپنے نظام کی حقانیت کو درک کر لیا ہے تو یہ بھی اپنے تمام وجود سے اس اسلامی انقلاب اور ولایت فقیہ کا دفاع کرتے ہیں اور اس انقلاب اور اسلامی نظام کی حفاظت کے لئے کچھ بھی کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں چنانچہ ہمارے افراد انقلاب اور نظام اسلامی کے دشمنوں کے مقابلہ میں ”مرگ بر ضد ولایت فقیہ“ (ولایت فقیہ کے دشمن مرجائیں) کے نعرہ کو ولایت فقیہ دشمنوں سے مخالفت کا ایک اعلان سمجھتے ہیں، اور ہمیشہ اس نعرہ کی حفاظت کرتے ہیں اور اسی پر قائم رہیں یہاں تک کہ سیاسی اور مذہبی محفلوں اور مساجد میں بھی اس کو دعا کے عنوان سے ہمیشہ پڑھتے رہتے ہیں۔

قارئین کرام! اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ کے سلسلہ میں مختصر جواب کے علاوہ دوسرے دو جواب بھی موجود ہیں: ایک صاحب نظر اور ماہرین افراد کے لئے اجتہادی اور اکیڈمیک جواب، اور دوسرا اسٹوڈینٹس وغیرہ کے لئے متوسط قسم کا جواب ہے۔

ب۔ مخصوص اور علمی شناخت:

تفصیلی، علمی اور مخصوص نیز اکیڈمیک جواب ان افراد کے لئے ہوتا ہے جو بلند ترین علمی درجات پر فائز ہوتے ہیں اور اپنی تمام تر استعداد اور امکانات کو اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ کے موضوع سے مخصوص کرتے ہیں جیسے وہ طالب علم جو ”اسلامی حکومت“ یا اس کے کسی ایک حصے میں ڈاکٹری کرنا چاہتا ہے اور اپنا پایاں نامہ (علمی رسالہ) لکھنا چاہتا ہے جس کے بعد اس کو "P. H. D" کی سند ملتی ہے تو وہ اس موضوع پر تحقیقی نظر ڈالتا ہے اور اس کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالتا ہے اور چند سال تک اس کی تحقیق و بررسی کرتا ہے، اور علمی و دقیق منابع و مآخذ کا مطالعہ کرتا ہے نیز اس فن کے ماہر اور زبده اساتذ سے صلاح و مشورہ کرنے کے لئے اپنے استدلال و برہان بیان کرتا ہے تاکہ اس کی پی ایچ ڈی قبول ہو جائے۔

اسی طرح علمی اور دقیق کاوشیں حوزات علمیہ میں بھی انجام پاتی ہیں اور جو لوگ درس خارج میں مشغول اور قریب الاجتہاد ہوتے ہیں اور اپنے مورد نظر مسائل میں استنباط کرنا چاہتے ہیں تو کبھی کبھی ایک ظاہراً معمولی اور چھوٹے سے مسئلہ کی سالوں تحقیق اور مطالعہ کرتے ہیں، اور دسیوں کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں، اور فقہاء و مجتہدین سے بحث و گفتگو کرتے ہیں تاکہ آخر میں اپنا مخصوص نظریہ پیش کر سکیں اس سلسلہ میں کوئی شک نہیں ہے کہ تمام نظری مسائل منجملہ عقائد، اخلاق، احکام فرعی، اجتماعی،

سیاسی، حقوقی، اور بین الملل مسائل میں اس طرح کی دقیق اور علمی بحث کی ضرورت ہے تاکہ اس سلسلہ میں ماہرین علماء کے ذریعہ اسلامی فرہنگ و ثقافت کا وقار اپنی جگہ باقی رہے؛ لیکن یہ بات مخفی نہ رہے کہ اس طرح کے جوابات نہ تو عوام الناس کے لئے ضروری ہیں اور نہ ہی مفید ہیں۔

ج۔ متوسط شناخت:

آخر میں ”اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ“ جیسے مسائل کے جواب کے لئے متوسط اور درمیانی قسم کی تحقیق و بررسی ہمارے سامنے ہے، جن کو عام جلسوں میں بیان کیا جاسکتا ہے، جبکہ ہمارا مقصد بھی ان جلسات میں اسی قسم کے جوابات پیش کرنا مقصود ہیں، ہم نہ تو اسلامی حکومت کے سلسلے میں مختصر جواب پیش کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ ایک مجتہد اور مفتی استفتاء کے جواب میں اپنے رسالہ عملیہ میں لکھتا ہے اور نہ ہی اس کو مفصل اور تحقیقی طور پر بیان کرنا چاہتے ہیں جن کا چند سال طولانی سلسلہ ہو سکتا ہے بلکہ ہمارا مقصد تو معاشرہ کے مختلف لوگوں کے لئے درمیانی (متوسط) قسم کی معلومات فراہم کرنا ہے تاکہ اسلامی نظام کے مخالف اور دشمنوں کے شبہات اور اعتراضات کا مقابلہ کر سکیں اور ان کی مختلف سازشوں کو ناکارہ بنا سکیں معاشرہ کی اس وقت کی ثقافتی حالت ایک ایسے معاشرہ کی طرح ہے جس کا کسی خطرناک بیماری سے مقابلہ ہو اور سبھی کو اس سے خطرہ درپیش ہو اور اس بیماری سے مقابلہ کرنے کے لئے صرف ایک دفعہ ٹوک دینا کافی نہیں ہے یا صرف اس سلسلہ میں کارشناسی نظریہ اخبار یا دوسرے ذرائع ابلاغ میں اعلان کر دینا کافی نہیں ہے، بلکہ اس بارے میں مسلسل تذکر اور ضروری ہدایات دینا ضروری ہے تاکہ عوام الناس کی معلومات میں اضافہ ہو اور اس اجتماعی بیماری سے مقابلہ کر سکیں ایک مختصر تذکر اور یاد دہانی کے علاوہ سمینار، کانفرنس اور تقریریں ہوں تاکہ اس سلسلہ میں عوام الناس کے لئے مسائل واضح اور روشن ہو جائیں اور اس سلسلہ میں موجودات خطروں کا پتہ لگائیں۔

اس وقت ہم ”اسلامی حکومت“ اور ”ولایت فقیہ“ کے سلسلہ میں متوسط قسم کی شناخت پیش کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ہم یہ احساس کرتے ہیں کہ ہمارے آج کل کے نوجوان اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ اسلامی نظام کے رکن سے زیادہ معلومات نہیں رکھتے، اور بعض شیطان صفت لوگوں نے ان کو گمراہ کرنے کی ٹھان رکھی ہے لہذا چونکہ یہی ہمارے جوان جو ہماری امیدیں اور اس انقلاب کے وارث بھی ہیں ان کو اس سلسلہ میں معلومات حاصل کرنا چاہئے تاکہ ثقافتی آفتوں اور شیطانی مشکلات کا شکار نہ ہوں، لہذا ہم اپنی بحث کو متوسط قسم کے لحاظ سے بیان کرتے ہیں، تاکہ نظریہ ولایت فقیہ کے سلسلہ میں اجتماعی اور ثقافتی بصیرت و یقین میں اضافہ ہو، اور بعض التقاطی (چنیدہ) نظریات اور انحرافات وغیرہ سے مقابلہ کر سکیں اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ عوام الناس کو ولایت فقیہ کے نظریہ سے آگاہ کرنے اور اس کو ثابت کرنے کے لئے علمی اور دقیق راستہ نہیں اپنانا چاہئے،

جیسا کہ فقہاء و مجتہدین کسی ایک مسئلہ کو حل کرنے کے لئے آیات و روایات سے استدلال کے وقت سند و دلالت کے بارے میں بھت زیادہ تفصیل سے بحث کرتے ہیں کیونکہ یہ طریقہ کار تو حوزہ علمیہ میں مجتہدین یا سیاسی علوم میں ڈاکٹری وغیرہ سے متعلق ہوتا ہے۔

قارئین کرام! مذکورہ مطالب کے پیش نظر اس وقت ہم نظریہ ”ولایت فقیہ“ کو آسان الفاظ میں اپنے جوانوں کے ذہنوں تک پہنچانا چاہتے ہیں تاکہ اگر کوئی شخص ان سے اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ کے بارے میں سوال کرے تو وہ جواب دے سکیں اور اپنے اعتقاد کا دفاع کر سکیں لیکن اگر ان کے سامنے دقیق تر سوالات بیان کئے جائیں جن میں تخصصی اور کارشناسی (معاملہ فہم) بررسی و تحقیق کی ضرورت ہو تو ان کو ماہرین کی طرف رجوع کرنا چاہئے لہذا ہم نے اسی مذکورہ ہدف کی خاطر اپنی بحث کے دو حصے کئے: ۱۔ قانون گذاری۔ ۲۔ اجراء قانون (قوانین کا نافذ کرنا)۔

۲۔ قانون کی ضرورت اور اس کے خصوصیات پر ایک نظر

گذشتہ پہلے حصے کا خلاصہ:

۱۔ انسان اپنی اجتماعی زندگی کے لئے قانون کا محتاج ہے، کیونکہ بغیر قانون کے زندگی میں افراتفری، حیوانیت اور انسانی اقدار نیست و نابود ہو جاتا ہے، چنانچہ یہ بات کسی بھی صاحب عقل پر پوشید نہیں ہے۔

۲۔ اسلامی نقطہ نظر سے انسانی اجتماعی زندگی کے لئے ایسا قانون ضروری ہے جس سے مادی اور دنیاوی مصالح بھی پورے ہوتے ہوں اور معنوی اور اخروی مصالح بھی پورے ہوتے ہوں۔

یہاں پر اس بات کی یاد دہانی کر دینا ضروری ہے کہ اگرچہ کبھی کبھی بعض اسلام دشمن طاقتوں کی طرف سے نئے نئے شبہات اور اعتراضات ہوتے ہیں جن کے جوابات دینا ضروری ہیں اگرچہ مختصر ہی کیوں نہ ہوں، آج کل بعض مقالوں، تقریروں یہاں تک کہ بعض ٹیلی ویژن پروگراموں میں یہ مسئلہ بیان ہوتا ہے کہ دنیاوی مسائل؛ اخروی مسائل سے جدا ہیں، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ کوئی بھی قانون ایسا نہیں ہے جس سے دنیاوی اور اخروی دونوں مصالح پورے ہوتے ہوں کسی بھی حکومت کو یا تو صرف دنیا پرست ہونا چاہئے اور دنیاوی اور مادی مسائل کو حل کرے یا آخرت پرست؛ جس میں دنیا سے کوئی مطلب نہ ہو۔

قارئین کرام! مذکورہ بالا اعتراض ”اسلامی سیاسی نظام“ کے سلسلہ میں ہونے والے اعتراضات میں سب سے گھٹیا (پست) قسم کا اعتراض ہے، اور واقعاً افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض عہدہ دار افراد بھی اس سلسلہ میں بڑی آب و تاب اور شان و شوکت سے اس طرح کا اعتراض کرتے ہیں جن کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی گمراہ ہو جاتے ہیں۔

بے شک اسلامی نظریہ کی بنیاد اس بات پر قائم ہے کہ یہ دنیاوی زندگی آخرت کی زندگی کا مقدمہ اور پیش خیمہ ہے، اور جو کچھ بھی ہم اس دنیا میں اعمال انجام دیتے ہیں انہیں کی وجہ سے ہم آخرت میں سعادت مند یا شقاوت مند ہوں گے درحقیقت دین کا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ انسانی زندگی اس طرح گزاری جائے تاکہ اس دنیاوی سہولتوں کے ساتھ ساتھ آخرت کی سعادت بھی حاصل ہو جائے، یعنی خداوند عالم کی طرف سے بھیجے ہوئے انبیاء کرام علیہم السلام نے بشریت کے لئے ایسا نظام پیش کیا ہے جس سے انسان کی دنیاوی زندگی کے ساتھ آخرت کی زندگی بھی کامیاب اور سعادت مند قرار پائے اور چونکہ یہ مسئلہ بالکل واضح اور روشن ہے واقعاً تعجب کا مقام ہے کہ بعض وہ لوگ جو قرآن کریم اور سنت نبوی سے کم و بیش آگاہی رکھتے ہیں اور ان کو جاہل نہیں کہا جاسکتا وہ لوگ خود غرضی کی وجہ سے اپنی آنکھوں سے حقیقت کا نظارہ نہیں کرتے اور اپنی باتوں میں دنیاوی مسائل کو آخرت سے بالکل الگ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، چنانچہ کہتے ہیں: آخرت سے مربوط مسائل عبادت گاہوں، گرجا گھروں اور مساجد میں ہونا چاہئے، اس کے مقابل دنیاوی اور اجتماعی مسائل انسانی تجربہ اور غور و خوض سے حل ہو سکتے ہیں، اور دین اس سلسلہ میں کوئی کردار نہیں کر سکتا !!

یہ ایک ایسا شیطانی اعتراض ہے جو ہر صاحب عقل مسلمان پر واضح ہے کہ یہ تمام ادیان بالخصوص اسلامی نظریہ کے مخالف ہیں۔

۳۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ اگر یہ مان بھی لیں کہ انسان نے ہمیشہ اپنے تجربات، علم اور غور و فکر سے کام لیتے ہوئے اپنے مادی اور دنیاوی ضرورتوں کو حاصل کر لے، (البتہ دنیاوی مصالح بھی اُخروی مصالح پورے ہونے کی صورت میں پورے ہو سکتے ہیں کیونکہ انسان احکام الہی سے فائدہ حاصل کئے بغیر دنیاوی مصالح کو بھی پورا نہیں کر سکتا) (تو پھر وہ) معنوی اور اُخروی مصالح کو پورا نہیں کر سکتا کیونکہ انسان خود بخود اُخروی مصالح کے بارے میں نہیں جانتا کیونکہ اسے نہیں معلوم کہ کونسا عمل اس کی اُخروی زندگی کی سعادت کے لئے مفید ہے؛ کیونکہ اس نے اُخروی زندگی کو دیکھا (بھی) نہیں ہے بالفرض اگر انسان دوسروں کی دنیاوی زندگی سے تجربہ حاصل کر لے اور اسی تجربہ کی بنا پر اپنے لئے زندگی کا راستہ معین کر لے، لیکن اُخروی زندگی کے سلسلہ میں نہ خود کو کوئی تجربہ ہے اور نہ ہی دوسروں کے تجربات اس کے سامنے ہیں، لہذا اپنے لئے آخرت کی سعادت اور کامیابی کا راستہ معین نہیں کر سکتا۔ !!

قارئین کرام! ہماری مذکورہ باتوں سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ دنیاوی اور اُخروی مصالح صرف انہیں افراد کے ذریعہ حاصل ہو سکتے ہیں جن کو خداوند عالم نے اپنی علوم سے نوازا ہے؛ اور معاشرہ پر ایسے قوانین حاکم ہوں جو خداوند عالم کی طرف سے آئے ہوں تاکہ اس کے زیر سایہ دنیاوی مصالح بھی اور اُخروی مصالح بھی پورے ہو سکیں۔

۳۔ قوانین جاری کرنے والے کے صفات پر دوبارہ ایک نظر

ہم نے قوانین کو جاری کرنے والے کے لئے تین مہم شرائط کا ذکر کیا، اور جو شخص قوانین کو جاری کرنے والا ہو نیز دنیاوی اور اُخروی مصلح کو پورا کرنے والا ہو اور خدا کی طرف اس کی نسبت ہو، اس کے لئے مذکورہ شرائط کا مالک ہونا ضروری ہے۔

مذکورہ شرائط:

پہلی شرط یہ تھی کہ قانون جاری کرنے والے اور اسلامی حاکم کو قانون شناس ہونا چاہئے البتہ علم و معرفت کے مختلف درجات ہوتے ہیں اسی وجہ سے تمام افراد ایک درجہ میں نہیں ہوتے معرفت اور شناخت کے ان درجات میں نمونہ درجہ وہ ہے جس میں الہی قوانین سے بالکل خطا نہ ہو، اور ایسی شان صرف معصوم علیہ السلام کی ہوتی ہے جو معرفت اور ادراک میں کبھی کوئی خطا و غلطی نہیں کرتا، اور جو قانون خداوند عالم نے نازل کیا ہے اس کو کما حقہ پہنچاتا ہے ظاہر سی بات ہے کہ اگر ایسی شخصیت یعنی معصوم علیہ السلام موجود ہو تو پھر معاشرہ کے لئے اس کی حکومت ضروری اور ترجیح رکھتی ہے لیکن اگر معصوم علیہ السلام غائب ہوں تو اس صورت میں یہ منصب ایسے شخص کا ہے جو دوسروں لوگوں سے زیادہ قوانین کی معرفت اور شناخت رکھتا ہو۔

دوسری شرط یہ تھی کہ قانون کا جاری کرنے والا شخص عملی میدان میں اپنے ذاتی مفاد یا کسی گروہ کے حق میں کام نہ کرے؛ یعنی اخلاقی صلاحیت رکھتا ہو اور یہ اخلاقی صلاحیت بھی علم کی طرح مختلف درجات رکھتی ہے جس کا نمونہ درجہ معصوم علیہ السلام کی شخصیت میں تصور کیا جاسکتا ہے کیونکہ معصوم علیہ السلام کی ذات کسی بھی وقت غیر الہی انگیزوں کے تحت تاثیر قرار نہیں پاتی اور نا ہی کسی کا خوف اور نا ہی کوئی لالچ ہوتا ہے، نیز اجتماعی منافع و مصلح کو اپنی ذاتی یا گھریلو یا گروہی مصلح پر قربان نہیں کرتا لیکن اگر معصوم علیہ السلام کی ذات موجود نہ ہو تو پھر ایسا شخص جو اس سلسلہ میں معصوم (ع) سے بھت زیادہ شبہا ہت رکھتا ہو، وہی قوانین الہی کو جاری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

تیسری شرط یہ تھی کہ قوانین کو جاری کرنے والا مدیریت اور کلمی قوانین کو جزئی قوانین پر منطبق کرنے میں کافی مہارت رکھتا ہو، یعنی خداوند عالم کے عام قوانین سے آگاہی کے ساتھ ان کے مصادیق کو بھی جانتا ہو اور یہ بھی جانتا ہو کہ کس طرح ان قوانین کو جاری کیا جانا چاہئے تاکہ قوانین کا اصل ہدف محفوظ رہے البتہ قوانین کو جاری کرنے میں اس قدر مہارت اور مدیریت کے لئے خاص تجربات کا ہونا ضروری ہے جن کو انسان اپنی زندگی میں حاصل کرتا ہے، جس کا بہترین اور عالی ترین مرتبہ امام معصوم (ع) میں تصور کیا جاسکتا ہے، کیونکہ معصوم علیہ السلام کی ذات جس طرح خداوند عالم کے قوانین کی شناخت میں غلطی نہیں کر سکتا اور مقام عمل میں بھی ہوا ہی نفس کے تحت تاثیر واقع نہیں ہو سکتا اور خداوند عالم کی خاص تائید اس کے شامل حال ہوتی ہے، اور معاشرہ کے مصلح کو معین کرنے، عام موارد کو خاص موارد میں منطبق کرنے میں (بھی) انحراف اور غلطی کا شکار نہیں ہوتا۔

۲۔ اعتقادی اصول سے اسلامی حکومت کی تھیوری کا تعلق

بے شک اگر کوئی شخص مذکورہ مقدمات کو قبول کرے کہ واقعاً انسانی معاشرہ کے لئے ایسے قوانین کی ضرورت ہے جن سے مادی اور دنیاوی مصلح پورے ہوتے ہوں اور معنوی اور اخروی مصلح بھی، اور اسلامی حاکم اور اسلامی معاشرہ کے ذمہ دار افراد کے شرائط کو بھی قبول کرتا ہو تو پھر اس صورت میں اسلامی نظام کی حقانیت کو قبول کرنا آسان ہے البتہ خود مذکورہ مقدمات کو قبول کرنا بھی دوسری چیزوں پر موقوف ہے: کیونکہ پہلے درجہ میں انسان کو یہ ماننا پڑے گا کہ خدا ہے، اس کے بعد یہ قبول کرے کہ اس نے ایسے پیغمبر کو بھیجا جس نے اس کے احکام بندوں تک پہنچائے اسی طرح یہ بھی قبول کرے کہ اس دنیاوی زندگی کے بعد ایک اخروی زندگی بھی ہے اور اس دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی میں علت و معلول والا تعلق ہے یہ تمام مقدمات ہماری بحث کے بنی ہیں، جن کو اعتقادی، کلامی اور فلسفی مباحث میں تفصیلی طور پر ثابت کیا گیا ہے، اور عام اجتماعی، حقوقی اور سیاسی جلسات میں ہر ایک پر الگ الگ بحث نہیں کی جاسکتی ورنہ تو نتیجہ تک پہنچنے کے لئے سالوں درکار ہوں گے۔

ہمارے مخاطب مسلمان اور وہ حضرات ہیں جو خدا، دین، وحی، نبوت، پیغمبر، عصمت اور قیامت کو قبول رکھتے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کیا اسلام حکومتی نظام پیش کرتا ہے یا نہیں؟ نہ وہ لوگ جو منکر خدا ہیں، اور نہ ہی وہ لوگ جو خود خدا کے خلاف جلوس نکالنے اور اس کے خلاف نعرے لگانے کے لئے تیار ہوں!! اور نہ ہی وہ لوگ جو دین اور احکام اسلام کو بالکل ہی نہیں مانتے، اور نہ وہ لوگ جو پیغمبر کے لئے کھتے ہیں کہ وہ بھی دوسروں کی طرح وحی کو سمجھنے میں غلطی کر سکتا ہے اسی طرح جو افراد اصول میں ہمارے مخالف ہیں وہ اس وقت کی بحث میں ہمارے مخاطب نہیں ہیں اگر وہ لوگ بحث و گفتگو کرنا چاہتے ہیں تو ان سے کسی دوسرے موقع پر بحث کی جاسکتی ہے اور ان کے سامنے اعتقادی اصول کو عقلی اور فلسفی برہان کے ذریعہ ثابت کیا جاسکتا ہے اور ان کی ہدایت کی جاسکتی ہے اور ان کو یہ سمجھایا جاسکتا ہے کہ ہاں خدا بھی ہے اور قیامت بھی آئے گی، نیز خداوند عالم نے ہدایت بشر کے لئے انبیاء کرام کو بھیجا تاکہ وہ ان کو اس کے بندوں تک پہنچائے اسی طرح پیغمبر معصوم ہوتا ہے اور وحی کے سمجھنے میں کسی طرح کی کوئی غلطی و اشتباہ نہیں کرتا اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ پیغمبر نہیں ہو سکتا۔

قارئین کرام! مذکورہ مقدمات کو قبول کرتے ہوئے کیا کوئی صاحب عقل اس بات کو قبول کر سکتا ہے کہ معصوم علیہ السلام کے ہوتے ہوئے؛ جو علم و رفتار میں معصوم ہو اور دوسروں کی نسبت معاشرہ کے مصلح کو بہتر درک کرتا ہو؛ کوئی دوسرا مسند قدرت پر بیٹھ جائے؟! کیونکہ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ اختیاری صورت میں مرجوح کو راجح پر اور بہتر کو غیر بہتر پر ترجیح دینا قبیح اور ناپسند ہے اور کوئی بھی صاحب عقل و شعور اس کو قبول نہیں کرتا ہماری گفتگو ان لوگوں سے ہے جو خود کو مسلمان کھلاتے ہیں، لیکن معصوم کے وجود کا اقرار نہیں کرتے، اور معتقد ہیں کہ نہ تو پیغمبر معصوم تھے اور نہ ہی ائمہ (علیہم السلام) معصوم تھے؛ ان لوگوں

سے بھی ہمارا کوئی سروکار نہیں ہے ہمارا مفروضہ یہ ہے کہ تمام موضوعہ اصول کو قبول رکھتے ہوں اور پیغمبر اکرم (ص) کو معصوم مانتے ہوں، اور شیعہ اعتقاد کے مطابق ائمہ علیہم السلام کو بھی معصوم مانتے ہوں۔

فرضیہ یا مفروضہ یہ ہے کہ اگر معاشرہ میں معصوم علیہ السلام موجود ہوں تو کیا اس صورت میں حکومت کسی غیر معصوم کے سپرد کی جاسکتی ہے؟ کیونکہ غیر معصوم کو حکومت سپرد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قانون کے سمجھنے میں غلطی اور اشتباہ کو جائز مانتے ہیں، اور اس چیز کو بھی جائز مانتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے ذاتی مفاد کو معاشرہ کے مفاد و مصلح کو جائز مانیں اور معاشرہ کے منافع و مصلح کو اپنی خواہشات پر قربان کر دے، نیز اس بات کو بھی جائز ماننا ہے کہ کوئی معاشرہ پر حکومت کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوئے بھی معاشرہ کی حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لے!! جبکہ یہ تمام چیزیں عقلی لحاظ سے مردود اور قابل قبول نہیں ہیں اس بنا پر کوئی بھی صاحب عقل اس چیز میں شک نہیں کرتا کہ اگر امام معصوم (ع) معاشرہ میں حاضر ہو تو اسی کو حکومت سپرد کرنا اولیٰ اور بہتر ہے، اور اگر اس کے بجائے کسی دوسرے کو حکومت کے لئے انتخاب کیا جائے تو یہ کام غیر عقلی اور بے ہودہ ہے اس صورت میں کسی کو شک نہیں ہے اور اسی بات پر تمام لوگوں کی عقل حکم کرتی ہے، نیز اس کو ثابت کرنے کے لئے ہمیں احادیث سے استدلال کرنے اور ان آیات کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے جن میں پیغمبر اکرم (ص) اور ائمہ علیہم السلام کی اطاعت کو واجب قرار دیا گیا ہے، مثال کے طور پر:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَاطِيعُوا الْأَمْرَ مِنْكُمْ ﴾^(۱)

”اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو جو تمہیں میں سے ہیں۔“

﴿ مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ اطَاعَ اللَّهَ ﴾^(۲)

”جو رسول کی اطاعت کرے گا اس نے اللہ کی اطاعت کی“

۵۔ حکومت کے طولی (تحت) مراتب کی منطقی اور عقلی دلیل

قارئین کرام! اگر امام معصوم معاشرہ میں حاضر ہوں تو اسی کی حکومت اولیت رکھتی ہے اس سلسلہ میں ذکر شدہ مطالب ایک استدلال اور عقلی متوسط بیان ہے جو سبھی کے لئے قابل قبول اور قابل دفاع ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی حکومت (وولایت) کے سلسلہ میں قرآنی آیات سے بھی آگاہ نہ ہو، چنانچہ ہمارے ذکر شدہ مطالب کے پیش نظر اپنے اعتقاد کا دفاع کر سکتا ہے لیکن ہماری اصل بحث امام معصوم علیہ السلام کی غیبت کے زمانہ میں اسلام کا نظریہ پہنچانے کے بارے میں ہے کہ جب عوام الناس امام معصوم کے وجود سے محروم ہو، اور اس تک رسائی ممکن نہ ہو، تاکہ اس کی حکومت سے بھرہ مند ہو سکیں اسی طرح امام معصوم علیہ

السلام کے حضور کا وہ زمانہ، جس میں ظالم حکومت معصوم کی حکومت سے مسلمانوں کو محروم کر دے، یا اجتماعی حالات ایسے نہ ہوں جس میں معصوم علیہ السلام قدرت کو اپنے ہاتھوں میں لے سکے۔

ان دونوں صورتوں میں ہم کسی علمی، فنی اور ایکڈمیک دلائل سے استدلال نہیں کرتے جس کا سمجھنا عام لوگوں کے لئے مشکل ہو، بلکہ ہم تو ایک عام عقلی قاعدہ سے استدلال کرتے ہیں جس طرح ہر عام انسان اپنی روزمرہ زندگی میں اسی عقلی قاعدہ سے استدلال کرتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر کسی سلسلہ میں سو فی صد والا درجہ میسر نہ ہو تو پھر ۹۹ فی صد والے درجہ کو انتخاب کرتا ہے اگر کسی چیز کا کامل درجہ حاصل کرنا ممکن نہ ہو تو پھر کامل سے نزدیک والے درجہ کا انتخاب کرتا ہے چنانچہ اس قاعدہ سے مختلف مقامات پر استفادہ کیا جاسکتا ہے، مثلاً: کسی بھی عہدہ کے لئے کچھ خاص شرائط اور صفات رکھے جاتے ہیں، اور اگر کسی میں وہ تمام شرائط پائے جاتے ہیں تو اسی شخص کا انتخاب کیا جاتا ہے، لیکن اگر ان تمام صفات کا حامل شخص نہ مل پائے تو پھر ایسے شخص کا انتخاب کیا جاتا ہے جو اس سے کم شرائط رکھتا ہو، لیکن دوسروں پر برتری اور فضیلت رکھتا ہو۔

دوسری مثال: اگر آپ کسی ایسے ڈاکٹر سے علاج کرا سکتے ہیں جو تیس سال کا تجربہ رکھتا ہو اور وہ اپنی ڈاکٹری میں خاص مہارت اور روشن فکری رکھتا ہے، لیکن آپ اس کو چھوڑ کر کسی ایسے ڈاکٹر سے علاج کرائیں جس نے ابھی ڈاکٹری کی سند لی ہے اور ابھی کلینک کھولی ہے اگر آپ اس سے علاج کرائیں اور وہ غلط علاج کرے تو آپ کی بیماری کا نہ صرف علاج ہوگا بلکہ اس میں شدت آجائے گی، تو کیا آپ عقل اور عقلاء کی نظر میں محکوم نہیں ہیں؟ اور کیا عقلاء آپ کی ملامت نہیں کریں گے کہ ایک ماہر (اسپیشلسٹ) ڈاکٹر کے ہوتے ہوئے وہ بھی آپ کے مکان کے قریب، پھر آپ نے غیر ماہر ڈاکٹر کی طرف کیوں رجوع کیا؟!

اور آپ کا عذر صرف اسی صورت میں قابل قبول ہو سکتا ہے جب اس ماہر ڈاکٹر کی فیس بھت زیادہ ہو یا ماہر ڈاکٹر سے علاج کرانے کے لئے کسی دوسرے ملک میں جانے پڑتا ہو جس کا خرچ برداشت کرنا آپ کے بس کی بات نہ ہو، اسی وجہ سے آپ نے کسی غیر ماہر ڈاکٹر کا علاج کرایا ہے۔

لیکن ہمارا فرض اس صورت میں ہے جب آپ کسی ماہر ڈاکٹر سے علاج کرانے پر قادر ہوں اور اس کی فیس دوسرے غیر ماہر ڈاکٹر سے کم یا اس کے برابر ہے، تو اگر اس صورت میں اگر آپ نے کسی نئے ڈاکٹر کی طرف رجوع کیا اور آپ کی بیماری میں شدت پیدا ہوگئی تو آپ عقل اور صاحبان عقل کی نظر میں معذور نہیں ہیں، اور سبھی اس سلسلہ میں آپ کی ملامت اور سرزنش کریں گے۔

اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ مذکورہ عقلی قاعدہ تمام اجتماعی امور میں جاری ہے، اور اس قاعدہ کو تمام ہی صاحبان عقل قبول کرتے ہیں چاہے مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اور اس کی نسبت حکم عقل کی طرف ہے، جس میں شرعی دلیل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

چنانچہ اسی مذکورہ قاعدہ کے تحت اگر اسلامی حکومت کی نمونہ شکل ممکن نہ ہو (جیسا کہ عقل بھی اسی کو بہترین حکومت مانتی ہے) اور معاشرہ میں علم و تقویٰ اور مدیریت کے لحاظ سے اعلیٰ ترین درجہ والا شخص نہ ملے جو صاحب عصمت بھی ہے تو اس صورت میں عقل کا حکم اور اس کا فیصلہ کیا ہوگا؟ کیا اس صورت میں ہماری عقل اس بات کا فیصلہ کرے گی کہ ہم جو چاہیں کریں اور جس کو چاہے حاکم بنادیں؟ یا ہماری عقل اس چیز کا حکم کرتی ہے کہ اگر معاشرہ معصوم علیہ السلام کے وجود سے محروم ہو اور آئیڈیل شخص حکومت کے لئے ممکن نہ ہو تو ایسے شخص کا انتخاب کریں جو تقویٰ اور صلاحیت کے لحاظ سے معصوم علیہ السلام سے شبیہ اور زیادہ نزدیک ہو؟ اگر سو فی صد والا درجہ حاصل نہ ہوں تو پھر ۹۹ والے درجہ کا انتخاب کریں اور اگر ۹۹ والا درجہ نہ ہو تو پھر ۹۸ والے درجہ کا انتخاب کریں، اسی طرح اگر اعلیٰ درجہ کا انتخاب ممکن نہ ہو تو پھر اس سے کم والے درجہ کا انتخاب کریں، اور پھر باری باری نیچے والے درجہ کا انتخاب کریں، ایسا نہیں ہے کہ اگر عالی ترین درجہ کا انتخاب ممکن نہ ہو تو پھر دوسرے تمام درجے مساوی اور برابر ہیں، اور ۹۹ والا درجہ اور ایک والا درجہ سب برابر ہو جائیں، اسی بنا پر اگر ہمارے فرض کے مطابق نمونہ اور آئیڈیل مقصود حاصل نہ ہو تو پھر کوئی فرق نہیں چاہے کسی کا بھی انتخاب کریں!! بے شک اس کو عقل تسلیم نہیں کرتی۔

لہذا عقل کے اس یقینی حکم کی بنا پر جو ہر انسان کی سمجھ میں آتا ہے اگر اسلامی حکومت کی نمونہ شکل ممکن نہ ہو اور معصوم علیہ السلام کی ذات تک رسائی نہ ہو تاکہ براہ راست عوام الناس پر حکومت کریں تو اس صورت میں اسلامی حکومت کے لئے ایسا فرد جو صلاحیت رکھتا ہے جس میں تینوں بنیادی شرط (یعنی علم، تقویٰ اور مدیریت) دوسروں کی نسبت زیادہ اور معصوم علیہ السلام سے مشابہ ہو، یعنی وہ شخص جو دوسروں سے زیادہ قوانین کی معرفت اور شناخت رکھتا ہو اسی طرح اس کی عدالت اور تقویٰ دوسروں کی نسبت زیادہ ہو اور دوسروں سے زیادہ اپنی خواہشات پر کنٹرول رکھتا ہو نیز اس کی مدیریتی طاقت اور بصیرت دوسروں سے زیادہ ہو۔

قارئین کرام! یہ عقلی بیان ہر صاحب عقل کے لئے سمجھنا آسان ہے اور فقہ و کلام کے پیچیدہ دلائل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۶۔ اسلامی حکومت کے سلسلہ میں چند سوالات

البتہ مسلمانوں پر حکومت کی صلاحیت رکھنے والے کے بارے میں سوالات کے علاوہ اسلامی حکومت کے سلسلہ میں دوسرے سوالات بھی بیان ہوتے ہیں جن کے جوابات (بھی) عرض کرنا ضروری ہیں مثلاً یہ سوال کہ کیا اسلام نے اسلامی حکومت کے عہدہ پر فائز ہونے والے کے لئے شرائط اور خصوصیات بھی بیان کئے ہیں اور حکومت کے لئے خاص شکل معین کی ہے یا نہیں؟ یعنی کیا صرف اسلام نے اسلامی حکومت کے صدر کے لئے بیان کیا ہے کہ کون صدر ہو سکتا ہے لیکن دوسرے حکومتی امور اور اس کا خاکہ عوام الناس کی مرضی پر چھوڑ دیا، یا اجتماعی حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اس کی شکل بھی بدل جائے گی؟۔ دوسرا

سوال جو اس سے زیادہ علمی اور دقیق ہے اور جو لوگ فقہی اور حقوقی مسائل سے آشنائی رکھتے ہیں ان کے لئے قابل فہم ہے، اور وہ یہ ہے کہ آیا حکومت ایک ”تاسیسی“ مقولہ سے ہے یا ”امضائی“ مقولہ سے ہے؟

وضاحت: کیونکہ بعض اسلامی اور فقہی مسائل تاسیسی ہیں، جن کو شارع مقدس نے عوام الناس میں رائج ہونے سے پہلے بیان کیا ہے اور ان کی کیفیت اور طریقہ بھی بیان کیا ہے مثلاً نماز ایک تاسیسی عبادت ہے جس کا وجوب بھی خود شریعت نے بیان کیا ہے اور اس کا طریقہ بھی خداوند عالم کی طرف سے پیغمبر اکرم (ص) کے ذریعہ مسلمانوں کے لئے بیان ہوا ہے، اور اس واجب اور اس کی کیفیت کو بیان کرنے سے پہلے عوام الناس اس سے آگاہ نہ تھی (نماز ہی نہیں بلکہ) عام طور پر تمام عبادتیں تاسیسی ہیں جن کو عوام الناس نے پیغمبر اکرم (ص) سے سیکھا ہے جیسے دوسرے واجبات: روزہ، حج اور دوسرے یا عبادتی احکام تاسیسی ہیں۔ ان تاسیسی احکام کے مقابلہ میں اسلام کے بعض دوسرے احکام امضائی ہیں یعنی عوام الناس اپنی اجتماعی امور میں کچھ معاملات، عقود اور معاہدات کو معین کئے ہوئے ہیں، یہاں تک کہ اگر ان میں سے بعض تحریری شکل میں بھی نہ ہوں لیکن ان پر عمل ہوتا ہے، مثلاً عام طور پر خرید و فروخت، چنانچہ اس سلسلہ میں شریعت نے عوام الناس کو حکم نہیں دیا ہے کہ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس کو جا کر خرید لے اس مسئلہ کی ضرورت خود صاحبان عقل سمجھتے ہیں اور معاملات وغیرہ کے لئے طریقہ کار معین کرتے ہیں اس کے بعد شریعت مقدسہ ان معاملات کی تائید کر دیتی ہے اور اس کو شرعی حیثیت مل جاتی ہے، مثلاً: ﴿احل الله البيع﴾ (خدا نے خرید و فروخت کو حلال قرار دیا ہے) جو عوام الناس کے درمیان رائج ہے، اور خرید و فروخت کی یہ حلیت شرعی تائید کی وجہ سے ہے، اور گویا اس عقلاء کے طریقہ کار کو قبول کرنے کی طرح ہے جو آپس میں ایک دوسرے سے خرید و فروخت انجام دیتے ہیں۔

اس مقام پر حکومت کے سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قبل اس کے کہ خدا نے انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعہ الہی حکومت کی پیروی کرنے کا حکم دیا کیا عوام الناس کے درمیان خود کوئی حکومت کا طریقہ کار موجود تھا جس کی شریعت مقدسہ نے تائید کی اور اس پر دستخط فرمائے؟ یا نہ بلکہ حکومت کی شکل اور ڈھانچے کو بھی عوام الناس نے خداوند عالم کے حکم کے مطابق بنایا ہے؟ اور اگر انبیاء علیہم السلام خدا کی اجازت سے عوام الناس پر حکومت نہ کرتے تو وہ ان کی اطاعت کرنے کا وظیفہ نہ رکھتے، (یعنی) عوام الناس حکومت کی شکل و صورت سے آگاہ نہ تھے۔

المختصر جب ہم کہتے ہیں کہ اسلامی حکومتی نظام کو اسلام نے بیان کیا ہے اور اس کی دینی اور فقہی حیثیت ہے اور خود خداوند عالم نے اس کی اطاعت پر لوگوں کو موظف بنایا ہے، تو کیا یہ حکومت خداوند عالم کی طرف سے تشریح کی گئی ہے اور خدا اس حکومتی نظام کا موسس ہے؟ یا اس حکومت کی شکل و صورت خود عوام الناس کے ذریعہ بنائی گئی ہے اور اس کو اجتماعی معاہدات

کی بنا پر بنایا گیا اور خداوند عالم نے اس کی تائید و امضا کر دیا ہے، اسی وجہ سے یہ حکومت اسلامی حکومت بن گئی ہے کہ جس کی خداوند عالم نے تائید کی ہے اور یہ حکومت امضائی حکم رکھتی ہے؟

حوالے

(۱) سورہ نساء آیت ۵۹

(۲) سورہ نساء آیت ۸۰

(۳) سورہ بقرہ آیت ۲۷۵

تینیسواں جلسہ

اسلام اور حکومت کے مختلف نقشے

۱۔ اسلام کی طرف سے حکومتی سلسلہ میں کوئی طریقہ بیان نہیں کیا گیا (ایک اعتراض)

گذشتہ جلسوں میں حکومت کی شکل و صورت کے بارے میں یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ کیا اسلام نے حکومت کے لئے کوئی خاص نقشہ پیش کیا ہے، یا اس کا معین کرنا خود عوام الناس کے اوپر ہے؟ اور اگر اسلام نے حکومت کے لئے کوئی خاص نقشہ پیش کیا ہے تو کیا وہ کسی خاص زمانہ سے مخصوص ہے یا نہ، بلکہ اس کا ایک خاص نقشہ ہے جو ہر زمانہ میں جاری نہیں ہو سکتا؛ اور انسانی معاشرہ کے حالات کی بنا پر اس کی شکل و نقشہ بدل رہتا ہے چنانچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگرچہ حضرت رسول اکرم (ص) کے زمانہ میں اسلامی حکومت ایک خاص طرز پر ہوتی تھی، لیکن وہ طریقہ صرف اسی زمانہ سے مخصوص تھا، اور خداوند عالم نے اسی طریقہ کار کو صرف پیغمبر اکرم (ص) کے زمانہ کے لئے معین فرمایا تھا اور اس کے بعد نئے نئے نقشے اس حکومت کے قائم مقام ہو سکتے ہیں یہاں تک کہ ممکن ہے کہ بعض اجتماعی حالات کی بنا پر اسلامی حکومت ڈیموکریسی لیبرل شکل اختیار کر لے، اور آپس میں کوئی تضاد یا ٹکراؤ نہ ہو جس طرح ہم نے مغربی ممالک کے بعض طریقوں کو انتخاب کیا ہے؛ مثلاً ”پارلمانی نظام“ کو قبول کر لیا ہے، اور اس کو اسلام کے مخالف نہیں پایا، اسی طرح ”مشروطیت“ کو قبول کر لیا اور اس وقت ”جمہوریت“ کو قبول کر لیا ہے اور ہمارا ماننا ہے کہ یہ اسلام کے مخالف نہیں ہیں، ہو سکتا ہے ایک دن وہ بھی آئے جب ہم ”ڈیموکریسی لیبرل“ کو بھی قبول کر لیں اور اس کو بھی اسلام کے مخالف نہ پائیں!

آج کل ہمارے معاشرہ میں اس طرح کے سوالات اور جوابات پیش کئے جاتے ہیں اور اس سلسلہ میں بحث و غیرہ ہوتی رہتی ہیں، جبکہ ان بحثوں میں بعض اشکالات و ابھامات لوگوں کے ذہن میں ڈالے جاتے ہیں جن کی بنا پر بعض لوگ دانستہ اور بعض لوگ نادانستہ طور پر اسلامی صحیح فکر سے منحرف ہو جاتے ہیں۔

قارئین کرام! مذکورہ اعتراض کا جواب دینے سے پہلے بعض ان نکات کا بیان کرنا ضروری ہے جن کی وجہ سے مذکورہ اعتراض تشکیل پاتا ہے تاکہ ان کے روشن ہونے سے جواب کا راستہ صاف ہو جائے:

جیسا کہ ہم سبھی لوگ اس بات کو جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں انقلاب اسلامی کے عظیم الشان رہبر حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ اسلامی جمہوری نظام قائم ہوا، اور شروع انقلاب ہی میں اس کے اساسی اور بنیادی قوانین مرتب ہوئے جن کی

خود امام خمینی (رہ) نے تائید کی ہے اسی طرح آپ ہی کی تائید کے مطابق حکومت کا نقشہ معین ہوا، اور زمانہ کے ساتھ ساتھ بعض چیزوں میں تبدیلی کرنا پڑی جن کو حضرت امام خمینی (رہ) نے قبول فرمایا جبکہ یہ بات واضح ہے کہ اسلامی حکومت کا یہ نقشہ نہ حضرت رسول اکرم (ص) کے زمانہ میں تھا اور نہ ہی حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے زمانہ میں اس طرح کی حکومت تھی، اور ہماری یہ حکومت اسلامی حکومت کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔

قدرتوں میں جدائی نہ حضرت رسول اکرم (ص) کے زمانہ میں تھی اور نہ ہی حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے زمانہ میں، لیکن ہمارے بنیادی قانون میں قدرتوں کے الگ ہونے کو قبول کیا گیا ہے، اور حکومتی نظام تین قدرتوں قوہ مقننہ (پارلیمنٹ)، قوہ قضائہ (عدلیہ) اور قوہ مجریہ (حکومت) سے تشکیل پایا اس نظام میں سب سے بلند مقام جس کے ذریعہ ملکی عظیم سیاست معین کی جاتی ہے مقام معظم رہبری ہے، اس کے بعد صدر مملکت ملک کے دوسرے بڑے عہدہ پر فائز ہوتا ہے، اسی طرح رئیس قوہ قضائہ اور رئیس مجلس شوری اسلامی (اسپیکر) ملک کے عالی ترین عہدہ میں شمار ہوتا ہے یہاں تک کہ انقلاب اسلامی کے بیس سال کے بعد بھی بنیادی قوانین میں بعض تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں مثال کے طور پر پہلے وزیر اعظم اجراء قوانین کا سب سے بڑا عہدہ ہوتا تھا، اور اسی کے ذریعہ کابینہ کا انتخاب ہوتا تھا، اس کے بعد صدر مملکت اور مجلس شوری اسلامی تائید کرتی تھی، لیکن غور و فکر کے بعد وزیر اعظم کا عہدہ حذف کر دیا گیا اور صدر مملکت ہی اجراء قوانین کا عہدہ دار ہوتا ہے۔

بے شک حکومت کا اس طرح کا نقشہ اسلام میں اس سے پہلے کبھی نہیں تھا نہ ہی اسلام نے اس سلسلہ میں کوئی حکم صادر فرمایا ہے، لہذا کوئی بھی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اسلام نے صاف طور پر وضاحت کر دی ہے کہ عوام الناس ووٹ دے کر صدر مملکت کا انتخاب کریں اسی طرح دوسرے انتخاب میں حصہ لے کر اپنا کردار ادا کریں۔

قارئین کرام! ہمارے گذشتہ مطالب کے پیش نظر بعض لوگ اس کو دلیل مانتے ہیں کہ اسلام نے حکومت کے سلسلہ میں کوئی نقشہ پیش نہیں کیا ہے، لہذا اس بات کو ماننا پڑے گا کہ اسلام نے اس سلسلہ میں عوام الناس کو اختیار دیا ہے کہ وہ خود اپنی مرضی سے حکومت کا نقشہ بنائیں اور خود ہی قوانین کا انتخاب کریں؛ اسی طرح دوسرے حکومتی امور بھی خود عوام الناس سے متعلق ہیں۔

اسی بنا پر اس بات میں کہ حکومت کو خدا کی طرف سے معین ہونا چاہئے اور حکومت خود عوام الناس کے ذریعہ معین ہو؛ تضاد اور ٹکراؤ پایا جاتا ہے، اور یہ جو کھا جاتا ہے کہ حکومت خداوند عالم کی طرف سے معین کی جاتی ہے جبکہ جو چیز عملی طور پر دکھی جاتی ہے ان دونوں میں تضاد اور ٹکراؤ پایا جاتا ہے یہاں تک کہ خود ”جمہوری اسلامی“ کہنا بھی ایک قسم کا تضاد ہے، کیونکہ ”جمہوریت“ کے معنی حکومت کا عوام الناس کے ہاتھوں میں ہونا اور اس کا نقشہ و شکل عوام الناس کے ذریعہ معین ہونا ہیں، جبکہ اس جمہوری کے ساتھ ”اسلامی“ کا اضافہ کرنا اور کہنا کہ حکومت کی باگ ڈور ولی فقیہ کے ہاتھوں میں ہونا چاہئے خصوصاً جبکہ ہم اس

بات کو مانیں کہ ولایت فقیہ خداوند عالم اور امام زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کے ذریعہ مشروعیت (جواز) پیدا کرتی ہے؛ اور اس حکومت کو حکومت الہی سمجھتے ہیں نہ عوامی اور مردمی، یعنی اس حکومت کی مشروعیت اوپر سے شروع ہوتی ہے، پہلے درجہ میں خدا مشروعیت عطا کرتا ہے اس کے بعد پیغمبر اور اس کے بعد امام معصوم (ع)، اور ولی فقیہ امام معصوم علیہ السلام کی طرف سے انتخاب ہوتا ہے جس کی بنا پر اس کی مشروعیت ہوتی ہے اور جو ولی فقیہ کے تحت نظام ہوتا ہے وہ ولی فقیہ کی وجہ سے ہی مشروعیت پیدا کرتا ہے تو اگر حکومت جمہوری ہے تو پھر اس طرح کی باتیں نہیں ہونا چاہئے اور جس کو عوام الناس انتخاب کر لیں وہی حقیقت میں اسی کو صاحب اقتدار ہونا چاہئے۔

۲۔ مذکورہ اعتراض کا جواب، اور حکومت کی شکل کے سلسلہ میں اسلامی نظریہ

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ اعتراض کبھی وضاحت کے ساتھ اور کبھی اشاروں میں اخبار، میگزین اور کانفرنس میں بیان میں ہوتا ہے، اور بیرونی ریڈیو اور دوسرے ذرائع ابلاغ اس پر بھت شور مچاتے ہیں، اور جو کچھ بھی ہمارے اخباروں اور مقالات میں بیان ہوتا ہے اس میں اسلامی حکومت کو تناقض آمیز (ضد و نقیض) اور دینی استبداد کے عنوان سے پہنچنویا جاتا ہے اسی وجہ سے ان مسائل کو صاف اور شفاف طریقہ سے بیان کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ اس سلسلہ میں اسلامی نقطہ نظر واضح ہو جائے۔

کیا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارا حکومتی نظام ”جمہوری اسلامی“ ہے تو اس نظام کا اسلامی ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس حکومت کا نقشہ اور اس کی شکل خداوند عالم کی طرف سے معین ہو، اور قرآن و روایات اور کم سے کم پیغمبر اکرم (ص) اور ائمہ علیہم السلام کی سیرت میں بیان ہوا ہو؟ اور اگر اسلامی نظام ہونا اس بات میں مخصوص نہیں ہے کہ اس کی شکل و صورت خداوند عالم کی طرف سے معین ہو، (جیسا کہ دوسرے شواہد بھی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس نظام کی شکل و صورت خداوند عالم نے معین نہیں کی ہے) تو پھر نظام کے اسلامی ہونے کا معیار کیا ہے؟

چنانچہ اس سلسلہ میں بھت زیادہ بحث و گفتگو ہو سکتی ہے اور جو کچھ ہم نے عرض کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں نے اس بحث کو اہمیت دی اور بعض لوگوں کی طرف سے اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے عوام الناس کو منحرف کرنا چاہا، لہذا ہم اس سلسلہ میں وضاحت کرنا مناسب سمجھتے ہیں، اور ہماری اس بحث میں دقت کرنے سے مطالب واضح اور روشن ہو جائیں گے، اور پھر دوسرے لوگوں کی باتیں اور شیطانی وسوسے اثر انداز نہیں ہو پائیں گے۔

کوئی شخص بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کرتا کہ اسلام نے حکومت کے لئے خاص نقشہ معین کیا ہے، نہ قرآن میں، نہ روایات میں اور نہ معصومین علیہم السلام کی عملی سیرت میں، اور نہ ہی حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ اور مقام معظم رہبری (حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ) اور نہ ہی دوسرے علماء و رہبروں کے بیانات میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اسلامی حکومت

وہ حکومت ہے جس کا نقشہ اور شکل خداوند عالم اور دینی رہبروں کے ذریعہ معین کیا گیا ہے، مثلاً یہ کہ اسلام نے حکم دیا ہو کہ ولی فقیہ صاحب اقتدار اور مرکز قدرت ہو اور اس کے بعد دوسرا درجہ صدر مملکت کا ہے، اور یہ تینوں قدرتیں ایک دوسرے سے مستقل اور جدا ہونی چاہئیں تو جب اسلامی حکومت ہونے کا معیار یہ نہیں ہے کہ اس کا نقشہ اور حکومتی امور نیز قدرتوں کا استقلال خدا کی طرف سے معین ہو تو پھر اسلامی حکومت ہونے کے معیار کو دوسری جگہوں پر تلاش کرنا چاہئے۔

۳۔ حکومتی ثابت اور مسلم ڈھانچہ پیش کیا جانا ممکن نہیں

قارئین کرام! یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام کی طرف سے حکومت کے لئے کوئی معین نقشہ اور خاص صورت بیان نہ ہونا اسلام کے ناقص ہونے کی دلیل نہیں ہے؟ کیا اسلام ایک کامل دین نہیں ہے اور کیا اسلام نے انسانی معاشرہ کی انفرادی اور اجتماعی ضرورتوں کو بیان نہیں کر دیا ہے؟ تو پھر کیوں حکومت کے سلسلہ میں کوئی خاص شکل بیان نہیں کی ہے؟ ہم جواب میں عرض کرتے ہیں: وہ اسلام جس نے پیغمبر اکرم (ص) کے زمانہ کے چھوٹے اور محدود معاشرہ کے نظام کو چلایا ہے اور اسلام؛ انسانی مختلف وسیع اور پیچیدہ معاشروں میں ایک عالمی حکومت کرنا چاہتا ہو، تو کیا اس کے لئے ایک ثابت اور مسلم نقشہ پیش کرنا ممکن نہیں ابتدائے اسلام میں حضرت پیغمبر اکرم (ص) کے ذریعہ ایسی حکومت تشکیل پائی جس کی مردم شماری شاید ایک لاکھ لوگوں تک بھی نہ ہو اور وہ سادہ قسم کی زندگی اور سادہ ثقافت والے لوگوں کی تعداد جن میں اکثریت بادیہ نشین اور مدینہ کے گرد و نواح کے دیہاتیوں کی تھی؛ یہ بات ظاہر ہے کہ اس زمانہ کے لحاظ سے اور اس تعداد کے لحاظ سے حکومت بھی سادہ تھی اس کے بعد اہستہ اہستہ اسلامی علاقوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور خلفاء کے زمانہ میں منجملہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے زمانہ میں کہ ابھی ظہور اسلام کو آدھی صدی ہی گزری تھی اسلامی حکومت ایران، مصر، عراق، سوریہ، حجاز اور یمن تک پہنچ گئی تھی اور اسلام کے تحت نفوذ اس ترقی و وسعت کے پیش نظر ایسا ممکن نہ تھا کہ جب پیغمبر اکرم (ص) مدینہ منورہ میں ایک چھوٹی سی حکومت بنائیں تو اس کو اس طرح تشکیل دیں جس سے ہجرت کے وقت سے پچاس سال (بعد) کی حکومت کو بھی شامل ہو جائے، اور اگر اس زمانہ میں رسول اکرم (ص) ایک عظیم اسلامی علاقہ کے لئے حکومت کو بیان کرتے تو اس زمانہ کے لوگوں کے لئے ایک خواب کی طرح ہوتا، اور دوسری طرف چونکہ اس طرح کی حکومت کا راستہ ہموار نہیں تھا لہذا اس طرح کا نقشہ پیش کرنا ایک بے ہودہ کام تھا۔

اور چونکہ اس پچاس سال کے عرصے میں مسلمانوں کے حالات بھت بدل گئے تھے لہذا اس کے لئے مختلف طریقوں کی حکومت ہونا چاہئے تھی، اسی طرح اس کے بعد کا زمانہ جس میں مسلمانوں اور جہان اسلام کے حالات میں بھی کافی تبدیلی آنا تھی تو اگر رسول اکرم (ص) ان تمام حالات کے پیش نظر ہر زمانہ کے لئے ایک خاص قسم کی حکومت کو بیان فرماتے تو پھر فرضی

حکومتوں کے سلسلہ میں ایک عظیم ”دائرة المعارف“ (انسائیکلو پیڈیا) بن جاتا جس میں ہر زمانہ کی حکومت کے لئے تفصیل بیان کی جاتی ہیں لیکن چونکہ اس زمانہ میں لکھنے پڑھنے والی کی تعداد ہی بھت کم تھی، اور اس سلسلہ میں عالم افراد اور دانشوران کا ہونا تو دور کی بات ہے تاکہ وہ اس سلسلہ میں تفصیل دیں اور ایک دوسرے سے جدا کریں، نہ اس وقت اس موضوع کو بیان کرنے کے امکانات تھے، اور اگر بیان بھی ہو جاتے تو ان کو محفوظ رکھنا اور ان کو رائج کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔

المختصر یہ کہ حکومت کا نقشہ اور اس کی شکل زمان و مکان کے لحاظ سے ہمیشہ متغیر ہے، اور انسانی معاشرہ میں ہمیشہ کے لئے ایک خاص حکومت کا نقشہ معین کرنا ممکن نہیں ہے جس کو ہر دور میں اور ہر جگہ قائم کیا جاسکے حکومت کا نقشہ اسلام کے متغیر اور ثانوی احکام میں سے ہے جو زمان و مکان کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں جن کو معین کرنا ولی امر مسلمین کے عہدہ پر ہوتا ہے، اور جب امام معصوم علیہ السلام حاضر ہوں تو وہی ولی امر مسلمین ہیں، اور وہ حاضر نہ ہوں تو پھر ان کی جگہ ان کا نائب (خاص) ولی امر مسلمین شمار ہوتا ہے (اسلام کے ان متغیر احکام کے مقابل میں اسلام کے ثابت اور مسلم احکام بھی ہیں جو ہمیشہ کے لئے ثابت ہیں جن کو کسی بھی زمانہ میں اور کسی جگہ پر جاری کیا جاسکتا ہے۔)

لہذا یہ تصور کرنا کہ اسلام کو ہر علاقے اور ہر زمانہ کے لحاظ سے حکومت کا ایک نقشہ پیش کرنا چاہئے تھا؛ یہ تصور صحیح نہیں ہے، چونکہ اس طرح کا کام عملی طور پر ممکن بھی نہ تھا لہذا معلوم یہ ہوا کہ اسلام کی طرف سے حکومت کے لئے خاص نقشہ پیش نہ کرنا اسلام کا کوئی نقص نہیں ہے بلکہ اگر اسلام کی طرف سے حکومت کے سلسلہ میں کئی اور عام قواعد پیش نہ کئے جاتے تو اس وقت یہ کھا جاسکتا تھا کہ اسلام میں نقص ہے؛ کیونکہ اس صورت میں نہ تو اسلام نے زمان و مکان کے لحاظ سے حکومت کی کوئی شکل پیش کی ہے اور نہ ہی حکومت کے بارے میں کوئی راستہ بیان کیا ہے لیکن الحمد للہ اسلام نے حکومت کے نقشہ کے بارے میں راستہ تو بتادیا ہے اور اس کے لئے متغیر احکام قرار دئے ہیں اور جیسا کہ ہم نے قانون گذاری کے سلسلہ میں عرض کیا ہے کہ زمان و مکان کے لحاظ سے متغیر احکام کا معین کرنا ولی امر مسلمین کی ذمہ داری ہوتی ہے، جو اسلامی اصول کی بنا پر اور اس زمانہ کے متغیر مصلح کے پیش نظر اور اس سلسلہ میں ماہرین سے صلاح و مشورہ کے بعد ان کو بیان کرتا ہے، اور انہیں مسائل میں سے حکومت بھی ہے، (اور جب ولی امر مسلمین ان احکام کو بیان کر دے تو پھر) عوام الناس کے لئے ان پر عمل کرنا ضروری ہے اسلام نے اس راہ حل کو پیش کر کے عوام الناس کو سرگردانی اور حیرت سے نجات عطا کر دی ہے، جس کی بنا پر اختلافات اور جھگڑوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔

قارئین کرام! اس سلسلہ میں ایک دوسرا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اسلام کی طرف سے حکومت کے لئے کوئی خاص نقشہ بیان نہ کرنا اس بات کی علامت ہے کہ حکومتی مسائل عرفی اور دنیاوی ہیں جو خود عوام الناس سے متعلق ہیں اور اسلام نے اس سلسلہ میں کوئی اظہار نظر نہیں کیا ہے آج کل کے وہ لوگ جو مغربی کلچر خصوصاً ”لیبرلزم“ سے متاثر ہیں اس اعتراض کو ہوا دیتے ہیں اور اپنے مقالات، تقریروں اور اپنی گفتگو میں اس اعتراض کی حمایت کرتے ہیں کہ حکومتی مسائل دنیاوی اور عرفی ہیں جن کا اسلام سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور اپنی بات پر شاہد اس چیز کو پیش کرتے ہیں کہ اسلام نے نہ تو جمہوری حکومت کے بارے میں کچھ کھا ہے اور نہ بادشاہی حکومت کے سلسلہ میں کچھ کھا ہے، اور نہ ہی دوسری حکومتوں کے بارے میں کچھ بیان دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومتی مسائل ایسے نہیں ہیں جن کے بارے میں ہمیں یہ امید نہیں رکھنی چاہئے کہ اس سلسلہ میں خدا اور پیغمبر کچھ بیان کریں، بلکہ یہ مسائل تو دنیا اور عوام الناس سے متعلق ہیں اور خود انہیں کو اس سلسلہ میں طے کرنا چاہئے۔

اور اہستہ اہستہ اس سے بھی آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں: نہ صرف یہ کہ حکومت کے نقشہ کو خود عوام الناس معین کرے بلکہ حکومت کے قوانین بھی خود عوام الناس کو بنانا چاہئے؛ چاہے وہ قوانین اسلامی اصول کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں!!

لیکن اس وقت ان کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ اگر حکومتی مسائل دنیاوی اور عرفی ہیں اور عوام الناس سے متعلق ہیں یہاں تک کہ قوانین بھی انہیں کے ذریعہ بنائے جائیں، تو پھر قرآن اور متواتر روایات میں حکومت سے متعلق بھت سے احکام کیوں بیان ہوئے ہیں؟ مثلاً احکام قضا، احکام مالیات (ٹیکس) اور احکام جزائی وغیرہ، یہ وہ بندگلی ہے جس سے نکلنے کا راستہ نہیں ہے، اگرچہ انہوں نے اس بندگلی سے نکلنے کے لئے بھت سے راستے اختیار کئے ہیں لیکن ان سب کو اس وقت بیان نہیں کیا جاسکتا۔

ان میں سے بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ وہ حکومتی احکام و قوانین جو قرآن و روایات میں وارد ہوئے ہیں، وہ حضرت رسول اکرم (ص) کے زمانہ سے مخصوص ہیں اور اسی زمانہ کی ضرورت کے مطابق تھے، اور اسلام نے صرف رسول اکرم (ص) کے زمانہ میں حکومتی مسائل میں دخالت کی ہے اور کچھ قوانین پیش کئے ہیں، کیونکہ اس وقت کے لوگ اپنی ضرورت کے مطابق قوانین بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، لہذا اسلام کو ان کی ضرورت کے مطابق کچھ قوانین پیش کرنا پڑے، اسی وجہ سے قرآن و روایات میں حکومت، سیاست اور قضاوت سے متعلق احکامات بیان ہوئے ہیں جو صرف اسی زمانہ میں کارآمد تھے، لیکن اس زمانہ میں جب انسان نے علم و دانش میں کافی ترقی کر لی ہے اور خود اپنی ضرورت کے مطابق قوانین بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور آج کل ماڈرن زمانہ ہے، لہذا وہ قوانین کارآمد نہیں ہیں اور ان کو ترک کر دینا چاہئے!!

قارئین کرام! اس طرح کی باتیں بھت سے اسلام کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں کی طرف سے بیان ہوتی ہیں اور کبھی کبھی تو صاف کہتے ہیں کہ احکام اسلام (منجملہ اسلام کے اجتماعی احکام) رسول اسلام (ص) کے زمانہ سے مخصوص تھے، اور آج ہمارے زمانہ میں کارآمد نہیں ہیں، بلکہ اصلاً اس زمانہ کے لئے نازل (بھی) نہیں ہوئے ہیں، اور کبھی کبھی اپنے مذکورہ نظریہ کو پشت پرہ

بیان کرتے ہیں چونکہ اتنی ہمت نہیں کرتے کہ واضح طور پر اسلام کے تمام اجتماعی احکام پر اعتراضات نہیں کر سکتے، اور اسلام کے بعض سزائی احکام منجملہ ”چور کے ہاتھ کاٹنے والے حکم“ پر اعتراض کرتے ہیں۔

چنانچہ کہتے ہیں کہ ”چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم“ چوری کرنے اور لوگوں کے مال میں خیانت کرنے سے روک تھام اور معاشرہ میں مالی امن و امان کو برقرار کرنے کے لئے تھا لیکن اب اگر ہمارے پاس اس طرح کے جرائم سے روک تھام کے لئے اس سے بہتر طریقے موجود ہوں تو پھر انہیں کو کام میں لایا جائے، نہ یہ کہ ہر زمانہ میں چور کے ہاتھ کاٹ دئے جائیں اسلامی قوانین کا مقصود معاشرہ میں امن برقرار رکھنا ہے اور اس زمانہ میں اس سے بہتر اور کوئی طریقہ کار نہیں تھا کہ چور کے ہاتھ کاٹ دئے جائیں لیکن آج کل اس سے بہتر طریقے موجود ہیں تاکہ اس طرح کے جرائم سے روک تھام ہو سکے، جن میں تشدد اور شدت پسندی بھی نہیں ہے اور ان کی انسانی شرافت بھی داغدار نہیں ہوتی کیونکہ چور کے ہاتھ کاٹ دینا تشدد اور وحشیانہ عمل ہونے کے علاوہ انسانی شرافت سے بھی ہم اہنگ نہیں ہے جس کو ترک کر دینا چاہئے آج کل ہم اس زمانہ میں زندگی بسر کرتے ہیں جس کو ماڈرن زمانہ کہا جاتا ہے، آج اجتماعی مسائل بالکل بدل گئے ہیں، اور چونکہ آج کل کے جدید حالات پیغمبر اکرم ((ص)) اور ائمہ معصومین (علیہم السلام) کے زمانہ سے بالکل الگ ہیں لہذا اسلامی قوانین کو جاری نہیں کیا جاسکتا۔

قارئین کرام! آپ حضرات نے ملاحظہ فرمایا کہ پہلے تو ان لوگوں نے یہ کہا کہ اسلام نے حکومت کے لئے کوئی نقشہ پیش نہیں کیا، اور اس سلسلہ میں خود عوام الناس کو اختیار ہے اور جب حکومتی مسائل عوام الناس پر چھوڑ دئے تو اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جن موارد میں اسلام کے مشخص اور معین قوانین نہیں ہیں تو ان قوانین کو معین کرنا خود عوام الناس کے عہدہ پر ہے اس کے بعد اس سے آگے قدم بڑھایا اور کہا: یہاں تک کہ جن موارد میں اسلامی قوانین موجود بھی ہیں تو ان اسلامی قوانین کو نسخ بھی کیا جاسکتا ہے اور ان کو بدلا جاسکتا ہے! بے شک اس صورت میں تو اسلام کا جلد ہی فاتحہ دیا جائے گا۔

۵۔ مذکورہ اعتراض کا جواب، اور اسلام کے متغیر اور ثابت احکام کی نسبت

ہم نے مختصر طور پر یہ عرض کیا کہ اسلام کے ثابت اور غیر قابل تبدیل احکام کے علاوہ متغیر احکام بھی ہیں کیونکہ اسلام کے احکام واقعی مصالح و مفاسد کے تحت ہیں، اور انسان کی زندگی بعض امور میں متغیر حالات کے تابع ہے، البتہ وہ متغیر حالات بھی واقعی مصالح و مفاسد کے لحاظ سے متغیر ہیں اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ حکومت بھی ثانوی اور متغیر احکام رکھتی ہے اور ہر زمانہ میں اس کی شکل و صورت کا معین کرنا نیز اس کے لئے مناسب قوانین بنانا ولی فقیہ کا کام ہے جو اسلامی اصول کے تحت اور اسلامی ارشادات کے مطابق اپنے وظیفہ پر عمل کرتا ہے۔

قارئین کرام! توجہ رہے کہ اسلام کے متغیر اور ثابت احکام میں امتیاز پیدا کرنا اور ان میں تمیز کرنا فقہاء اور مجتہدین کا کام ہے کیونکہ وہ اسلامی منابع و ماخذ کی روح یعنی قرآن، سنت، اور پیغمبر اکرم (ص) اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت کا علم رکھتے ہیں لہذا اسلام کے متغیر اور ثابت احکام میں تمیز کر سکتے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کے صفات کو معین کر سکتے ہیں۔

صرف یہ کھ دینا کہ اسلام میں متغیر احکام پائے جاتے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی اسلام کے تمام احکام کو متغیر کھ دے کیونکہ اگر اسلام کے تمام قوانین متغیر ہوں تو پھر اسلام میں کیا باقی بچے گا؟ اور اس صورت میں ہم کس اسلام کا دفاع کرنا چاہتے ہیں؟ اگر تمام اسلامی قوانین اور احکام متغیر ہوں اور اسلام کا کوئی بھی قانون یا حکم ثابت اور مسلم نہ ہو تو پھر ہم نے کیوں انقلاب برپا کیا، اور اسلام کے احکام جاری ہونے کے خواہشمند ہیں، اس کی وجہ سے لاکھوں افراد شہید ہوئے خود شاہ (محمد رضا) کے زماہ میں ایک ریفرم "R w f o r m e" (اصلاح) اور تبدیلی کے ذریعہ عوام الناس کی مانگ کو پورا کیا جاسکتا تھا، تاکہ خود عوام الناس کے لئے قوانین بنانے کا راستہ ہموار ہو جاتا، اگر یہ وہی اسلام ہے جس کے قوانین عوام الناس کی رائے سے بدل جاتے ہیں تو پھر ہم نے بے فائدہ انقلاب برپا کیا، بہتر تھا کہ ہم "ملی گرا" کے تابع ہو جاتے، جس کی بنا پر معاشرہ کے منافع کو حاصل کرتے، اور پھر ہمارے یہ نقصانات نہ ہوتے!! جیسا کہ ملی گرا مشورہ دیتے اسی کو جاری کرتے اور لیبرل ڈیموکریسی کے تحت آرام کے ساتھ ووٹنگ کرتے اور پھر اپنے منتخب شدہ ممبران کو شاہ کے پارلیمنٹ میں بھیجتے، اور وہ عوام الناس کی خواہش کے مطابق غیر عوامی قوانین تبدیل کرتے!!

قارئین کرام! یہ ان لوگوں کی باتوں کا خلاصہ ہے جو بیرونی "تئوریسین" سے متاثر ہیں جو بعض ان اخباروں میں بیان ہوتے ہیں جو مسلمانوں کے بیت المال سے چلتے ہیں!!

اسی طرح کے بعض لوگ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان جوانوں کو جنھوں نے ابھی تک اسلام کے اجتماعی مسائل کا مطالعہ نہیں کیا ہے اور کافی مقدار میں علم نہیں رکھتے ان کو تحت تاثیر قرار دیتے ہیں، مثال کے طور پر رکھتے ہیں: اسلامی حکومت صرف ایک ادعا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، کیونکہ اسلام نے نہ جمہوریت کے بارے میں کچھ کھا ہے اور نہ ہی قدرتوں میں جدائی کے بارے میں کچھ بیان دیا ہے۔

اور جب اسلام نے اس سلسلہ میں کچھ (بھی) بیان نہیں کیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے حکومت کے سلسلہ میں کوئی نقشہ پیش نہیں کیا بلکہ حکومتی امور خود عوام الناس کے سپرد کردئے گئے ہیں۔

یہاں پر ہمارے مخاطب وہ لوگ ہیں جو خدا، اسلام اور قرآن پر اعتقاد رکھتے ہیں، احکام اسلامی کو کھیل سمجھنے والے افراد نہیں، کیونکہ ان کے سلسلہ میں گفتگو کرنا بے کار ہے ہم ان لوگوں سے مخاطب ہیں جو خدا کے وجود کا اقرار کرتے ہیں اور عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا نے پیغمبر کو ہماری ہدایت کے لئے بھیجا ہے، نیز قرآن مجید اس کی طرف سے نازل ہوا ہے؛ (ہم ان سے یہ عرض کرتے ہیں کھ)

قرآن مجید صاف طور پر ایسے احکام اور قوانین کا ذکر کرتا ہے جو ہمیشہ ثابت اور غیر قابل تبدیلی ہیں اور قابل استثناء بھی نہیں ہیں، اس کے علاوہ قرآن مجید نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ ان احکام میں کسی طرح کا کوئی خدشہ وارد نہیں کرنا چاہئے ان ہی میں سے اسلام کے قضائی احکام ہیں اگرچہ بعض مسائل ضروری اور واجب ہیں لیکن ان کو عام معمولی طریقہ سے قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے، لیکن بعض مسائل منجملہ احکام قضاوت (اسلامی قوانین کے احکام و قوانین کے مطابق) ہیں جن کے بارے میں اس قدر تاکید کی گئی ہے اور ان کو اس شدید انداز میں بیان کیا گیا کہ اگر انسان ان کی خلاف ورزی کرنا چاہے تو اس کا بدن لرز جاتا ہے جیسا کہ خداوند عالم اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ خدا کے حکم کے مطابق حکم فرمائیں:

﴿ إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ﴾ (۲)

”ہم نے آپ کی طرف یہ برحق کتاب نازل کی ہے کہ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں“

دوسری جگہ رسول خدا (ص) کے فیصلوں کے سامنے تسلیم ہونے اور اس کی اطاعت کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴾

﴿ (۳) ﴾

”پس آپ کے پروردگار کی قسم کہ یہ ہرگز صاحب ایمان نہ بن سکیں گے جب تک آپ کو اپنے اختلافات میں حکم نہ بنائیں گے اور پھر جب آپ فیصلہ کر دیں تو اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی کا احساس نہ کریں اور آپ کے فیصلہ کے سامنے سراپا تسلیم ہو جائیں“

قارئین کرام! جیسا کہ آپ حضرات نے ملاحظہ کیا کہ خداوند عالم نے (فَلَا وَرَبِّكَ) سے قسم کھا کر (جو بھت بڑی قسم ہے) صرف ان لوگوں کو مومن شمار کیا ہے جو اپنے اختلافات اور جھگڑوں میں (جو معمولاً مالی امور میں اور کبھی جان و ناموس کے سلسلے میں ہوتے ہیں) صرف پیغمبر اکرم (ص) کی طرف رجوع کریں لیکن اگر اپنے اختلافات کو دور کرنے کے لئے پیغمبر اکرم (ص) کی خدمت میں نہ گئے اور آنحضرت (ص) سے فیصلہ کی درخواست نہ کی، یا اگر پیغمبر اکرم (ص) نے ان کے درمیان فیصلہ فرمادیا چاہے کسی کے نقصان میں ہو یا فائدہ میں، اور وہ دل و جان سے پیغمبر کے فیصلہ پر راضی نہ ہوئے اور ان کے دل رنجیدہ رہے، تو اس صورت میں وہ مومن نہ رہیں گے لہذا مومنین کو بھی آنحضرت (ص) کو قضاوت اور فیصلوں کے لئے منتخب کرنا چاہئے اور جس وقت وہ فیصلہ فرمادیں تو چاہے ان کے فائدہ میں ہو یا نقصان میں، تو ان کو اپنے دل میں ناراضگی اور رنجیدگی کا احساس تک نہ ہونے پائے، اور مکمل طریقہ سے رسول خدا (ص) کے فیصلہ پر راضی رہیں جو لوگ آنحضرت (ص) کو خدا کا رسول مانتے ہیں لیکن ان کے فیصلوں کو نہیں مانتے وہ لوگ جھوٹے اور منافق ہیں؛ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ رسول کی رسالت کا اقرار کرتے ہوں لیکن اس کے فیصلوں کو نہ مانیں!؟

قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر چند مسلسل آیتوں میں خدا کے حکم کے علاوہ قضاوت کرنے والے لوگوں کو فاسق، کافر اور ظالم کھا گیا ہے:

ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَخُكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ (۴)

”اور جو شخص بھی ہمارے نازل کئے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے گا اس کا شمار کافروں میں ہوگا۔“

﴿وَمَنْ لَّمْ يَخُكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ (۵)

”اور جو شخص بھی ہمارے نازل کئے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے گا اس کا شمار ظالموں میں ہوگا۔“

﴿وَمَنْ لَّمْ يَخُكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ (۶)

”اور جو شخص بھی ہمارے نازل کئے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے گا اس کا شمار فاسقوں میں ہوگا۔“

کیا کوئی شخص قرآن مجید کی ان آیات کو اس انداز اور اس لحن میں ملاحظہ کرنے کے بعد (بھی) یہ احتمال دے سکتا ہے کہ اسلامی قضاوت کے احکام صرف رسول اکرم (ص) کے زمانہ تک اور زیادہ سے زیادہ آپ کے بیس سال بعد تک کے لئے ہیں، اور جب اسلامی علاقوں میں ایران، مصر اور دوسرے علاقے شامل ہو گئے تو اسلام کے یہ قضائی احکام کار آمد نہیں رہے اور قضاوت کے احکام لوگوں پر چھوڑ دئے گئے ہیں؟ کیا ہر وہ شخص جو ان آیات اور اسی طرح کی دوسری آیات کو ملاحظہ کرنے کے بعد یہی نتیجہ اور فیصلہ کرے گا؟ یا نہ اس کا فیصلہ یہ ہوگا کہ کسی بھی وقت اور کسی بھی حالت میں خداوند عالم کے احکام کو پاؤں سے روندنا نہیں جاسکتا؟

بے شک ہر وہ صاحب عقل اور انصاف پسند انسان جو خدا پر ایمان رکھتا ہو اور ان آیات کو خدا کا کلام سمجھے تو ان آیات کے لب و لہجے کو دیکھ کر یہ یقین نہیں کر سکتا کہ یہ مذکورہ آیات صرف رسول اکرم (ص) کے زمانہ اور زیادہ سے زیادہ آنحضرت کے بیس سال بعد تک کے لئے ہیں؛ بلکہ (ان آیات کے لب و لہجے کو دیکھ کر) اس کو یقین ہو جائے گا کہ تاقیامت ان آیات کے مضمون پر عمل ہونا چاہئے، اور ہمیشہ احکام خدا کو اپنے اعمال کے لئے نمونہ عمل قرار دینا چاہئے، اور ان کی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہئے:

﴿وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ (۷)

”اور جو حدود الہی سے تجاوز کرے گا اس کا شمار ظالمین میں سے ہوگا۔“

اس کے علاوہ اگر بعض آیات کا مضمون کسی قدر واضح اور روشن نہ ہوتا تو اس میں کچھ شبہ ہو سکتا تھا، علماء اور مجتہدین کا وظیفہ ہے کہ یہ معین کریں کہ یہ آیات کسی خاص زمانہ سے مخصوص ہیں یا زمانہ کے لحاظ سے مطلق ہیں اور کیا کسی خاص قوم (جزیرۃ العرب کی عوام) سے مخصوص ہیں یا ان آیات میں دوسرے تمام لوگ بھی شامل ہیں؟

بھر حال دشمن؛ احکام اسلامی اور قوانین اسلامی کو برداشت کرنے سے شانے خالی کرتے ہیں اور اپنی خواہش نفسانی نیز شیطانی ہو او ہوس کے تحت نیز جوان نسل کو گمراہ اور منحرف کرنے کے لئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کے اجتماعی اور سیاسی احکام رسول اکرم (ص) کے زمانہ سے مخصوص ہیں اور اس کے بعد کار آمد نہیں ہیں، اگرچہ ہم نے اپنی حکومت کو ”جمہوری اسلامی“ کا عنوان دیا ہے لیکن اسلام کا نام صرف ایک دکھاوٹی پہلو ہے، اور عوام الناس جو قانون بھی بنانا چاہیں بنا سکتے ہیں، اور اس پر عمل کر سکتے ہیں؛ چاہے وہ قوانین سو فی صد خداوند عالم کے حکم کے مخالف ہوں!! افسوس کہ بعض لوگ اپنے مقالات اور تقریروں میں اسی طرح کا نظریہ پیش کرتے ہیں، جبکہ ان سے اس کے علاوہ کی امید بھی نہیں ہے۔

۶۔ انسانی، تمام مسائل میں احکام الہی کی وسعت

قارئین کرام! یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اسلام کی طرف حکومت کے لئے کوئی خاص نقشہ پیش نہ کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حکومت اور حکومتی قوانین: عدلیہ، قانون گذاری اور اجرائے احکام سے متعلق قوانین^(۸) خود عوام الناس کے سپرد کردئے جائیں اور خداوند عالم ان کے بارے میں کوئی نظریہ نہ رکھتا ہو؛ بلکہ خداوند عالم نے انسان کے ذاتی اور اجتماعی مسائل میں اسی طرح حکومت و سیاست کے بارے میں دستور العمل بیان کیا ہے، اور ہمیں کوئی ایک ایسا مورد نہیں ملے گا جس میں خداوند عالم کا حکم شامل نہ ہوتا ہو۔

وضاحت ہم جو کچھ بھی کام انجام دیتے ہیں اور جو احکام ہم پر لاگو ہوتے ہیں ان میں سے بعض احکام وجوبی اور الزامی ہوتے ہیں جن پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے ان کے مقابلہ میں بعض احکام حرام ہوتے ہیں جن کا ترک کرنا واجب ہوتا ہے، ان اوامر و نواہی والے الزامی احکام کے علاوہ دوسرے احکام جائز ہوتے ہیں اور ان پر غیر الزامی احکام جاری ہوتے ہیں، غیر الزامی احکام یہ ہیں: مستحب، مکروہ اور مباح پس ہمارے تمام کام انہیں پانچوں قسم میں سے ہوتے ہیں چاہے وہ واجب ہوں یا حرام، مستحب ہوں یا مکروہ اور مباح، اور یہ تمام خداوند عالم کے احکام ہیں۔

اس بنا پر اگر کسی مقام پر کوئی کام حرام یا واجب یا مستحب یا مکروہ نہ ہو تو وہ کام انسان کے لئے آزاد ہے جس کو روایات میں مطلق اور فقہاء و مجتہدین کی اصطلاح میں ”مباح“ کہا جاتا ہے؛ مباح بھی خداوند عالم کے احکام میں سے ایک حکم ہے لہذا معلوم یہ ہوا کہ انسان کے انفرادی اور اجتماعی مسائل میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس پر حکم خدا شامل نہ ہو، کیونکہ ہر مسئلہ یا ہر موضوع پر احکام خمسہ (واجب، حرام، مستحب، مکروہ اور مباح) میں سے کوئی نہ کوئی حکم ضرور شامل ہوگا البتہ حقوق اور سیاست کے لحاظ سے مستحب اور مکروہ صرف اخلاقی پہلو رکھتا ہے اور ان کا ذکر حقوقی مسائل میں بیان نہیں ہوتا اور مسائل حقوقی یا واجب ہیں جن کی رعایت ہونا چاہئے یا حرام جن کو ترک کیا جائے یا مباح ہیں (چاہے عمل کرے یا نہ کرے)۔

آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم نے مان لیا کہ اسلام نے حکومت کے سلسلہ میں نظریہ پیش کیا ہے، اور وہ شخص جو اقتدار میں مرکزیت رکھتا ہے اس کے لئے خاص شرائط و صفات معین کئے ہیں، جس کے نتیجے میں جو شخص ان صفات کا حامل ہوگا وہی شریعت اسلام کی طرف سے معاشرہ کی رہبری کے لئے حکومت کے لئے منصوب ہوگا؛ تو کیا جن مسائل میں اسلام نے بیان نہیں دیا ہے وہ عوام الناس کے حوالے ہیں اور ان میں شریعت اسلام نے کوئی تصمیم گیری نہیں کی ہے اور اس سلسلہ میں ان کو طے کرنے کے لئے عوام الناس کی سمجھ بوجہ اور ان کے درمیان موجود عرف کے مطابق عمل کیا جائے؟ یہاں پر، حتیٰ وہ افراد جو اسلامی اور فقہی بحثوں سے کسی حد تک آشنائی رکھتے ہیں کبھی کبھی ایسے گول مٹول الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے دوسرے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، مثال کے طور پر کہتے ہیں: ہم اپنی زندگی کے بعض مسائل کو دین اسلام سے اخذ کریں اور ان کے سلسلہ میں قرآن مجید، روایات اور زیادہ سے زیادہ پیغمبر اکرم (ص) اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی عملی سیرت کی طرف رجوع کریں؛ لیکن ان کے علاوہ اپنی عقل کے مطابق عمل کریں درحقیقت ہم اپنی صحیح زندگی کی راہ کو معین کرنے کے لئے دو منابع رکھتے ہیں: ایک قرآن مجید، دوسرے عقل اس طرح کے مسامحہ آمیز (ذو معنی) الفاظ وہ حضرات استعمال کرتے ہیں جو صاحب نظر اور واقعاً متدین ہیں، اور چونکہ اس طرح کی باتیں باعث لغزش و گمراہی ہوتی ہیں لہذا ان کو رد کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

اس نکتہ پر توجہ کرنا ضروری ہے کہ حکم شرعی اور حکم الہی کے لئے کم سے کم دو اصطلاح موجود ہیں:

۱۔ حکم شرعی کی پہلی اصطلاح: (یا حکم تعبیدی اور الہی) وہ حکم ہے جو قرآن مجید اور سنت نبوی سے حاصل کیا جاتا ہے، وہ قرآن اور معتبر احادیث میں ذکر ہوئے ہیں اس اصطلاح کے مطابق وہ حکم جو دوسرے طریقہ سے حاصل ہو جیسے عقل کے ذریعہ تو اس کو شرعی حکم نہیں کہا جاتا، بلکہ اس کو ”حکم عقل“ کہا جاتا ہے لہذا اگر کسی حکم کو عقل مستقل طور پر حاصل کر لے، اور اس سلسلہ میں شریعت مقدس کی طرف سے بھی حکم وارد ہوا ہو، تو اس (شرعی حکم) کو ارشادی کہا جاتا ہے جس میں حکم شرعی اور تعبیدی نہیں ہوتا۔

وضاحت ہماری عقل دوسری چیزوں سے قطع نظر بعض چیزوں کو سمجھتی ہے مثلاً ہر صاحب عقل انسان اس بات کو آسانی سے سمجھ لیتا ہے کہ عدالت اچھی چیز ہے اور ظلم بری چیز ہے؛ اور کوئی بھی صاحب عقل، عقل کے اس حکم میں شک نہیں کرتا اس وقت جب قرآن مجید کی آیت میں عدل کے بارے میں حکم ہوتا ہے تو فقہاء کی اصطلاح میں اس حکم کو ”ارشادی“ کہا جاتا ہے؛ یعنی یہ آیت صرف عقل کے اس حکم پر ہدایت کرتی ہے جو ہماری عقل نے الگ سے سمجھ لیا ہے۔

حکم شرعی میں اس اصطلاح کا فقہاء کے یہاں استعمال ہونا بعض لوگوں کے منحرف ہونے کا سبب بنا ہے اور خیال کیا جانے لگا کہ ہم اپنی زندگی کے تمام مسائل میں شرعی حکم کے محتاج نہیں ہیں بلکہ بعض مسائل میں ہمارے لئے حکم عقل کافی ہے اور پھر ان میں خداوند عالم کی کوئی حکومت نہیں ہوگی، کیونکہ خداوند عالم کی حاکمیت ان احکام میں ہوتی ہے جو قرآن مجید اور سنت

پیغمبر میں نازل ہوئے ہیں، اور اگر کسی سلسلہ میں خدا کا کوئی حکم نہ ہو تو وہاں پھر خدا نے اپنی حاکمیت کو نہیں رکھا ہے بلکہ اس کو عقل کے سپرد کر دیا ہے پس ہماری زندگی کے امور و حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں: بعض میں خدائی سلطنت ہے اور دوسرے حصہ میں ہماری عقل حاکم ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم تمام مقامات پر حکومت نہیں رکھتا، ہمیں ہر جگہ خدا کے حکم کو تلاش نہیں کرنا چاہئے بلکہ جس جگہ خدا کا حکم نہ ہو اس کو ہمارے حوالے کر دیا ہے تاکہ ہم اپنی عقل کے ذریعہ اس کا حکم حاصل کر لیں۔

قارئین کرام! جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ فقہاء کے یہاں پہلی اصطلاح میں حکم شرعی میں مسامحہ آمیز تعبیر استعمال کی گئی ہے، (جس کی بنا پر حکم شرعی اس حکم تعبدی کو کھا جاتا ہے جو قرآن و سنت میں ذکر ہوا ہو، اس کے مقابلہ میں عقل کے قطعی اور یقینی حکم کو قرار دیتے ہیں جس کے سلسلہ میں شارع مقدس نے کوئی تعبد نہیں رکھا ہے، اور ہماری عقل اس حکم کو حاصل کرنے میں شریعت کی پابند نہیں ہے، اور شریعت نے صرف اس سلسلہ میں ارشادی حکم کو پیش کیا ہے) جس سے بعض لوگوں نے غلط نتیجہ نکالا ہے اور یہ اعتقاد کر لیا کہ ہماری زندگی کا ایک حصہ خداوند عالم کی حاکمیت اور سلطنت سے باہر ہے اور اس سلسلہ میں قوانین کو مرتب کرنا عقل کی ذمہ داری ہے۔

۲۔ حکم شرعی کی دوسری اصطلاح: یہ ہے کہ وہ احکام جو خداوند عالم کے ارادہ تشریحی سے متعلق ہوں؛ یعنی ہر وہ کام جو خداوند عالم ہم سے چاہتا ہے چاہے الزامی صورت میں ہو یا مباح کی صورت میں ہو پس جو کچھ خداوند عالم ہم سے چاہے کہ ہم اسے انجام دیں تو وہ حکم خدا ہے؛ چاہے وہ قرآن و سنت اور تعبدی دلائل کے ذریعہ ثابت ہوں اور چاہے عقل کے ذریعہ ثابت ہوں اس بنا پر خود عقل بھی حکم خدا کی پہچان کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے لہذا ہم اس کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کی پیروی کرتے ہیں کیونکہ عقل خداوند عالم کے تشریحی ارادہ کی عکاسی کرتی ہے، لہذا معلوم یہ ہوا کہ یہ حکم وہی چیز ہے جس کو خداوند عالم نے ہم سے چاہا ہے اگر فقہی کتابوں میں بیان ہوا ہے کہ قرآن مجید، سنت نبوی کے علاوہ بھی احکام شرعی کو ثابت کرنے کے لئے ایک دوسری چیز بھی ہے جس کو عقل کھا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عقل بھی خدا کے احکام کو پہچاننے والے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے، اور عقل بھی قرآن و سنت کی طرح حکم خدا کو کشف کر سکتی ہے اور حکم خدا صرف قرآن و سنت میں منحصر نہیں ہے بلکہ احکام خدا وہ ہیں جس پر خدا کا ارادہ تشریحی متعلق ہو جو قرآن و سنت اور عقل کے ذریعہ کشف ہوتا ہے۔ قارئین کرام! اس اصطلاح اور معنی کے پیش نظر انسان کے تمام کام چاہے وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، چاہے حقوقی ہوں یا جزائی یا اندرونی ہو یا بیرونی اور بین الاقوامی تمام پر حکم شرعی اور حکم خدا شامل ہے؛ چاہے حکم خدا قرآن و سنت کے ذریعہ اثبات ہو یا عقلی طریقہ پر ثابت ہو البتہ توجہ رہے کہ عقلی حکم اس قدر واضح، روشن اور یقینی ہو کہ جس پر ہمیں اطمینان ہو جائے کہ جو کچھ عقلی دلیل کے ذریعہ ثابت ہوا ہے وہ خداوند عالم کے تشریحی ارادہ سے متعلق ہے۔

حوالے:

(۱) مشروطیت اس شاہی حکومت کو کھتے ہیں جس میں قوانین کے تحت کام کیا جائے (مترجم)

(۲) سورہ نساء آیت ۱۰۵

(۳) سورہ نساء آیت ۶۵

(۴) سورہ مائدہ آیت ۴۴

(۵) سورہ مائدہ آیت ۴۵

(۶) سورہ مائدہ آیت ۴۷

(۷) سورہ بقرہ آیت ۲۲۹

(۸) جن کو ہم فلسفہ سیاست کی تھیوریوں میں بیان کریں گے

چونتیسواں جلسہ

اسلامی احکام کی عظمت اور اس کی دوسرے نظام پر برتری

۱۔ حکومت اور متغیر احکام سے اسلامی ثابت احکام کی نسبت

جیسا کہ ہم گذشتہ جلسہ میں عرض کر چکے ہیں بعض دوسری فکر کہنے والے لوگ اخباروں اور اپنی تقریروں میں یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ احکام اور قوانین جن کو معاشرہ کی ضرورت ہوتی ہے ان کو پارلیمنٹ میں طے ہونا چاہئے، اور اگر ہم صرف قرآن و سنت میں بیان شدہ قوانین پر اکتفاء کرنا چاہیں تو کسی بھی صورت میں معاشرہ کی ضرورت پوری نہیں ہوگی حالانکہ ہمارے جمہوری اسلامی نظام میں (جیسا کہ دوسرے ڈیموکریٹک ممالک میں ہوتا ہے) ممبر آف پارلیمنٹ کے ذریعہ قوانین بنائے جاتے ہیں، تو پھر ہمیں اپنی اس حکومت کو ”اسلامی حکومت“ کا نام دینے، اور پارلیمنٹ میں مصوب قوانین کو ”اسلامی قوانین“ کہنے کی کیا پڑی ہے؟ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر ملک میں عوام الناس کے ذریعہ منتخب ممبر آف پارلیمنٹ اسی ملک کی ثقافت کے لحاظ سے قوانین بناتے ہیں اور قوانین کو طے کرنے میں ہی اس معاشرہ کے اقدار کا احترام کرتے ہیں لیکن چونکہ ہمارے ملک کے عوام الناس مسلمان ہیں اور اس میں خاص ثقافت کا رواج ہے، ممبر آف پارلیمنٹ اسلامی اور دینی ثقافت کا کم و بیش لحاظ کرتے ہیں لیکن بھر حال ہمارے ملک میں قانون گذاری کا وہی طریقہ ہے جو ڈیموکریٹک ممالک میں موجود ہے لہذا ہم کو اپنی حکومت کو اسلامی حکومت کہنے اور اسلامی قوانین نافذ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

قارئین کرام! جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اسلامی احکام کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ثابت احکام۔ ۲۔ متغیر احکام، جو حالات کے متغیر ہونے سے بدل جاتے ہیں۔

لیکن انسانی معاشرہ کے حالات بدلنے سے اسلامی ثابت احکام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور ان کی شکل صورت میں کسی بھی وقت کوئی تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ ثابت رہتے ہیں، اور ہر زمانہ اور ہر حال میں ان پر عمل کرنا ضروری ہے اب اگر ملکی قوانین کو مصوب کرتے وقت اسلام ثابت احکام کی رعایت نہ کی جائے اور قوانین اسلام کے خلاف قوانین بنائے جائیں تو وہ قوانین غیر اسلامی ہوں گے؛ چاہے تمام ہی ممبر آف پارلیمنٹ متفق طور پر ان قوانین کو طے کریں، اور اسلام کے مخالف قوانین کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے، بلکہ اس کو قانون ہی نہیں کہا جاسکتا جیسا کہ ہمارے ملکی بنیادی قانون میں موجود ہے کہ اسلامی ملک کے تمام قوانین؛

اسلامی اصول کے عین مطابق ہونا ضروری ہے یہاں تک کہ اگر کوئی قانون؛ شرعی ادلہ کے عموم اور اطلاق کے خلاف ہوگا تو اس کی کوئی قانونی حیثیت نہ ہوگی

اس بنا پر، وہ اسلامی ثابت احکام جو قرآن کریم اور روایات متواتر اور معتبر روایات میں ثابت احکام کے عنوان سے بیان کئے گئے ہیں ان کی رعایت کرنا ضروری ہے اور ان میں کسی بھی طرح کا کوئی نسخ اور تبدیلی نہ ہو اس کے مقابل میں بعض وہ متغیر احکام ہیں جو حالات اور علاقہ کے لحاظ سے قابل تبدیل ہیں البتہ ان کو معین کرنا علماء اور مجتہدین کا کام ہے۔

اگرچہ متغیر احکام کو آج کل کے زمانہ میں ”قوانین موضوعہ“ کے عنوان سے جانا جاتا ہے جو قانون گذاری اداروں میں تصویب ہوتے ہیں، لیکن اسلامی ثقافت میں اور فقہی اصطلاحات میں متغیر احکام وہی سلطنتی احکام ہیں جن کو معین کرنا ولی فقیہ کے دائرہ اختیار میں ہے اور ولی فقیہ ہی معاشرہ کے مختلف حالات کے لحاظ سے ان کو معین کرے اور ان کو نافذ کرے، اور کم سے کم مصوب شدہ قوانین کو جاری کرنے کے لئے ولی فقیہ کی تائید ضروری ہے البتہ کبھی ولی فقیہ بطور مستقیم قوانین اور مقررات کو معین اور مصوب کرتا ہے، اور کبھی اپنے ان مشاورین کے ذریعہ جو مد نظر مسائل میں کافی مہارت اور تجربہ رکھتے ہیں ان کے ذریعہ قوانین مصوب کرتا ہے، اور ضروری بحث و گفتگو کے بعد قوانین طے پاتے ہیں بھر حال موضوعہ قوانین و مقررات کا اعتبار ولی امر مسلمین کی اجازت اور اس کی موافقت پر ہوتا ہے، ورنہ تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔

قارئین کرام! اس بات پر توجہ رہے کہ ولی امر مسلمین اور دوسرے قانون گذار اداروں کو اس بات کا ذرہ بھی حق نہیں ہے کہ وہ اسلامی اصول قواعد اور اسلامی اقدار کو مد نظر رکھے بغیر اپنی مرضی سے کوئی متغیر قانون بنائیں دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ قوانین موضوعہ اور متغیر قوانین کو بھی اسلامی اصول اور اسلامی ثابت اور کلی احکام کے تحت ولی فقیہ اور فقہی مسائل کے ماہرین (جو اس سلسلہ میں کافی مہارت رکھتے ہوں اور ان قوانین کے مصداق کو بخوبی مشخص اور معین کر سکتے ہوں)؛ کے ذریعہ طے ہونا چاہئیں؛ نیز ان کو مصوب کرنے میں اسلامی اقدار کی رعایت کرنا بھی ضروری ہے اسی وجہ سے قوانین کلی کے حدود کو معین کرنا اور ان کے مصادیق اور موضوعہ قوانین پر منطبق کرنا اسی طرح اسلامی اقدار کا موضوعہ قوانین پر تطبیق کرنا ایک مشکل کام ہے جس میں بھت زیادہ دقت اور فقہی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے، جمہوی اسلامی ایران کے بنیادی قوانین میں موجود ہے کہ اسلامی پارلیمنٹ کے ذریعہ بنائے ہوئے قوانین کو ”شوری نگہبان“ (جو برجستہ مجتہدین اور حقوق داں حضرات سے مل کر بنتی ہے)؛ کے ذریعہ تائید ہوں تاکہ یہ دیکھ لیا جائے کہ خدا نخواستہ یہ قوانین اسلامی اصول کے مخالف تو نہیں ہیں؟

احکام ثانویہ اسلام سے ٹکراتے ہیں (ایک اعتراض) بعض لوگ تصور کرتے ہیں کہ وہ احکام سلطنتی، وقتی اور وہ قوانین جو زمانہ اور حالات کے لحاظ سے وضع کئے جاتے ہیں بعض موارد میں اسلامی احکام کے مخالف ہوتے ہیں؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام الناس صرف اسلام کے احکام اولیہ کو اسلامی احکام جانتے ہیں اور وہ اس چیز سے غافل ہیں کہ اسلام نے مجبوری اور ضرورت کے وقت احکام ثانویہ بھی وضع کئے ہیں اور وہ بھی احکام شرعی شمار ہوتے ہیں۔

وضاحت: اسلام کے اولیہ احکام جو عام حالات کے لئے وضع کئے گئے ہیں ان کے علاوہ دوسرے احکام بھی اسلام نے وضع کئے ہیں جو مجبوری اور ضرورت کے وقت کے لئے ہوتے ہیں جن کو احکام ثانویہ کہا جاتا ہے اور یہ احکام ثانویہ کچھ تو قرآن مجید اور سنت نبوی میں ذکر ہوئے ہیں لیکن ان میں سے بعض دینی کتابوں میں ذکر نہیں ہوئے ہیں، ان کو وضع کرنا ولی امر مسلمین کے اختیار میں ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر نماز پڑھنے کے لئے وضو کرنا واجب ہے یا اگر ہم پر غسل واجب ہے تو نماز کے لئے غسل کرنا واجب ہے وضو اور غسل کا وجوب احکام اولیہ اور عام حالات سے متعلق ہیں کہ جب مثلاً ہمارا بدن سالم ہو اور پانی ہمارے لئے نقصان دہ نہ ہو اور پانی موجود بھی ہو لیکن اگر کوئی مجبوری پیش آجاتی ہے یا کسی بیماری کی وجہ سے وضو یا غسل کرنا ممکن نہ ہو، مثلاً پانی موجود نہ ہو یا اگر پانی موجود ہے تو وہ نقصان دہ ہے، تو اس صورت میں وضو یا غسل واجب ہونے کی جگہ وجوب تیمم جو حکم ثانویہ ہے؛ اس کی جگہ آجاتا ہے اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اگر آپ کے پاس پانی نہ ہو یا پانی بدن کے لئے نقصان دہ ہو تو وضو یا غسل کے بدلے تیمم کرنا ضروری ہے۔

جب احکام اولیہ اور احکام ثانویہ جن کو احکام اضطراری بھی کہا جاتا ہے؛ قرآن مجید اور روایات میں ذکر ہوئے ہیں تو ہم ان کے درمیان کوئی فرق نہیں پاتے چونکہ حکم اولیہ (جیسے وضو یا غسل) کا موضوع اس وقت ہے جس وقت پانی ہمارے پاس موجود ہو اور وہ نقصان دہ بھی نہ ہو، اور احکام ثانویہ یعنی تیمم اس شخص کے لئے ہے جب کسی شخص کے پاس پانی نہ ہو یا پانی اس کے بدن کے لئے نقصان دہ ہو؛ اسی وجہ سے بعض لوگوں کو وضو کرنے کا حکم ہے اور بعض لوگوں کو تیمم کرنے کا حکم ہے لیکن بعض مقامات پر احکام اولیہ کے مقابلہ میں جو مجبوری اور اضطراری وقت کے لئے ہوں خاص احکام شریعت میں ذکر نہیں ہوئے ہیں تو یہیں پر اسلام کے احکام اولیہ جاری کرنے کو کہا جاتا ہے، مگر یہ کہ باعث عسر و حرج ہوں؛ کیونکہ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ بندگانِ خدا اپنے وظیفہ پر عمل کرنے میں غیر قابل تحمل مشقت اور حرج میں گرفتار ہوں، جیسا کہ ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

(وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ) (۱)

”اور دین میں کوئی زحمت نہیں قرار دی ہے۔“

(يُرِيدُ اللَّهُ بِيُكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِيُكُمُ الْعُسْرَ) (۲)

”خدا تمہارے بارے میں آسانی چاہتا ہے، زحمت نہیں۔“

قارئین کرام! ہمارے گذشتہ مطالب کے پیش نظر فقہاء کہتے ہیں کہ اگر انسان اپنے وظیفہ اور حکم شرعی پر عمل کرنے سے عسر و صرج میں مبتلا ہو تو خداوند عالم اس وظیفہ کو اٹھا لیتا ہے قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ بعض مقامات پر احکام اولیٰ کا بدل احکام ثانوی شریعت میں بیان ہوا ہے لیکن بعض موارد میں احکام ثانوی اور اضطراری شریعت میں بیان نہیں ہوئے ہیں، لیکن ولی فقیہ کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ اگر احکام اولیہ پر عمل کرنا ممکن نہ ہو اور عوام الناس کے لئے باعث عسر و صرج ہو تو اس صورت میں عوام الناس کا وظیفہ معین کرے لہذا جو کچھ بھی ولی فقیہ اسلامی اصول و قوانین کے تحت حکم بیان کرے تو وہ احکام ثانوی اور اسلامی حکم ہوگا؛ کیونکہ اس نے اس (ولی فقیہ) کو جب عسر و صرج کی صورت میں تکلیف اولیٰ اٹھالی جائے تو عوام الناس کے وظیفہ اور عمل کو معین کرنے کا حکم دیا ہے۔

لہذا چونکہ بعض لوگ صرف اسلام کے احکام اولیٰ سے آشنائی رکھتے ہیں اسی وجہ سے یہ تصور کرتے ہیں کہ اسلامی احکام صرف یہی ہیں، اور اگر ولی امر مسلمین یا اسلامی حکومت کے دوسرے قانون گزار اداروں سے اسلام کے احکام اولیٰ کے خلاف قانون بننا دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ قانون اسلام کے مخالف ہے جبکہ وہ قانون احکام شرع اور اسلام کے مخالف نہیں ہے بلکہ اسلام کے اولیہ احکام کے مخالف احکام کو احکام ثانوی میں شمار کیا جاتا ہے اور بے شک احکام ثانوی (بھی) اسلامی احکام مانے جاتے ہیں جس طرح اسلام نے حکم دیا ہے کہ مسافر کو روزہ نہیں رکھنا چاہئے اور جو مسافر نہیں ہے (اگر دوسرے شرائط موجود ہیں) تو اس کو روزہ رکھنا چاہئے اور کوئی مسافر کے روزہ نہ رکھنے کو اسلامی احکام کا مخالف شمار نہیں کرتا، کیونکہ خود اسلام نے صاف طور پر ارشاد فرمادیا ہے کہ جو شخص مسافر یا مریض ہے اس پر روزہ واجب نہیں ہے (مَنْ شَهِدَ مِنْكُمْ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَاللَّيْسُ بِكُمُ الْعُسْرَ) (۳) اسی طرح احکام اجتماعی، مدنی، جزائی، تجارتی اور دوسرے معاملات میں اگر احکام اولیٰ کے مطابق عمل کرنا ممکن نہ ہو اور موجب عسر و صرج ہو تو وہ حکم ثابت نہیں رہے گا اور خاص قواعد اور مقررات کے تحت ولی امر مسلمین زمان و مکان کی حالات کی بنا پر نئے قوانین کو وضع کرتا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ وہ قوانین اسلامی احکام کے مخالف نہیں ہوں گے، بلکہ (اگر ہوں گے بھی تو) اسلامی احکام کے مخالف ہوں گے اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ اسلام کے احکام ”احکام اولیٰ“ اور ”احکام ثانوی“ دونوں کو شامل ہوتے ہیں۔

اسلامی معاشرہ میں درپیش جدید تقاضوں کے تحت جو ہمیشہ اجتماعی حالات کے بنا پر رونما ہوتے ہیں (مثلاً ٹریفک کی سہولت کے لئے اور گاڑیوں کی بھیڑ سے بچنے کے لئے سڑکوں کو چوڑا کرنا یا میونسپلٹی "Municipality" کو صفائی یا شہر کو خوبصورت بنانے کے لئے پیش آنے والی ضرورتیں، یا محکمہ آب اور بجلی کی دیگر ضرورتیں جو قدیم زمانہ میں نہیں تھیں) یا آج کل کی ترقی کے پیش نظر معاشرہ کی وہ ضرورتیں جن کو خود عوام الناس پورا نہیں کر سکتے اور گذشتہ زمانہ کی ضرورتوں کی طرح نہیں ہیں کہ جن

کو خود عوام الناس انجام دیا کرتے تھے، تو ان تمام صورتوں میں متعلقہ محکمہ جات کا ضروری قوانین بنانا ضروری ہے ہماری گفتگو یہ ہے کہ یہ قوانین بغیر کسی اصل کے نہیں ہیں اور بے حساب و کتاب لوگوں کی اپنی مرضی سے نہیں بن جاتے؛ بلکہ یہ قوانین اور احکام ثانوی اسلامی عام قوانین کے تحت ہونے چاہئیں اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ یہ احکام ثانوی اہم کو مہم پر ترجیح دینے کی طرح ہوں، یا ان قوانین کو زمان و مکان کے حالات کے پیش نظر بنایا جائے جیسا کہ ہمارے ملک میں یہ احکام ثانوی ”مجلس شوریٰ اسلامی“ میں اور ولی فقیہ کی اجازت سے بنائے جاتے ہیں اس صورت میں یہ احکام؛ اسلامی احکام سے باہر نہیں ہوتے (یعنی ان کو اسلامی احکام میں شمار کیا جاتا ہے) کیونکہ یہ تمام قوانین ولی امر مسلمین کے حکم سے بنائے جاتے ہیں، یا دوسرے خاص قوانین جیسے قاعدہ ”عسرو صرح“ یا قاعدہ ”لا ضرر“ یا ان دوسرے قواعد کے تحت جو فقہی کتابوں میں وارد ہوئے ہیں؛ کے تحت یہ احکام ثانوی بنائے جاتے ہیں۔

قارئین کرام! یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اسلامی حکومت میں قوانین کو یا اسلامی منابع؛ جیسے قرآن کریم اور سنت نبوی سے لئے جاتے ہیں (اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ عقل بھی اسلامی منابع میں شمار ہوتی ہے اور ”مستقلات عقلیہ“ اور احکام قطعی عقل معتبر ہوتے ہیں اور فقہی اصطلاح میں حکم قطعی عقل کے ذریعہ خداوند عالم کے ارادہ تشریحی کو کشف کیا جاسکتا ہے کہ یہ حکم عقل بھی خداوند عالم کے ارادہ اور اس کی مرضی سے متعلق ہے اسی وجہ سے یہ حکم ”اسلامی حکم“ ہوگا) یا کسی بھی طریقہ سے قرآن و سنت میں بیان شدہ عام احکام کے تحت واقع ہونے چاہئیں اسی وجہ سے یہ بھانہ کمرتے ہوئے کہ اسلامی حکومت کے بعض قوانین اور مقررات ناپائیدار اور تغیر پذیر؛ قرآن مجید اور سنت نبوی میں ذکر نہیں ہوئے ہیں، لہذا قرآن مجید اور سنت نبوی (ص) کو بالائے طاق رکھ دیا جائے، اور عوام الناس کی مرضی کے مطابق قوانین بنائے جائیں اسلام کے ثابت احکام پر ہمیشہ عمل ہونا چاہئے اور احکام متغیر ہمیشہ اسلامی اصول، احکام ثابت اور عام قوانین کے تحت ولی فقیہ یا اس کی طرف اذن یافتہ لوگوں کے ذریعہ بنائے جائیں۔

۳۔ ڈیموکریٹک حکومتوں کے نقائص

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ حکومت کی مشکل ایک ”مثلث القاعدہ“ زاویہ کی طرح ہے جس کے تین پہلو ہوتے ہیں: ۱۔ قوہ مقننہ (پارلیمنٹ)، ۲۔ قوہ قضائہ (عدلی) اور قوہ مجریہ (حکومت) اور حکومت کی یہ شکل ”منٹسکیو“ سے شروع ہوئی اور رائج ہوتی چلی گئی۔

بھر حال اگرچہ اس (ہماری) حکومت بھی تین قدرتوں سے تشکیل پائی ہے لیکن اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ آئندہ بھی اسی طریقہ سے باقی رہے کیونکہ آئندہ زمانہ کی ترقی کے پیش نظر یا اجتماعی حالات کی تبدیلی کی وجہ سے حکومت کی شکل بدل سکتی ہے

مثال کے طور پر حکومت کی قدرتوں میں اضافہ ہو جیسا کہ ”مربع القاعدہ“ ہو جائے یا ”مخمس القاعدہ“ ہو جائے لیکن توجہ رہے کہ اصل اور بنیادی قاعدہ یہ کہ حکومت کو تشکیل دینے والی تمام قدرتیں مرکز کی طرف منتھی ہوتی ہوں یعنی جب حکومتی صورت کو جو مختلف قدرتوں سے تشکیل پاتی ہے تو مثلث القاعدہ ہرم سے تشبیہ کرتے ہیں تو اگر اس ہرم کے اوپر سے نیچے کی طرف آئیں تو اس کا دائرہ زیادہ ہو جائے گا یہاں تک کہ اس قاعدہ ہرم اور اس کے نیچے حکومتی بھت سے ادارے دکھائی دیتے ہیں لیکن ہرم کے نیچے سے اہستہ اہستہ اوپر کی طرف جائیں تو پھر حکومتی قدرت اور حکومتی ادارے متمرکز اور جمع ہوتے ہوئی دکھائی دیں گی، یہاں تک کہ تمام قدرتیں اس ہرم کے سرے تک پہنچ جائیں گی، اور سب ایک نقطہ میں سما جائیں گی، اور وہ وسیع اور متفرق قدرت بسیط اور وحدت کی شکل میں دکھائی دے گی۔

ہرم قدرت میں اس کے علاوہ کے مثلث القاعدہ قدرتیں اس نقطہ کی طرف منتھی ہوتی ہیں جو اس کے مرکز میں ہوتا ہے اور وہی نقطہ تمام قدرتوں کا مرکز ہوتا ہے اور حکومتی تمام تر قدرت اور اختیارات بسیط ہو کر وہاں جمع ہو جاتے ہیں، اور چونکہ حکومتی قدرت اور اختیارات وہاں سے تقسیم ہو کر مختلف شکلوں: قانون گذاری، عدلیہ اور اجرائی شعبوں میں پھیل جاتی ہے اور ان میں سے ہر قدرت اپنے خاص مراتب سے سروکار رکھتی ہے۔

اس وقت دنیا بھر کے ممالک میں حکومت کی اسی شکل و صورت کو قبول کیا گیا ہے جس میں تین قدرتیں ہوتی ہیں: قانون گذاری، عدلیہ اور اجرائی پاور، لیکن ان تینوں قدرتوں کا ایک نقطہ میں جمع ہونا واضح طور پر نہیں دکھائی دیتا؛ یعنی ان حکومتوں میں اصل یہ ہے کہ حکومت مستقل تین حصوں میں بٹ جاتی ہے اور ایک قدرت کا ایک حصہ قوہ مجریہ (حکومت) میں چلا جاتا ہے اور ایک حصہ قانون گذاری میں اور تیسرا حصہ عدلیہ کا ہوتا ہے؛ اور ان میں نہ قوہ مجریہ دوسری قدرتوں میں دخالت کرتی ہے اور نہ دوسری قدرتیں قوہ مجریہ میں دخالت کرتی ہیں اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا ان قدرتوں میں عملی طور پر استقلال دکھائی نہیں دیتا، اور بھت سے وہ موارد جو اجرائی اور نفاذ کا حکم رکھتے ہیں جن کی وجہ سے ان کو قوہ مجریہ کے تحت ہونا چاہئے لیکن ان کی اہمیت کے پیش نظر قانون گزار پاور کی دخالت کو معتبر سمجھا جاتا ہے مثال کے طور پر بین الاقوامی سطح نیز دو ملکوں کے درمیان ہونے والے مہم معاہدات، حالانکہ یہ چیزیں اجرائی پہلو رکھتی ہیں لیکن ان کے بارے میں پہلے پارلیمنٹ پاس کرے تب وہ معاہدات انجام پاتے ہیں، اور یہیں پر قوہ مجریہ میں پارلیمنٹ کی دخالت دکھائی دیتی ہے۔

دوسری طرف حکومتی کابینٹ "Cabinet" بعض قوانین اور مقررات کو تصویب کرتی ہے، اور ان کو نافذ کرتی ہے اگرچہ ان پر قانون کے عنوان کا اطلاق نہیں ہوتا لیکن قانونی ماہیت رکھتے ہیں اور ان کا طے کرنا پارلیمنٹ کے مخصوص کام میں سے ہے لیکن بنیادی قوانین میں موجود بعض وجوہات کی بنا پر اس کو طے کرنا حکومت کے عہدہ پر ہوتا ہے اسی وجہ سے قانون گذاری کا ایک حصہ حکومت کے سپرد کیا جاتا ہے لہذا معلوم یہ ہوا کہ حکومت پارلیمنٹ میں دخالت کرتی ہے بھر حال مختلف ممالک میں کم و

بیش قدرتیں ایک دوسرے میں دخالت کرتی ہیں، اور یہ محدود دخالت اس وجہ سے بھی ہے کہ چونکہ حکومتیں ایک دوسرے سے مل کر ایک حکومت کو تشکیل دیتے ہیں، اور اگر یہ بالکل ایک دوسرے سے الگ الگ ہو جائیں تو گویا اس کا اتحاد ختم ہو جائے گا۔

۲۔ قدرتوں میں ہم اہنگ کرنے کے اسباب کا ہونا ضروری ہے

اگرچہ حکومت تین قدرتوں (قوہ مجریہ، قوہ عدلیہ اور قوہ مقننہ) سے تشکیل پاتی ہے لیکن ان تینوں قدرتوں میں ایک دوسرے سے رابطہ ضروری ہے، اور چونکہ انہیں ان تینوں قدرتوں سے مل کر ہی حکومت بنتی ہے تو ان قدرتوں کے لئے کچھ ایسے اسباب ہونا ضروری ہیں جن کے درمیان اتحاد اور وحدت قائم رہے لیکن دنیا بھر کے ممالک میں ان قدرتوں میں ہم اہنگ کرنے والی قدرت نہ ہونے کی بنا پر ان کے درمیان میں ناہماہنگی دکھائی دیتی ہے جس کی بنا پر ملک میں بحرانی حالات پیدا ہو جاتے ہیں اس طرح کے بحران سے بچنے کے لئے بعض حکومتوں میں بھت سی راہ حل پیش کی گئی ہیں جن میں سے صدر مملکت کے لئے ”حق وٹو“ "Veto" رکھا جاتا ہے: مثال کے طور پر اگرچہ پارلیمنٹ کو قوانین بنانے اور ان کو طے کرنے کا حق ہوتا ہے، اور پارلیمنٹ اسی ذمہ داری کے تحت ممبر آف پارلیمنٹ (کسی بھی قانون بنانے کے لئے) بھت بحث و گفتگو کے بعد قوانین بناتے ہیں، اس کے بعد وہ قوانین ”مجلس سنا“ "S' enat" کے ذریعہ تائید ہوتے ہیں لیکن چونکہ صدر مملکت کے لئے حق وٹو ہوتا ہے (تو اگر وہ قوانین ناقص ہوتے ہیں تو) صدر مملکت ان کو روک دیتا ہے چاہے کچھ ہی مدت کے لئے ہی کیوں نہ ہو اور ان کو نافذ نہیں ہونے دیتا اگر قوانین بنانا پارلیمنٹ کا حق ہے اور قوہ مجریہ (صدر مملکت) کو پارلیمنٹ میں دخالت کرنے کا حق نہیں ہے، تو پھر پارلیمنٹ کے بنائے گئے قوانین کو قوہ مجریہ کسی طرح روک دیتا ہے اور ان کو نافذ نہیں ہونے دیتا؟ پس معلوم یہ ہوا کہ قدرتوں کا استقلال مکمل طور پر عملی نہیں ہوتا اور عملی طور پر پارلیمنٹ اور حکومت کے وظائف میں ہم اہنگی پائی جاتی ہے۔

اسی طرح ان قدرتوں میں ہم اہنگ کرنے والے اسباب کے نہ ہونے کی وجہ سے بھت سے ممالک میں سیاسی، پارٹی اور گروہی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے جس کی بنا پر قدرتوں میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور ممکن ہے کہ بعض مواقع پر حالات اس قدر بگڑ جائیں کہ ملک میں کوئی حکومت ہی نہ ہو اور عملی طور پر حکومت ختم ہو جائے مثال کے طور پر اگر کوئی حکومت بنے اور قدرت اپنے ہاتھ میں لے لے، لیکن ایک مدت کے بعد پارلیمنٹ میں اس کے لئے اعتماد ختم ہو جاتا ہے اور حکومت ٹوٹ جاتی ہے اور اس کے بعد (جلد) کوئی حکومت نہ بن سکے، کیونکہ جو شخص بھسی وزیر اعظم بنا چاہتا ہے اور اس کے لئے وزراء کا کابینہ "Cabinet" بنانا چاہے تو اگر ممبر آف پارلیمنٹ کا اعتماد کا ووٹ حاصل نہ کر سکے؛ کیونکہ پارلیمنٹی حکومتوں میں صرف وہی پارٹی حکومت بنا سکتی ہے جس کے پارلیمنٹ میں ممبروں کی اکثریت ہو یا دوسری پارٹی کے ممبروں کو شامل کر کے اپنی اکثریت ثابت کر دے۔

اور جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں کہ انہیں آخری چند سالوں میں ہمارے پڑوسی ملک میں کافی مدت تک حکومت نہ تھی؛ کیونکہ جو شخص بھی وزیر اعظم بنا چاہتا تھا اس کو اعتماد کا ووٹ ہی نہیں ملتا تھا البتہ کسی نہ کسی طریقہ بھت سے حکومتی امور انجام پاتے ہیں لیکن چونکہ جب وزیر یا معاون وقتی (عبوری) ہوں تو ان کو کاموں میں زیادہ دل چسپی نہیں ہوتی؛ اور مثال کے طور پر اگر کسی ملک میں چہ ماہ تک بغیر دل چسپی کے کام کیا جائے تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس ملک کا کتنا نقصان ہوگا۔

بعض ملکوں میں صدر مملکت کو یہ حق ہوتا ہے کہ چاہے وقتی طور پر بھی صحیح پارلیمنٹ کو منحل کر دے، اور یہیں حکومت کا پارلیمنٹ میں دخالت کرنا ظاہر ہوتا ہے یہاں تک بعض مواقع پر تو پارلیمنٹ کو منحل کر دیا جاتا ہے ظاہر سی بات ہے کہ اس طرح کی دخالتیں اختلاف، جھگڑوں اور بعض حالات میں شدید بحرانی حالات پیدا ہونے کا باعث ہو جاتا ہے، اس کی علت یہ ہے کہ یا تو ان حکومتوں میں ان بحرانی حالات سے نپٹنے کے لئے کوئی راہ حل پیش نہیں ہوتا یا اگر وہ راہ حل پیش بھی کیا گیا ہے تو وہ اتنا زیادہ کار آمد نہیں ہوتا؛ مثلاً بعض حکومت میں صدر مملکت کے ہاتھوں میں حکومتی نظام نہیں ہوتا بلکہ صرف ایک تشریفاتی عہدہ ہوتا ہے (جیسا کہ خود ہندوستان میں ہوتا ہے) لیکن اگر ملک میں بحرانی حالات پیدا ہو جائیں تو پھر صدر ہی حکومتی امور کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے اور اس بحرانی کیفیت کو ختم کرتا ہے درحقیقت اپنا کردار بحرانی حالات میں نمایا کرتا ہے۔

۵۔ ولایت فقیہ حکومت کو ہم اہنگ کرنے والی طاقت

قارئین کرام! یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اس وقت جبکہ بھت سے ممالک میں بحرانی حالات سے نپٹنے کے لئے بعض راہ حل پیش کئے گئے ہیں لیکن کوئی بھی ضروری طور پر کارآمد نہیں ہے، اور ان قدرتوں کے درمیان ایک دوسرے میں دخالت کرنے والی جیسی برائی باقی ہے لیکن نظام ولایت فقیہ میں (کہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض خود غرض مولفین اور بے انصاف زر خرید اہل قلم (اس ولایت فقیہ کو بھی) ارتجاعی (قدیم زمانہ کی طرف لوٹانا) کے نام سے پہنچواتے ہیں) اس طرح کے اسباب فراہم ہیں تاکہ ملک میں بحرانی حالات سے نجات دے، اور نظام کو ہر ممکن پریشانی سے نجات مل جائے اور ملک کو کوئی نقصان نہ پہنچے ہمارے ملک میں بھی دوسرے ملکوں کی طرح قوہ مجریہ ہے جس میں صدر مملکت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اسی طرح پارلیمنٹ اور عدلیہ بھی ہے جو ایک دوسرے سے الگ اور مستقل ہے، لیکن یہ تمام (قدرتیں) اس ایک نظام کی قدرتیں ہیں، اور ایک دوسرے سے ربط رکھتے ہیں جو ایک مرکزی نقطہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور جو شخص اس نظام میں نقطہ مرکزی اور اصلی ہوتا ہے وہ قدرت کے بلند ترین مقام پر ہوتا ہے وہ ولی فقیہ ہوتا ہے جو تمام قدرتوں میں اتحاد اور وحدت ایجاد کرتا ہے۔

برخلاف دوسری حکومتوں میں کوئی ایسا محور نہیں پایا جاتا جو ان قدرتوں میں ہم اہنگی اور وحدت ایجاد کرے اور اگر ان حکومتوں میں کوئی ایسا راہ حل بھی پیش کیا گیا ہے تو وہ بھت ضعیف اور کمزور ہے، نظام ولایت فقیہ میں مذکورہ تینوں قدرتیں ایک

مرکزی نقطہ (ولی فقیہ) کے زیر سرپرستی ہوتی ہیں در حالیکہ وہ بنیادی قانون کا بھی حافظ ہوتا ہے اور اسلامی احکام، اقدار اور انقلابی اہداف کا بھی محافظ اور نگہبان ہوتا ہے؛ اسی طرح مذکورہ تینوں قدرتوں کو متحد اور ہم آہنگ رکھتا ہے اور سبھی کو وحدت، دوستی اور ہمہدلی کی دعوت دیتا ہے اور اختلافات سے محافظت کرتا ہے اگر اتفاقی طور پر ملک میں کوئی بحرانی صورت حال پیدا ہوگئی ہے تو یہی اختلافات کو دور کر کے ملک کو بحرانی صورت حال سے نجات عطا کرتا ہے۔

انقلاب اسلامی کے بعد سے بیس سال کے عرصہ میں چاہے حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ ہو یا مقام معظم رہبری حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی کا زمانہ ہو؛ خواستہ یا نحواستہ معاشرہ میں اختلافات کی وجہ سے ملک میں متعدد بار بحرانی صورت حال پیدا ہونے والی تھی لیکن اگر (ولی فقیہ کی) حکیمانہ تدبیریں نہ ہوتیں تو واقعاً ملک کبھی کا بحران کی نذر ہو جاتا جیسا کہ آج کل ترکی، پاکستان، بنگلادیش اور افغانستان میں بحرانی صورت حال ہے الحمد للہ اس عظیم اور خداداد نعمت کی برکت سے اور اس لطف و مہربانی اور اس محبت کی وجہ سے جو ان کے اور عوام الناس کے درمیان موجود ہے اس طرح کے بحرانی صورت حال سے نجات ملتی رہتی ہے۔

۶۔ دوسری حکومتوں پر ولایت فقیہ نظام کے امتیازات

قارئین کرام! یہاں پر ہمارا اپنی اس اسلامی حکومت کا دوسری ان ڈیموکریٹک حکومتوں سے مقابلسہ (مقابلہ) کرنا مناسب ہے جو آج کل کی پیشرفتہ حکومتیں جانی جاتی ہیں؛ اس اسلامی حکومت کے مقابلسہ میں امتیازات اور خصوصیات بیان کریں:

الف۔ اندورنی انسجام و یگانگت

ہماری حکومت کا سب سے پہلا امتیاز اور خصوصیت اندورنی انسجام و وحدت ہے جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ تمام ڈیموکریٹک حکومتوں میں ڈیموکریسی کی سب سے بڑی پہچان قدرتوں میں استقلال اور ایک دوسرے میں دخالت نہ کرنا مانا جاتا ہے ہم نے ان حکومتوں کے کچھ اندورنی تعارض اور ٹکراؤ کو بیان کیا اور کھا کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ مذکورہ قدرتوں کو ایک دوسرے میں دخالت نہیں کرنا چاہئے لیکن عملی میدان میں کوئی ایک بھی ایسا ملک نہیں ہے جس میں مذکورہ قدرتیں ایک دوسرے سے مکمل طور پر مستقل ہوں اور ایک دوسرے میں دخالت نہ کرتی ہوں، اور قانونی طور پر قدرتوں کے لئے ایک دوسرے میں دخالت کا ذرا بھی اختیار نہ ہو، غیر قانونی دخالت، خلاف ورزیوں اور تحت فشار قرار دینے کے علاوہ؛ ہم عملی طور پر دیکھتے ہیں کہ (جب) قدرت ایک طاقت کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اپنی تمام تر طاقت کے بل بوتہ پر دوسری طاقت کو تحت فشار قرار دیتی ہے جب پولیس اور فوجی طاقت؛ اسی

مالی، اقتصادی امکانات، پورے ملک کا خرچ حکومت کے ہاتھ میں ہوتا ہے تو پھر دوسری قدرتیں اس سے متاثر ہوں گی اور صدیا وزیر اعظم اگر اپنی قدرت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ دنیا بھر کی تمام ڈیموکریسی حکومتوں میں ایک قسم کی تفرقہ اور ناہماہنگی پائی جاتی ہے، لیکن ہماری حکومت میں در حالانکہ تینوں قدرتوں میں اتحاد اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور اپنے اپنے اختیارات میں مستقل ہیں اور ان کے درمیان ناہماہنگی اور تفرقہ بھی پایا جاتا؛ کیونکہ ہماری حکومت میں ایک ایسا وحدت بخش سبب (ولایت فقیہ) پایا جاتا ہے جو تینوں قدرتوں کی سرپرستی کرتا ہے، ان میں انسجام اور وحدت برقرار رکھتا ہے، اور اس نظام اور حکومت کا اصلی محور ہونے کی وجہ سے بحرانی صورت حال پیدا ہونے سے روکے رکھتا ہے یہاں تک کہ ہم نے متعدد بار دیکھا کہ کس طرح مقام معظم رہبری حضرت آیت العظمیٰ خامنہ ای مدظلہ العالی نے کس طریقہ سے مختلف عہدہ داروں کے درمیان ہونے والے اختلافات کا خاتمہ کیا ہے اور اگر کبھی بحرانی صورت حال پیدا ہونے کی راہ ہموار ہو بھی گئی ہے تو قانونی طور پر صدر جمہوری نے مقام معظم رہبری سے درخواست کی کہ اپنی قدرت کے ذریعہ اس بحران سے روک تھام فرمائیں، اور موصوف نے بہترین طریقہ سے بحرانی صورت حال پر کنٹرول فرمایا ہے ولی فقیہ اگرچہ براہ راست کسی بھی ایک قدرت کا عہدہ دار نہیں ہے لیکن تینوں قدرتوں کے عہدہ دار براہ راست اس کے ذریعہ نصب ہوتے ہیں یا بنیادی قانون کے مطابق یہی عوام الناس کی رائے کو نافذ کرتا ہے اور اسی کے نصب اور نافذ کرنے سے تینوں قدرتوں کے عہدہ داران مشروعیت پیدا کرتے ہیں۔

ب۔ روحی اور اندرونی نفاذ کی ضمانت

دوسری حکومتوں پر ہماری حکومت کا ایک امتیاز یہ ہے کہ عوام الناس کے درمیان روحی اور اندرونی نفاذ کی ضمانت ہے اور یہ چیز اسلامی حکومت کے قوانین اور مقررات کی اطاعت کرنے کی ذمہ داری کے احساس سے حاصل ہوتی ہے اس طرح کی ضمانت اور کنٹرول دوسری حکومتوں میں موجود نہیں ہے اور تقریباً تمام ہی حکومتوں میں طاقت کے زور پر قوانین کو نافذ کیا جاتا ہے اور جہاں پر عوام الناس میں آزادی کا احساس ہو جائے یا وہ کنٹرول وغیرہ کم ہو جائے تو پھر اس پر عمل کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

آپ حضرات نے مکرر سنا ہوگا کہ یورپی ممالک میں قوانین کی رعایت بھت زیادہ کی جاتی ہے، مغربی اور یورپی ممالک میں عوام الناس آٹوٹیک طریقہ سے قوانین اور مقررات کی رعایت کرتے ہیں اور ٹیکس وغیرہ ادا کرتے ہیں اور اس طرح کا یہ ظاہری نظم و انضباط اس ترقی یافتہ حکومت کے کنٹرول کی وجہ سے ہوتا ہے کہ جس کی بنا پر عوام الناس قوانین کی رعایت کرتے ہیں اور مالیات اور ٹیکس وغیرہ ادا کرتے ہیں اور بھت ہی کم لوگ قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہاں پر ٹیکس وغیرہ حاصل کرنے کا سسٹم چند صدیوں سے چلا آ رہا ہے خصوصاً اس نصف صدی میں خاصا تجربہ ہوا ہے اور کمپیوٹر وغیرہ کے ذریعہ بہترین

سسٹم بنایا گیا ہے اور اسی بنا پر مختلف طریقوں سے ٹیکس وغیرہ حاصل کیا جاتا ہے اور عام طور پر عوام الناس آسانی سے ٹیکس ادا کرتے ہیں لیکن بڑی بڑی کمپنیاں جو حکومتی ملازمین سے سباز باز کئے رہتے ہیں وہ ٹیکس نہ ادا کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔

قارئین کرام! ہم یہاں پر، جو لوگ مغربی کلچر کے عاشق ہیں اور وہاں کے نظم و مدنیت کا شور مچاتے ہیں، ان کی خدمت میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں: مغربی ممالک کی بھت سی مدح اور تعریفیں صرف ایک نعرہ سے ہوتی ہیں جن میں حقیقت اور واقعیت نہیں ہوا کرتی مثال کے طور پر یہ کھا جاتا ہے کہ مغربی ممالک میں ڈرائیور قوانین کی بھرپور رعایت کرتے ہیں اور بہترین طور پر نظم و انضباط کا مظاہرہ کرتے ہیں؛ جبکہ یہ صرف ایک دعویٰ ہے، ہم یہاں پر مذکورہ دعویٰ کو باطل کرنے کے لئے ایک نمونہ پیش کرتے ہیں: ہم امریکہ کی "فیلڈیا یونیورسٹی" کی طرف سے ایک تقریر کے لئے مدعو ہوئے اور جب ہم "نیویورک" سے "فیلڈیا" کی طرف چلے تو راستہ میں مختلف شہروں کا دیدار کیا اسی راستے میں ہم نے دیکھا کہ گاڑی کا ڈرائیور اپنی گاڑی کے آگے کوئی چھوٹی سی مشین رکھتا ہے اور کچھ دیر بعد اس کو گاڑی کے داش بورڈ "Dashboard" میں رکھ دیتا ہے اور کچھ دیر بعد پھر اسی طرح کرتا ہے، ہمارے ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ اس سے معلوم کریں کہ یہ کس لئے ہے؟

تو اس نے بتایا کہ امریکہ میں ۹۰ میل فی ساعت کی رفتار سے زیادہ گاڑی چلانا ممنوع ہے اور پولیس نے خلاف ورزی سے روک تھام کے لئے سڑک پر "راڈار" لگا دئے ہیں جن کے ذریعہ سے جو لوگ غیر مجاز رفتار سے زیادہ گاڑی چلاتے ہیں ان کو پکڑ کر جرمانہ لگائے اس کے علاوہ خود بھی سڑک کے کنارے کمین لگائے بیٹھے رہتے ہیں تاکہ خلاف ورزی کرنے والوں پر جریمہ لگا سکے اور چونکہ گاڑیوں کی رفتار پولیس کے ذریعہ نصب شدہ راڈار کے ذریعہ کنٹرول ہوتی ہیں اسی وجہ سے بعض ماہرین نے ایسی مشین بنائی ہے جو اس راڈار کو اندھا کر دیتی ہیں اور اس وقت یہ مشین بازار میں آسانی کے ساتھ خرید و فروخت ہوتی ہے اسی وجہ سے راستہ میں پولیس لگی ہوئی ہوتی ہے تاکہ جو اس مشین کے ذریعہ ان کے راڈار کو اندھا کر کے بھت زیادہ رفتار سے گاڑی چلاتے ہیں ان کو روک کر جرمانہ لگا سکے، لہذا اس مشین کے لگانے کے بعد کسی بھی رفتار سے گاڑی چلا سکتے ہیں اور جب پولیس کے چک پوسٹ سے نزدیک ہوتے ہیں اس کو اتار کر چھپا دیتے ہیں اور پھر دوبارہ اس کو لگا دیتے ہیں!

قارئین کرام! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ وہ لوگ قوانین پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے اور قوانین کے محافظ پولیس کے کنٹرول کو بے اثر کرنے کے لئے ایک مشین ایجاد کرتے ہیں تاکہ پولیس کے راڈار کو اندھا کر دیں اور اس مشین کو امریکی بازاروں میں کافی مقدار میں خرید و فروخت کرتے ہیں اس وقت ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ امریکہ میں ایسا ترقی یافتہ کلچر ہے جس کی بنا پر عوام الناس اپنی مرضی اور رغبت سے قوانین پر عمل کرتے ہیں اور وہاں بہترین نظم و انضباط برقرار ہے وارداتیں وہاں پر جو مختلف ہوتی رہتی ہیں اس کی خبر ہم تک پہنچتی رہتی ہیں جو خود ایک بڑا تفصیلی پہلو رکھتی ہے ہمارے ایک دوست جو چند سال امریکہ میں رہ کر ایران واپس آئے، انھوں نے ہم سے بیان کیا کہ امریکہ کا کوئی بھی کلج ایسا نہیں ہے جس میں پولیس نہ ہو اس کے بعد بھی ہر روز وہاں پر قتل

وغارت ہوتا رہتا ہے، مثلاً ایک اسٹوڈنٹ اسلحہ کے ذریعہ اپنے استاد یا ہم کلاسیوں کی طرف گولی چلاتا ہے اور ان کو قتل کر دیتا ہے!! یہ ہے وہاں کا نظم اور انضباط!!

جی ہاں! مغربی ممالک میں قوانین پر اگر عمل ہوتا ہے تو وہ جرمانہ اور قید کے خوف کی وجہ سے ہوتا ہے اور اگر ان کو اس چیز کا خوف نہ ہو اور اس سے کسی بھی طریقہ سے محافظین کے کنٹرول کو بے اثر کر سکتے ہوں تو پھر قوانین کی خلاف ورزی کرنے میں ذرا بھی جھجھک نہیں ہوتی۔

لیکن ہماری اس اسلامی حکومت میں بیرونی کنٹرول کرنے والے اسباب جیسے جرمانہ اور جیل؛ کے علاوہ اندرونی مہم سبب بھی موجود ہے کہ اگر اس کو اور مزید تقویت پہنچائی جائے تو پھر معاشرہ کی بھت سی اجتماعی مشکلات حل ہو جائیں گی اور وہ سبب خود ان کے اندر قوانین پر عمل کرنے کا رجحان موجود ہے، اور اس کی وجہ ان کا اسلامی حکومت کے قوانین پر عمل کرنے کے ایمان کی وجہ سے ہے، درحقیقت عوام الناس حکومتی قوانین پر عمل کرنا اپنا شرعی وظیفہ سمجھتے ہیں اور یہ ظاہر سی بات ہے کہ اگر ہمارے ملک میں اسلامی حکومت نہ ہوتی اور حضرت امام خمینی (رہ) جیسے رہبر اور مرجع تقلید نے نہ فرمایا ہوتا کہ اسلامی حکومت کے قوانین پر عمل کرنا شرعاً واجب ہے، تو پھر عوام الناس جرمانہ اور دوسری سزاؤں سے بچنے کے لئے قوانین پر عمل کیا کرتے۔

آج اسلامی انقلاب کے طرفدار اور متدین افراد ولی امر مسلمین کی اطاعت کی وجہ سے اسلامی حکومت کے قوانین پر عمل کرتے ہیں؛ اگرچہ بعض موارد میں وہ جانتے ہیں کہ یہ قوانین ہمارے نقصان میں ہیں لہذا یہ اندرونی اور معنوی سبب جو ان کے ایمان کی وجہ سے ہے؛ ایک بڑا سبب ہے تاکہ خود عوام الناس قوانین کے پابند رہیں، لہذا ایسا بہترین اور مہم سبب ہمارے معاشرہ میں موجود ہے لیکن ہم اس کی قدر نہیں کرتے اسی طرح عوام الناس کو حکومتی قوانین کا پابند بنانے میں دوسرا سبب یہ ہے کہ عوام الناس اسلامی حکومت کے قوانین کو خدا کی خوشنودی کا سبب جانے جس کی بنا پر وہ شرعی وظیفہ سمجھتے ہوئے ان پر عمل کریں اور ان سے خلاف ورزی کو خدائی عذاب سبب شمار کریں اگرچہ ہم اس چیز کا انکار نہیں کرتے کہ ہمارے معاشرہ میں قوانین کی خلاف ورزی ہوتی، لیکن یہ خلاف ورزی؛ قوانین پر عمل کرنے کے مقابلہ میں بھت کم ہیں؛ اور اگر قانون پر عمل ہونے کی نسبت؛ خلاف ورزیوں کی تعداد زیادہ ہوتی تو ہمارا یہ نظام کبھی کا ختم ہو گیا ہوتا۔

ج۔ مقام رہبری میں شائستگی اور تقویٰ کے عالی ترین درجات کا ہونا

دوسری حکومتوں پر ہماری حکومت کا تیسرا امتیاز یہ ہے کہ مقام معظم رہبری کو تقویٰ، اخلاقی شائستگی اور عظمت کے بلند ترین درجات پر فائز ہونا ضروری ہے؛ کیونکہ یہ ذات پیغمبر اور امام زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کا جانشین ہوتا ہے اور عوام الناس اس کو امام زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کی تجلی اور ان کا ایک پرتو سمجھتے ہیں، اسی وجہ سے وہ محبت اور لگاؤ جو پیغمبر اکرم

(ص) اور امام زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) سے رکھتے ہیں اسی کے مشابہ (مقام معظم رہبری) سے بھی محبت اور لگاؤ رکھتے ہیں اگرچہ مقام معظم رہبری سب سے عظیم عہدہ پر فائز ہیں اور سب سے زیادہ قدرت بھی رکھتے ہیں، لیکن اگر (خدا نخواستہ) ان سے کوئی خلاف وزی یا ایسا گناہ جو باعث فسق اور عدالت کے خاتمہ کا باعث ہو جائے تو خود بخود ولایت مسلمین کے عہدہ سے معزول ہو جائیں گے اور کسی عدالت میں جانے یا جرم کو ثابت کرنے اور اس کو معزول کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی، العیاذ باللہ جرم کے مرتکب ہوتے ہی عدالت ساقط ہو جائے گی اور خود بخود اس عہدہ سے معزول ہو جائیں گے، اور ”مجلس خبرگان“ ان کی رہبری کی صلاحیت نہ ہونے کا اعلان کرے گی، ان کو معزول نہیں کرے گی؛ کیونکہ عدالت ختم ہوتے ہی عزل حاصل ہو جائے گا!۔

دنیا بھر کے کسی بھی ملک میں بڑے عہدوں پر فائز افراد اتنی اخلاقی صلاحیت اور شائستگی نہیں رکھتے جس قدر ہمارے مالک میں مقام معظم رہبری ہے، یہاں تک کہ بعض ممالک کے رہبروں کا حال یہ ہے کہ وہ سر سے پیر تک اخلاقی فساد میں آلودہ ہوتے ہیں: وہ امریکہ جس کو تمدن کا ترقی یافتہ نمونہ کھا جاتا ہے اس کے صدر پر اخلاقی اور جنسی تعلقات میں ملوث ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے اور اس کے خلاف بھت سے گواہ بھی مل جاتے ہیں اور وہ خود بھی اس چیز کا اعتراف کرتا ہے لیکن جب اس کے خلاف پارلیمنٹ میں عدم اعتماد کا مسئلہ پیش آتا ہے تو اکثر ممبر آف پارلیمنٹ نے اس عدم اعتماد پر ووٹ نہیں دئے اور وہ کمانی السابق صدرات کے عہدہ پر باقی رہ جاتا ہے اور اس کے لئے کوئی بھی مشکل پیش نہیں آتی تمام لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ وہ فاسد ہے لیکن سیاسی ہتھ کندوں کی وجہ سے عدم اعتماد کے ایک یا دو ووٹ کم رہ گئے اور وہ فاسد صدر اپنے عہدہ پر باقی رہا!! چنانچہ اسی طرح کی بھت سی دوسری مثالیں موجود ہیں اور خلاف وزی کرنے والے افراد یہاں تک کہ ان کو عدلیہ نے محکوم بھی کیا ہے لیکن سیاسی حربوں کی بنا پر وہ اپنے عہدہ پر باقی رہتے ہیں اور ان کا دوسرے انتخابات میں کامیاب ہو جانے کا امکان ہوتا ہے۔

لہذا اسلامی نظریہ کے مطابق اگر مقام معظم رہبری میں بھی کوئی ایک ضروری شرط موجود نہ رہے یا کوئی جرم سرزد ہو جائے تو اپنے عہدہ سے خود بخود معزول ہو جائیں گے، کیونکہ صرف ایک گناہ کے مرتکب ہونے سے عدالت ختم ہو جاتی ہے اور وہ فاسق ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی رہبری کرنے کی صلاحیت بھی ختم ہو جاتی ہے؛ اس کے بعد اس کے جرم کو ثابت کرنے یا عدالت میں جانے یا خبرگان کی رائے کی ضرورت نہیں ہوتی پس معلوم یہ ہوا کہ دنیا بھر کے کسی بھی ملک میں ملکی عہدہ داروں خصوصاً بڑے عہدہ دار یعنی رہبری کے لئے اتنی سختی نہیں ہے۔

د۔ انسانی معنوی اور واقعی مصلح کی رعایت

آخر میں دوسری حکومتوں پر ہماری حکومت کا مہم امتیاز انسانیت کے معنوی مصلح کی رعایت کرنا ہے: ہم ایک مسلمان ہونے کے لحاظ سے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خداوند عالم دوسروں سے زیادہ انسان کے مصلح اور منافع کو جانتا ہے اور ہم انہیں مصلح کو انسانی معاشرہ میں رائج کرنا چاہتے ہیں جن کو خداوند عالم نے بیان کیا ہے، اور یہ مقصد خداوند عالم کے بنائے دینی قوانین پر عمل کرنے کے علاوہ پورا نہیں ہو سکتا روئے زمین پر صرف ایک جمہوری اسلامی ایران ایک ایسا ملک ہے جس کے بنیادی قانون کے چوتھے بند میں یہ بیان ہے کہ ملک کے تمام قوانین اور مقررات کو اسلامی اصول و قواعد کے تحت طے کر کے نافذ کیا جانا چاہئے یہاں تک کہ اگر کوئی قانون دلیل شرعی کے عموم و اطلاق کے برخلاف ہوگا تو اس کو معتبر نہیں سمجھا جائے گا اس بنا پر وہ ملک جس میں انسان کے واقعی مصلح و منافع پورے ہوتے ہیں وہ ہمارا ہی ملک ہے۔

سب لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ یہ ہمارا نظام اور اس کے تمام نتائج؛ صرف عوام الناس کی قربانیوں اور شہداء کے خون کی برکتوں (منجملہ ”شہداء ہفت تیر“) سے وجود میں آئے ہیں اور انھوں نے اس انقلاب کی خاطر اپنی جان اور خون کی قربانی پیش کر کے ہمارے لئے عزت، سر بلندی اور بلند ترین اقدار کا سامان فراہم کیا ہے لہذا ہمیں (ہر وقت) بیدار رہنا چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ان عظیم اقدار کو مفت میں بیچ ڈالیں آج کل بھت سی سازشیں چل رہی ہیں جن کی بنا پر اصل اسلام، ولایت فقیہ اور اسلامی حکومت کے قوانین پر اعتراضات کئے جاتے ہیں چونکہ یہ ارزشیں اور اقدار ان کی آنکھوں کا کاٹنا بنا ہوا ہے جس کو صاف کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور اپنی تمام خراب کاری کوششوں کو انہیں چند اصلی نقطوں پر صرف کر دیتے ہیں تاکہ مختلف طریقوں اور مکاریوں سے ان پر حملہ کریں اور نقصان پہنچائیں۔

کبھی کبھی تقریروں، مقالوں اور بعض کثیر الا انتشار اخباروں میں اصل اسلام اور اسلامی احکام پر اعتراض کیا جاتا ہے، اور کھا جاتا ہے کہ آج وہ زمانہ گزر چکا ہے جب لوگوں کو حلال اور حرام کی باتیں بتائی جائیں لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ خود تصمیم گیری کریں اور اپنی مرضی سے انتخاب کریں!! یا متعدد بار دیکھنے میں آیا ہے کہ ولایت فقیہ کی شان میں گستاخی، جسارت اور توہین کرتے ہیں کہ اگر ہمارے عہدہ داروں کے سینہ میں ثقافتی کشادہ دلی نہ ہو تو قانونی طور پر ان کو سزا ملنا چاہئے لیکن یہ حضرات اپنی بزرگی کا احساس نہیں کرتے اور ان کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتا لیکن ہماری ایک انقلابی اور امام خمینی (رہ) اور مقام معظم رہبری (حضرت آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای مدظلہ العالی) کے پیروکار ہونے کے لحاظ سے یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم اس طرح کی جسارت کرنے والوں کو اس طرح کی گستاخیوں کا مزہ چکھادیں اور شریعت مقدس اسلام اور تشیع، اور اسلامی اقدار جن کی وجہ سے دنیا و آخرت کی کامیابی ہے جو آسانی سے حاصل نہیں ہوتیں ان کو سیاسی مکاروں کے چور بازار میں کم سے کم قیمت میں بیچ ڈالیں جن کی بنا پر ذلت، خدا و رسول اور فرشتوں، مومنین اور آئندہ آنے والی نسلوں کی لعنت کے مستحق قرار پائیں، خدا کرے کہ وہ وقت نہ آئے۔

حوالے:

(۱) سورہ حج آیت ۷۸

(۲) سورہ بقرہ آیت ۱۸۵

(۳) (سورہ بقرہ آیت ۱۸۵) ترجمہ: ”لہذا جو شخص اس ماہ میں حاضر رہے اس کا فرض ہے کہ روزہ رکھے (لیکن) جو مریض یا مسافر ہو وہ اتنے ہی دن دوسرے زمانہ میں روزہ رکھے خدا تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے زحمت نہیں چاہتا“ (اضافہ، مترجم)

قوانین اور حکومت سے آزادی کی نسبت

۱۔ حاکم کا نصب کرنا آزادی اور ڈیموکریسی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ (ایک اعتراض)

ہم نے گذشتہ جلسوں میں عرض کیا کہ قوانین کو براہ راست خداوند عالم بنائے یا اس کی اجازت اور اذن سے بنائے جائیں، اسی طرح قوانین کو جاری کرنے والا شخص بھی یا براہ راست خداوند عالم کی طرف سے معین ہو یا خداوند عالم کی طرف سے اذن یافتہ ہو؛ بھر حال نظام حکومتی (چاہے قوہ مجریہ ہو، یا قوہ قضائہ ہو یا پارلیمنٹ) خدا کے اذن کی طرف مستند ہوں اس کے علاوہ دینی اور شرعی لحاظ سے اس کی مشروعیت نہیں ہوگی ہم نے گذشتہ بحثوں میں قانون گذاری اور قانون کو جاری کرنے کے سلسلہ میں بھت سے اعتراضات کو بیان کمر کے ان کے جوابات پیش کئے قانون گذاری کے سلسلہ میں ایک اعتراض یہ تھا کہ عوام الناس کا خداوند عالم کے قوانین کا پابند ہونے کا مطلب انسانی آزادی اور انسان کے اپنے اختیار کے مخالف ہے؛ اور ہم اس کا جواب قانون گذاری کی بحث میں دے چکے ہیں اسی کے مثل بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت لہجہ سے قوانین کو جاری کرنے کے سلسلہ میں بھی ہوتا ہے؛ اور وہ یہ ہے کہ اگر ہم یہ مان لیں کہ قانون کا جاری کرنے والا خداوند عالم کی طرف سے معین ہونا چاہئے یا اس کی طرف سے اذن یافتہ ہو، تو اس صورت میں عوام الناس سے حق انتخاب کو چھین لیا ہے اور عوام الناس کو اس چیز کی اجازت نہیں ہے کہ خدا کے فرمان اور اس کے معین کردہ کے خلاف اپنی مرضی سے کسی کا انتخاب کمریں؛ اور یہ بات در حقیقت ڈیموکریٹک کے خلاف ہے۔

قارئین کرام! اگرچہ گذشتہ بحثوں میں ہم اس اعتراض کا جواب عرض کر چکے ہیں لیکن چونکہ اسلامی نظام کے مخالف بلکہ در حقیقت اسلام کے مخالفین اس طرح کے اعتراض مسلسل کئے جا رہے ہیں اور مختلف صورتوں میں اس طرح کے شبہات اور اعتراضات بیان کر رہے ہیں، اس وجہ سے ہم اس سلسلہ میں مزید وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں پہلے آزادی کے سلسلہ میں کچھ چیزیں بیان کریں گے اس کے بعد اسلامی حکومت کی تشکیل کا طریقہ کار اور قوانین اسلامی کو جاری کرنے کا طریقہ بیان کریں گے۔

۲۔ تکوینی آزادی اور نظریہ جبر کی تحقیق اور رد

ہمارے سامنے آزادی کا مسئلہ ہے جس کو اصطلاح میں تکوینی آزادی کہا جاتا ہے جس کے مقابلہ میں نظریہ جبر ہے جس کو بعض دانشمندیوں نے بیان کیا ہے قدیم زمانہ سے انسان کے سلسلہ میں یہ اختلاف چلا آ رہا ہے کہ وہ مختار ہے یا مجبور بعض لوگوں کا کہنا

ہے کہ انسان مجبور ہے اور اپنی زندگی میں ذرا بھی اختیار نہیں رکھتا اور اگر کوئی انسان یہ تصور کرے کہ وہ اپنے ارادہ سے اپنے امور انجام دیتا ہے تو یہ اس کا خیال خام کے علاوہ کچھ نہیں ہے انسان درحقیقت مجبور ہے وہ جو بھی کام کرتا ہے مجبوراً اور فشار کے تحت انجام دیتا ہے؛ اگرچہ وہ خود اس چیز کا احساس نہ کرتا ہو۔

ہمیشہ اس نظریہ جبر کے طرفدار لوگ پائے گئے ہیں اور بعض اسلامی علماء نے بھی اس نظریہ کی طرفداری کی ہے اسلامی فرقوں میں ”فرقہ اشاعرہ“ (جو اہل سنت کا ایک کلامی فرقہ ہے) جبر کا اعتقاد رکھتا ہے؛ البتہ اتنی شدت اور غلظت سے نہیں جتنے دوسرے مانتے ہیں لیکن ہمارے اور اکثر مسلمانوں کے لحاظ سے یہ نظریہ باطل اور مردود ہے، چاہے انسان اپنے اعمال و افعال میں اپنے کو صاحب اختیار اور آزاد تصور کرے اور اگر صرف جبر انسان کے اوپر حاکم ہوتا تو پھر اخلاقی، تربیتی اور حکومتی نظام کی کوئی ضرورت باقی نہ بچتی۔

اخلاقی اور تربیتی سلسلہ میں اگر انسان نیک یا برے کام پر مجبور ہوتا اور اس کا کوئی اختیار ان چیزوں پر نہ ہوتا تو پھر اس کے نیک کاموں پر اس کی تعریف اور تجنید کوئی معنی نہیں رکھتی اور نہ ہی اس کے لئے کوئی جزایا انعام کی ضرورت ہے، اسی طرح اگر انسان مجبور ہوتا تو برے کاموں پر اس کی مذمت اور سرزنش بھی نہیں ہونا چاہئے، اگر کوئی بچہ اپنے کسی فعل میں مجبور ہو تو پھر اس کی تربیت لا حاصل ہے اور اس کے اخلاقی کردار کو سنوارنے کے لئے برنامه ریزی کی کوئی ضرورت نہیں ہے جس وقت معلم اور مربی؛ بچے اور شاگرد سب ہی اپنے کردار میں مجبور ہوں تو پھر استاد بچے سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں کام انجام دیا فلاں کام نہ کرو اسی طرح حقوقی، سیاسی اور اقتصادی مسائل میں جو نصیحتیں کی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال اور افعال میں مختار اور آزاد ہے۔

جب انسان اپنے افعال اور اعمال کے کرنے یا نہ کرنے میں آزاد ہو تو اسی وقت اس کو یہ کہنا درست ہے کہ اس کام کو انجام دے اور اس کام سے پرہیز کرے، لیکن اگر انسان مجبور ہو اور اپنے کاموں کو انتخاب کرنے کا اختیار نہ ہو تو اس کے یہ کہنے کا کوئی مطلب نہیں ہے کہ اس کام کو کرے یا اس کام کو انجام نہ دے۔

یہ آزادی اور اختیار جس کو سبھی سمجھتے ہیں یہ ایک ”تکوینی امر“ ہے اور ”نظریہ جبر“ کے مقابلہ میں ہے، اور یہ اختیار اور آزادی خدا داد نعمت ہے جو انسان کی خصوصیات میں سے ہے اور اسی کی بنا پر انسان دوسری موجودات پر فضیلت اور برتری رکھتا ہے وہ تمام موجودات جن کا ہم علم رکھتے ہیں ان میں صرف انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو مختلف نظریات بلکہ بعض اوقات متضاد (ایک دوسرے سے ٹکرانے والی) نظریات میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اور وہ اپنے خواہشات کا جواب دینے میں مکمل طریقہ سے صاحب اختیار اور آزاد ہے چاہے وہ خواہشات ”حیوانی خواہشات“ ہوں یا وہ خواہشات ”الہی اور معنوی“ خواہشات ہوں بے شک خداوند عالم نے اس انسان کو اپنی اس نعمت سے نوازا ہے تاکہ وہ اپنے اختیار اور انتخاب

سے راہ حق یا راہ باطل کا انتخاب کرے، اور انسان کا یہی وہ امتیاز ہے جو دوسری تمام مخلوقات یہاں تک کہ فرشتوں پر رکھتا ہے یہی قدرت انتخاب ہے اگر اس نے اس قدرت کا صحیح استعمال کیا اور الہی احکام کا انتخاب کیا اور حیوانی خواہشات کو ترک کیا تو وہ کمال کے اس درجہ پر پہنچ جائے گا کہ اس کے سامنے فرشتے خضوع و خشوع کرتے ہوئے نظر آئیں۔

البتہ انسان کے پاس یہ آزادی کا ہونا ایک تکوینی مسئلہ ہے اور آج تقریباً کوئی ایسا نہیں ہے جو اس پر اعتقاد نہ رکھے اور اپنے کو سو فی صد مجبور سمجھے، اور اپنے لئے ذرا بھی آزادی نہ سمجھے، قرآن مجید نے اس مسئلہ کے واضح ہونے پر زور دیا ہے:

(وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ مَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفِرْ) (۱)

”(اے رسول) تم کھ دو کہ سچی آیات (کلمہ توحید) تمہارے پروردگار کی طرف سے (نازل ہو چکی) ہے بس جو چاہے مانے اور جو چاہے نہ مانے“

(إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِنَّا شَاكِرًا وَإِنَّا كَفُورًا) (۲)

”اور اس کو راستہ بھی دکھا دیا (اب وہ) خواہ شکر گزار ہو یا ناشکر“

سیکڑوں آیات بلکہ پورا قرآن انسان کے مختار ہونے پر تاکید کرتا ہے، کیونکہ قرآن مجید انسان کی ہدایت کے لئے ہے اور اگر انسان مجبور ہوتا اور اس کی ہدایت جبر کے تحت ہوتی اسی طرح اس کی گمراہی بھی جبر کے تحت ہوتی تو پھر انسان کے لئے ہدایت کو اختیار کرنے کا کوئی مقصد نہیں تھا اور اس صورت میں قرآن کریم بے فائدہ اور بے اثر ہو جاتا۔ اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ ہماری گفتگو تکوینی آزادی کے بارے میں نہیں ہے کیونکہ اس میں کسی کو بھی کوئی شک و شبہ نہیں ہے اور اس کی بحث کا مقام فلسفہ اور علم کلام ہے، حقوق اور سیاست میں یہ بحث نہیں کی جاتی۔

۳۔ معنوی اور اندرونی اقدار کا آزادی سے کوئی ٹکراؤ نہیں

قارئین کرام! یہاں پر ایک ضروری گفتگو یہ ہے کہ ہر انسان کے پاس ایک اندرونی طاقت ہوتی ہے جو انسان کے اعمال اور کردار کے لئے دائرہ معین کرتی ہے، اور ایک اصطلاح کے مطابق انسان ایک ارزشی اور اقداری مشین رکھتا ہے جس کی بنا پر ہر انسان یہ طے کر سکتا ہے کہ اس کو اخلاقی طور پر کون سے کام انجام دینا چاہئے اور کن چیزوں کو ترک کرنا چاہئے، جن کے طے کرنے کے بعد مخصوص کاموں کو انجام دیتا ہے اور کچھ چیزوں کو ترک کرتا ہے ہمیں کسی ایسے معاشرہ کا علم نہیں ہے جس میں ”بایدھا اور بنایدھا“ (کرنا چاہئے اور نہ کرنا چاہئے) نہ ہوں، اور اچھے کاموں کو برا اور برے کاموں کو اچھا سمجھتا ہو۔

چنانچہ انسانی اسی اچھے اور برے کاموں کو سمجھنے والی اندرونی طاقت کو ”عقل عملی“ یا ”وجدان“ کہا جاتا ہے جو انسان کو عقلی اور اخلاقی رفتار و گفتار کی ہدایت کرتی ہے، اور یہی وہ طاقت ہے جو ہمیشہ سے تمام انسانوں کے پاس رہی ہے، جس کی بنا پر

انسانیت کے لئے ایک راہنما کا کام کرتی ہے ہر انسان کی ”عقل عملی“ یا ”وجدان“ اس بات کو سمجھتی ہے کہ عدل، امانت داری اور سچائی نیک کام ہیں، لہذا ان پر عمل کرنا چاہئے اسی طرح ہر انسان کی ”عقل عملی“ یا ”وجدان“ ظلم اور ستم کو بُرا سمجھتی ہے اور ظلم نہ کرنے کا حکم دیتی ہے، خصوصاً جبکہ اگر کسی ایسے شخص پر ظلم و ستم کمرے جو اپنے دفاع پر بھی قادر نہ ہو اسی طرح انسانی عقل جھوٹ اور خیانت کو بُرے کاموں میں سے شمار کرتی ہے اور اس سے دوری کرنے کا حکم دیتی ہے۔

لہذا معلوم ہوا کہ انسان کے پاس ایک اندرونی اور باطنی ایسی طاقت ہے جو انسان کے لئے ہر حال میں اقداری مشین کا کام کرتی ہے جس کی بنا پر اچھے اور برے کاموں کی شناخت ہو جاتی ہے، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ تمام ہی انسان عدالت اور صداقت کو نیک کام شمار کرتے ہیں اور کوئی بھی انسان صداقت کو بُرا نہیں سمجھتا اسی طرح تمام ہی انسان اس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ ظلم اور جھوٹ برے کام ہیں اور آپ کو کوئی بھی ایسا شخص نہیں مل سکتا جو ان کو اچھا سمجھتا ہو بے شک انسانی اقدار کو معین کرنے والی یہ طاقت اپنے فیصلہ میں مستقل اور آزاد ہوتی ہے اور کسی باہری طاقت کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، اور صرف اپنے نظریہ کے مطابق حکم کرتی ہے۔

انسانی عقل و وجدان کے ذریعہ بیان شدہ بایدہا و بنایدہا (کرنا چاہئے اور نہ کرنا چاہئے) یا امر و نہی کی ماہیت اور حقیقت کی تحقیق و جائزہ (کہ امر و نہی صرف اس کی تشخیص اور درک کی وجہ سے ہوتا ہے یا انسان کے اندر کوئی طاقت ایسی ہوتی ہے جو اس کو امر و نہی کرتی ہے) اخلاقی فلسفہ سے متعلق ہے جو ہمارا موضوع گفتگو نہیں ہے لیکن ہماری عقل کا یہ طے کرنا کہ کون سے کام نیک ہیں اور کون سے کام بُرے؟ یہ ایک طرح سے ہمارے لئے لازمی احکام صادر کرتی ہے جس کی بنا پر ہماری قدرتی آزادی محدود ہو جاتی ہے، یعنی خود ہماری عقل اور وجدان ہمیں حکم دیتی ہے کہ اپنی کچھ آزادی سے فائدہ نہ اٹھاؤ: (مثلاً) ہم دوسروں پر ظلم کر سکتے ہیں لیکن ہماری عقل کھتی ہے کہ کسی پر بھی ظلم نہ کرو، بلکہ عدالت کو برقرار رکھو، اسی طرح ہم جھوٹ بول سکتے ہیں لیکن ہماری عقل یہ حکم کرتی ہے کہ جھوٹ نہ بولو بلکہ صداقت سے کام لو ہماری عقل اس بات کا حکم کرتی ہے کہ اگرچہ تم امانت میں خیانت کر سکتے ہو لیکن (کسی بھی چیز میں) خیانت نہ کرو، لہذا معلوم یہ ہوا کہ انسانی عقل عملی اور اس کا وجدان انسان کی خصوصیت میں اور ان اسباب میں سے ہے جو ہماری آزادی کو محدود کرتی ہے، اور اگر کسی شخص میں ایسی طاقت و قدرت موجود نہ ہو اور اپنے لئے اچھے اور برے کی پہچان نہ کر سکتا ہو تو گویا وہ عقل سے بے بھرہ ہے اور اس کو دیوانہ کھا جائے گا۔

اب جبکہ انسانی عقل اس اپنی رفتار و گفتار کو محدود بنا دیتی ہے اور انسان اس کام کو اپنے عقل اور وجدان کی طرف نسبت دیتا ہے لیکن کوئی بھی اس کو آزادی کا مخالف قرار نہیں دیتا یہ کوئی کھتا ہوا نظر نہیں آتا کہ ہماری عقل نے امر و نہی کے ذریعہ سے ہماری آزادی کو محدود کر دیا ہے جب حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی اس اندرونی طاقت کی پیروی کرتے ہوئے اپنی آزادی کو محدود کر لیتا ہے جو خود اسی کی عقل کے تحت ہوتی ہیں اور باہر سے کوئی چیز سبب بھی نہیں ہوتی کیونکہ انسانی عقل کے ذریعہ انسان کی

رفتار و گفتار کا محدود ہونا بالکل اس ڈاکٹر کی طرح ہے جو ہم سے (مریض ہونے کی صورت میں) یہ کہتا ہے کہ فلاں چیز نہ کھانا کیونکہ وہ تمہارے لئے نقصان دہ ہیں، اور فلاں دوائی استعمال کرو کیونکہ تم اس سے ٹھیک ہو جاؤ گے اس صورت میں نہ صرف یہ کہ انسان ڈاکٹر کے حکم اور پرہیز بتانے سے ناراحت نہیں ہوتا بلکہ اس کو خوشی بھی ہوتی ہے اور اس کے حکم کو اپنی صحت یابی کے لئے راہنمائی اور ہدایت سمجھتا ہے درحقیقت اس صورت میں بھی ہم اپنی آزادی اور اختیار سے استفادہ کرتے ہیں اور ہماری پیدائشی آزادی پر کوئی صرف نہیں آتا اور بعض اخلاقی نظریات کی بنا پر عقل صرف ہمیں ایک راستہ دکھاتی ہے اور ہماری اس راستہ کی طرف راہنمائی کرتی ہے، جس کے بہترین فوائد ظاہر ہوتے ہیں نہ کہ اس میں ڈکٹیٹری "Dictaory" نہیں دکھائی دیتی، (بلکہ دوستانہ اور دلسوزی کی بنا پر ہوتی ہیں۔)

یہاں تک کہ اگر ہم اپنی عقل کے حکم کو ڈکٹیٹری کا نام بھی دیدیں جس کی بنا پر وہ حکم کرتی ہے، جیسا کہ کھا بھی جاتا ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی عقل و وجدان کی مخالفت کی تو اس عقل ہی اس کو مورد مذمت اور عذاب قرار دیتی ہے، اور عقل و وجدان کا عذاب ہماری ادبی کتابوں میں مشہور معروف ہے، لیکن ان تمام باتوں کے پیش نظر عقل و وجدان کا حکم آزادی کے مخالف نہیں ہے اور اس کی آزادی ختم نہیں ہوتی، اور جو شخص اپنی عقل اور وجدان کے مطابق عمل کرتا ہے اس کے بارے میں یہ نہیں کھا جاتا ہے کہ یہ مقید ہو گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل اور وجدان خود انسان سے متعلق ہے اور یہ اندرونی طاقت کے عنوان سے ہمارے کاموں میں نظارت اور قضاوت کرتی ہے جس کے نتیجے میں بعض چیزوں کا حکم دیتی ہے اور بعض چیزوں کے انجام دینے سے روکتی ہے پس جس وقت ہماری اندرونی طاقت ہمیں حکم دے تو ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی، اور اگر ہم اپنی اس عقل کے فرمان کے مطابق اپنی مرضی سے عمل کریں تو گویا ہم نے اپنی مرضی کے مطابق عمل کیا؛ ہماری آزادی اس وقت سلب ہوتی ہے جب کوئی بیرونی طاقت ہمیں کسی کام کی انجام دہی پر مجبور کرے یا کسی کام سے روکے۔

۳۔ آزادی اور دینی وظائف کی نسبت

قارئین کرام! یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین (اسلام) کے احکام اور شرعی اوامر و نواہی جو خداوند عالم کی طرف سے ہوتے ہیں کیا انسان کی آزادی کو سلب کرتے ہیں؟ مثلاً اگر کوئی شخص صبح اٹھ کر نماز صبح نہ پڑھنا چاہے، لیکن خداوند عالم کا حکم ہے کہ صبح اٹھ کر نماز صبح پڑھو؛ اسی طرح دوسرے احکام جن کے بجالانے کو شریعت مقدس نے انسان کے لئے لازم اور ضروری قرار دیا ہے مثلاً روزہ کا حکم، زکوٰۃ و خمس اور دوسرے واجبات کا حکم، یا وہ چیزیں جو حرام ہیں ان کو ترک کرنے کا حکم جیسے (الکحل) والی مشروبات کے پینے سے روکنا (وغیرہ وغیرہ)۔

جواب: یہ احکام اور امر و نہی جب تک نفوذ ہونے کے بارے میں پشت پناہی نہ رکھتی ہوں تو گویا یہ بھی عقل اور وجدان کے حکم کی طرح ہیں اور ان کے ذریعہ سے انسان کی آزادی سلب نہیں ہوتی یعنی جس وقت خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ: نماز پڑھو، اگر ہم نے نماز نہ پڑھی، تو ہم سے کوئی مطلب نہ ہو اور ہمیں عذاب اور سزا میں مبتلا نہ کرے، اسی طرح معاشرہ بھی خداوند عالم کے احکام پر عمل نہ کرنے کی نتیجہ میں ہم سے خفا نہ ہو اور ہمیں ذلیل و حقیر نہ سمجھے تو اس صورت میں اگر شرعی امر و نہی صرف نصیحتی پہلو رکھتے ہوں تو ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی کیونکہ ان نصیحت کو باہر سے جاری کرنے والا کوئی ضامن نہیں ہے، اور کوئی بیرونی طاقت ہم پر کوئی دباؤ نہیں ڈالتی جس کی بنا پر ہم بعض کاموں کو انجام دیں اور بعض سے پرہیز کریں؛ اس صورت میں شرعی امر و نہی عقل اور وجدان کے حکم کے ہم پلہ قرار پاتے ہیں جس کی وجہ سے آزادی سلب نہیں ہوتی مسامحہ آمیز (ذو معنی) تعبیر کے مطابق، جس طرح ہم ایک ایسی متصل عقل رکھتے ہیں جو ہمیں ”بایدھا اور بنایدھا“ (کرنا چاہئے اور نہ کرنا چاہئے) کے بارے میں نصیحت اور امر و نہی کرتی ہے لیکن عملی طور پر اس کے احکام پر عمل کرنا لازمی اور ضروری نہیں ہوتا، اسی طرح ہمارے پاس عقل منفصل (جدا) بھی ہے جو ہمارے وجود سے باہر ہے اور امر و نہی کرتی ہے، یعنی خداوند عالم ”عقل کلی“ کے عنوان سے ہمارے لئے امر و نہی کرتا ہے اور وہ صرف نصیحت کی حد تک ہوتی ہے اور ارشادی (و نصیحتی) پہلو رکھتے ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ شرعی امر و نہی عملی طور پر لازمی اور ضروری ہوتے ہیں اور ان میں صرف نصیحتی پہلو نہیں ہوتا بلکہ جس وقت خداوند عالم ہمیں حکم دیتا ہے کہ نماز پڑھو تو اگر ہم نماز نہ پڑھیں تو ہمیں جہنم میں ڈال کر عذاب میں مبتلا کرے گا یہاں تک کہ بعض برے کاموں پر اسی دنیا میں سزا اور تازیانی کی حد معین فرمائی ہے، اور اس سے بھی بالاتر گزشتہ امتوں کے لئے آسمانی عذاب نازل کیا ہے اور جب بھی کوئی پیغمبر مبعوث برساتا ہوتا تھا تو عوام الناس کو خدا کے عذاب سے ڈراتا تھا، اور یہ کہتا تھا کہ اگر تم نے خداوند عالم کے احکام کی اطاعت نہ کی تو تم پر اسی دنیا میں بھی عذاب نازل ہو سکتا ہے قرآن مجید میں مکرر مسلمانوں کو اس بات سے ڈرایا گیا ہے اور ان کو یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ گزشتہ امتوں کے حالات پر نظر کرو کہ خدا کے احکام کی نافرمانی اور گناہ کے نتیجہ میں خداوند عالم نے ان پر عذاب نازل کیا لہذا تمہیں بھی دنیاوی یا آخروی عذاب سے ڈرنا چاہئے انبیاء کرام (ع) عذاب الہی سے اس قدر ڈراتے تھے جس کی بنا پر تمام انبیا (ع) کا نام نذیر اور منذر (ڈرانے والا) معروف ہو گیا؛ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

(إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ) (۳)

”ہم ہی نے تم کو یقیناً قرآن کے ساتھ خوشخبری دینے والا و ڈرانے والا (پیغمبر) بنا کر بھیجا اور کوئی امت (دنیا میں) ایسی نہیں گزری کہ اس کے پاس (ہمارا) ڈرانے والا (پیغمبر) نہ آیا ہو“

لہذا وہ شرعی امر و نہی جن پر ہمیشہ دنیاوی یا اُخروی عذاب سے ڈرایا گیا ہے؛ اخلاقی اور عقلی امر و نہی جن پر ہماری عقل اور وجدان کے حکم سے فرق پایا جاتا ہے اور اس سے انسانی آزادی محدود ہو جاتی اور انسان پر دباؤ ڈالتی ہے۔

اور اگر ہم نے اس بات کو مان لیا کہ تمام انسان مکمل طور پر آزاد ہیں، اور ”حقوق بشر کے اعلانیہ“ کے مطابق (جو بعض روشن فکر کے نزدیک وحی اور کتاب مقدس کا حکم رکھتا ہے) کسی کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ کسی انسان کی آزادی کو محدود کرے، تو کیا خداوند عالم کو بھی انسانوں کی آزادی کو محدود کرنے کا حق نہیں ہے؟! اور ان کو عذاب اور سزا سے ڈرا کر تحت تاثیر قرار دے، اور زیادہ سے زیادہ خدا بھی عقل اور وجدان کی طرح انسان کو اپنے وظائف اور واجبات کو انجام دینے کے سلسلہ میں ارشاد اور نصیحت نہیں کر سکتا، مثال کے طور پر ہمیں نماز پڑھنے کا حکم دے تو اگر ہم نماز نہ پڑھیں تو ہم نے گویا اپنی آزادی سے استفادہ کیا ہے! اور اگر ایسا ہے تو پھر خداوند عالم نے ہمیں کس لئے ڈرایا ہے اور کھتا ہے: اگر گناہ کرو گے تو تم کو آخرت میں جہنم میں ڈال دوں گا، اور مسلسل ہمیں اپنے عذاب سے ڈراتا رہتا ہے، چنانچہ اس نے اپنے انبیاء (ع) کے وظائف میں سے ایک وظیفہ عوام الناس کو عذاب الہی سے ڈرانا قرار دیا ہے؟

بے شک مسلمانوں کو اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ خداوند عالم فرمان اور احکام صادر کر سکتا ہے اور ان کے جاری کرنے کا ضامن بھی ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا وظیفہ امر و نہی کا پہنچانا اور عذاب الہی سے ڈرانا ہے، (کبھی کوئی مسلمان ان چیزوں میں شک نہیں کرتا) بلکہ وہ ان تمام چیزوں کو دل و جان سے قبول کرتا ہے تمام مسلمان خدا اور رسول کے احکام کے سامنے سر جھکاتے ہوئے نظر آتے ہیں، اگرچہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ احکام ان کو محدود کرتے ہیں اور ان کی بعض آزادی کو سلب کرتے ہیں اور ایک طریقہ سے ان کو تحت تاثیر قرار دیتے ہیں کیونکہ جب خداوند عالم ہمیں کسی کام کو انجام دینے کا حکم دیتا ہے تو اگر ہم نے اس کام کو انجام نہ دیا تو پھر ہمارے لئے عذاب کا وعدہ کیا گیا (اور خدا کا وعدہ سچا ہے) تو ہم اس سے متاثر ہوتے ہیں پس معلوم یہ ہوا کہ خداوند عالم ہم کو بعض کاموں کے انجام دینے اور بعض کاموں سے پرہیز کرنے کا پابند کر سکتا ہے اس میں کوئی شک (بھی) نہیں ہے؛ لیکن خداوند عالم کی طرف سے امر و نہی آنے کی حکمت اور فلسفہ کیا ہے اور کیوں خداوند عالم ہم کو شرعی واجبات و محرمات کا پابند کیوں بناتا ہے تو اس سلسلہ میں علم کلام میں بحث ہوگی، لیکن خلاصہ کے طور پر عرض کرتے ہیں کہ:

خداوند عالم اپنے تمام تر لطف و مہربانی اور فضل و کرم کی بنا پر انسان کو سعادت مند بنانا چاہتا ہے اسی وجہ سے سعادت مندی کے راستہ کی پہچان بتادی ہے جس کی بنا پر ہمارے لئے احکام اور فرمان معین فرمادے ہیں تاکہ ہم اپنے ان وظائف پر عمل کرتے ہوئے سعادت مندی کے راستہ پر گامزن رہیں اور جس کے زیر سایہ واقعی سعادت کے راستہ کو پہچان لیں ظاہر سہی بات ہے کہ خداوند عالم کے ڈرانے اور دھمکانے سے ہم ہوشیار ہو جاتے ہیں جس سے سعادت کے راستہ سے منحرف نہیں ہوتے، اور اگر یہ احکام ہمارے لئے ضروری اور لازمی نہ ہوتے تو پھر ہم اپنے وظائف کو اچھے طریقے سے انجام نہ دیتے اور اپنے غلط کردار اور

گناہوں کی وجہ سے راہ سعادت سے بھٹک جاتے لہذا خداوند عالم نے اپنے لطف و کرم کی بنا پر شرعی وظائف پر عمل کرنے کی وجہ سے ہم کو برائیوں اور برے کاموں سے روکا ہے جس کے نتیجے میں خدا کی رحمت و اسعہ ہمارے شامل حال ہو جائے۔

اس بنا پر حقیقت یہ ہے کہ دین انسان کو محدود کرتا ہے اور اس کی بعض آزادی سلب ہو جاتی ہیں انبیاء علیہم السلام عوام الناس کو ڈرانے کا وظیفہ رکھتے تھے اور دینی احکام کی مخالفت اور عذاب الہی سے ڈراتے تھے بے شک اس سلسلہ میں ظاہری اور روحانی دونوں طرح کا دباؤ ہوتا ہے ظاہری دباؤ اس شخص پر ہوتا ہے جس پر بعض گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے حد جاری ہوتی ہے اور روحانی دباؤ ان لوگوں پر ہوتا ہے جو کسی پر حد جاری ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ اس سزا سے ڈرتے ہیں، اور ان لوگوں پر بھی جو ہمیشہ آخرت کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔

ہم اس وقت جو مطلق آزادی کے طرفدار ہیں لوگوں سے یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ کیا تم اس ظاہری اور روحانی دباؤ کو محکوم کرتے ہو؟ یعنی کیا تم یہ کہتے ہو کہ خداوند عالم کو اس طرح کی محدودیت اور مشکل میں قرار نہیں دینا چاہئے؟ اور اس کو دنیاوی اور اخروی عذاب سے ڈرانے کے لئے پیغمبر نہیں بھیجنا چاہئے؟ تو کیا ان چیزوں کا محکوم کرنا اسلام اور تمام آسمانی ادیان کے انکار کے برابر نہیں ہے؟ (لیکن کیا کسی کو دین کے انکار کرنے کا حق ہے یا نہیں یہ ایک الگ بحث ہے اس وقت ہم انبیاء علیہم السلام کی اتباع کی حقانیت کو ثابت نہیں کر رہے ہیں)

جو شخص کہتا ہے کہ انسان مکمل طور پر آزاد ہے اور اس پر کسی طرح کی محدودیت اور دباؤ نہیں ہونا چاہئے، تو کیا وہ محدودیت بھی جو خداوند عالم کی طرف سے اپنے بندوں پر ایجاد ہوتی ہے مثلاً گناہ کرنے پر جہنم میں جانا ہوگا یا بعض گناہوں کی اسی دنیا میں سزا ملے گی تو کیا ایسا شخص اس بات کو محکوم کرتا ہے؟ (اور اگر ایسا ہے) تو گویا اس نے دین اور بعثت انبیاء (ع) اور الہی شریعتوں کا انکار کیا ہے اور اس وقت ہماری بحث ان سے نہیں ہے ہماری بحث تو ان لوگوں سے ہے جو دین کو قبول رکھتے ہیں اور دین اسلام کو حق جانتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خداوند عالم نے اپنی حکمت اور لطف و کرم کی بنا پر ہدایت کے لئے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا ہے اور اسی وجہ سے اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔

۵۔ حدود اور سزائوں میں آزادی کی نسبت

اب جبکہ ہم نے یہ قبول کر لیا ہے کہ نہ صرف خداوند عالم کو یہ حق ہے بلکہ اس کے لطف و کرم اور فضل کی بنا پر ہمیں جہنم سے ڈرانے تاکہ ہم صحیح راستہ پر چلیں اور برے راستے سے پرہیز کریں، یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے بعض گناہوں پر حد کس لئے اور کیوں قرار دی ہے اور حدود و تعزیرات کو اصلاً کس لئے رکھا ہے؟ خداوند عالم ہمیں عذاب آخرت سے ڈرانا صحیح ہے کیونکہ عذاب سے ڈرانا ہمارے فائدہ میں ہے جو ہمارے لئے جہنم کے عذاب سے ڈرتے ہوئے سعادت اور نیک بختی کے راستے کو

اپنانے کا سبب بنتا ہے بلکہ ایک معنی کے لحاظ سے یہ ڈرانا ایک قسم کا ارشاد اور ہدایت ہے اور خداوند عالم ہمیں یہ بتانا چاہتا ہے کہ دیکھو تمہارے برے کاموں کا نتیجہ آخرت میں جھنم ہے، اور عذاب بھی وہ جو حقیقی ہے اور باہمی مفاہمت (ریزولیشن "Resolution") نہیں ہے بلکہ تمہارے دنیاوی برے اعمال کا مجسمہ ہے لیکن خدا نے کیوں فرمایا کہ اگر کوئی عظیم گناہ جیسے زنا کا مرتکب ہوا تو اس کو لوگوں کے سامنے کوڑے لگائیں جائیں تاکہ اس کی عزت و آبرو ختم ہو جائے؟

ارشاد ہوتا ہے:

(الرَّائِيَةُ وَالرَّانِي فَاَجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا بِمِائَةِ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنَّكُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَيْشَهِدَ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ) (۴)

”زنا کار عورت اور زنا کار مرد دونوں کو سو سو کوڑے لگائیں اور خبردار! دین خدا کے معاملہ میں کسی مروت کا شکار نہ ہو جانا اگر تمہارا ایمان اللہ اور روز آخرت پر ہے اور اس سزا کے وقت مومنین کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہئے۔“

یہ سوال صرف دین سے متعلق نہیں ہے بلکہ سزائی قوانین اور ہر ملک کے قوانین سے متعلق ہے دنیا بھر کی تمام حکومتوں میں حقوقی اور سزائی قوانین ہوتے ہیں حقوقی قوانین ان لوگوں کے بارے میں ہوتے ہیں جو دوسرے کے مال اور حقوق پر تجاوز اور دست درازی کرتا ہے مثلاً کسی کا مال کھا جاتا ہے یا کسی کے بدن کو زخمی کر دیتا ہے یا کسی کو قتل کر دیتا ہے تو اس صورت میں اگر کوئی مخصوص شکایت کرنے والا موجود ہے تو وہ مجرم کی شکایت کرتا ہے جس کے نتیجہ میں مجرم کو سزا ہوتی ہے یا جرمانہ دینا ہوتا ہے اور اگر کسی کے حق کو غصب کیا تھا تو اس کو واپس کرے اور اگر کسی ظلم اور جنایت کا مرتکب ہوا تو اس سے قصاص (بدلہ) لیا جاتا ہے یا اسی طرح کی دوسری سزائیں معین کی جاتی ہیں لیکن تمام سزائی قوانین میں مجرم کو سزا دینے کے لئے کسی خاص شکایت کرنے والے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ خود عدالت اور مدعی العموم قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے اور ملکی مصلح کو پامال کرنے والے کے خلاف مقدمہ دائر کر سکتا ہے اور اگر ملزم کا جرم اثبات ہو جائے تو اس کو سزا ملتی ہے۔

جہاں تک ہم جانتے ہیں دنیا بھر میں کوئی بھی ملک ایسا نہیں ہے جس میں حقوقی اور سزائی قوانین موجود نہ ہوں اور مجرموں کو سزا اور جریمہ نہ ہوتا ہو خلاصہ یہ ہے کہ یا مجرم کو جریمہ دینا پڑتا ہے یا اس کو جیل بھیج دیا جاتا ہے یا اس کے لئے دوسری سزائیں معین کی جاتی ہیں؛ چنانچہ اسلام بھی اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں ہے اور اسلام کے بھی حقوقی اور سزائی قوانین ہیں یہاں تک کہ بعض موارد میں تو سخت سے سخت سزائیں ہیں لہذا یہ سوال یہ ہے کہ تمام ہی حکومتوں کو مجرموں کو سزا دلانے کا حق ہے تو کیا یہ چیز انسان کی آزادی کے مخالف نہیں ہے تو یہ بات مسلم ہے کہ تمام ہی لوگ حکومت کو حقوقی اور سزائی قوانین بنانے کا حق دیتے ہیں اور مجرمین کے لئے خاص سزائی قوانین مترتب کر کے نافذ کرانا چاہتے ہیں اس بات کی دلیل یہ ہے کہ ہمیں کسی ایسے ملک کے بارے میں اطلاع نہیں ہے جس میں مجرموں کے لئے حقوقی سزائی قوانین نہ ہوں یا ان کے لئے جرمانہ یا قید یا دوسری سزائیں نہ ہوں اور

کسی کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے البتہ بحث و گفتگو میں یہ بحث کی جاسکتی ہے اور یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ کیا کسی کو یہ حق حاصل ہے کہ اس دنیا میں کسی شخص کو سزا دی جاسکتی ہے اور اس کی آزادی کو محدود کرنا یا اس کی آزادی کو سلب کرنے کا اختیار کسی کو ہے یا نہیں؟

۶۔ حکومت اور قوانین کے زیر سایہ مطلق طور پر آزادی نہیں ہو سکتی

جو لوگ کہتے ہیں کہ کسی بھی حکومت کو عوام الناس کی آزادی کو محدود کرنے اور ان کے لئے سزا معین کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، (کیونکہ اس صورت میں عوام الناس سزا وغیرہ کے ڈر سے کسی خلاف ورزی کو انجام نہیں دیتے؛ لیکن اگر سزا وغیرہ نہ ہوتی تو پھر انسان اپنی مرضی سے جو بھی چاہتا انجام دیتا چاہے وہ کام اچھا ہوتا یا بُرا،) تو اگر ایسا شخص دنیا بھر کی حکومتوں پر اعتراض کر رہا ہے تو اس کا ایک دوسرے طریقہ سے جواب دیا جائے اور اگر صرف اسلام پر اعتراض کرتا ہے تو پھر اس کا جواب ایک دوسرا ہوگا لیکن چونکہ اس کا اعتراض دنیا بھر کی عام حکومتوں پر ہے اور تمام حکومتی نظام منجملہ اسلامی حکومت پر بھی اعتراض کرتا ہے کہ کیوں مجرموں کے لئے سزائیں اور محدودیت قرار دی ہیں ان پر دباؤ ڈالا گیا ہے؟ تو اس صورت میں ہمارا جواب بھی ایسا ہوگا جو سب کو شامل ہو جس میں تمام حکومتوں اور اسلامی حکومت کے حقوقی اور سزائی قوانین کے بارے میں جواب دیا جائے۔

جواب:

مذکورہ اعتراض ”مطلق آزادی“ کی بنیاد پر ہے اور ان کا یہ خود ساختہ نظریہ ہے جس کی بنا پر ان کا تصور یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں مکمل طور پر آزاد ہونا چاہئے اور کسی بھی طرح اس پر کوئی دباؤ نہیں ہونا چاہئے، اور کوئی بھی شخص اس کو کسی کام کے کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا اور نہ ہی کسی کام سے روک سکتا ہے۔

بے شک یہ اصل اور بنیاد غیر منطقی اور ہر صاحب عقل و شعور کے نزدیک باطل اور غلط ہے کوئی بھی انسان مطلق اور بغیر کسی حد و قید کی آزادی نہیں رکھتا کہ جو کچھ بھی کرنا چاہے کوئی بھی قانون اس کو نہ روکے (یہاں پر قوانین سے مراد اخلاقی قوانین اور مستقلات عقلیہ نہیں ہیں جن کی اجرائی ضمانت نہیں ہے بلکہ ہماری مراد عام معنی میں قوانین حقوقی مراد ہیں جن کو نافذ کرنے کی حکومت ذمہ دار ہوتی ہے) لہذا قوانین اور مقررات ہونا چاہئے اور عوام الناس کو ان پر عمل کرنے کے لئے آمادہ کیا جائے تاکہ عوام الناس کے حقوق کو ادا کریں ٹریفک قوانین ہونا چاہئے اور جو لوگ کبھی کبھی بھت سے لوگوں کی جان جانے کے باعث بنتے ہیں ان کے لئے سزائیں اور جرمانہ ہونا چاہئے۔

اس کے علاوہ کہ ہمیشہ سے پوری تاریخ میں اور ہر جگہ پر عوام الناس موجودہ قوانین کو قبول کرتے آئے ہیں جس کی بنا پر کسی کو بھی مطلق آزادی کا حق نہیں ہے اور نا ہی کسی دوسرے پر کسی طرح کا کوئی دباؤ ڈالنے اور اس کی آزادی کا ایک حصہ ختم کرنے کا حق ہے؛ اور عملی طور پر کوئی شخص بھی ایسا عقیدہ نہیں رکھتا، کیونکہ مطلق آزادی کا مطلب مدنیت کا انکار کرنا اور وحشیانہ جنگل راج کو قبول کرنا ہے اگر انسان ایک اجتماع پسند موجود ہے تو اس کے لئے اجتماعی نظام کی ضرورت ہے اور عوام الناس کو ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت کرنا چاہئے اور اس سلسلہ میں قوانین ہونا ضروری ہیں نیز مجرموں کے لئے سزائی قوانین مد نظر رکھے جائیں، اور حکومت بھی ان کو نافذ کرنے کی ضامن ہو واقعاً مطلق آزادی (اور یہ کہ کسی شخص کو کسی دوسرے کو کسی کام پر مجبور کرنے یا کسی کام سے روکنے کا کوئی حق نہیں ہے) کا نعرہ لگانے کا مطلب یہ ہے کہ پھر حکومت کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ انسان جو کچھ بھی کرنا چاہے کر سکے؛ کیونکہ حکومت بھی عوام الناس کی رائے سے بنتی ہے اور قوانین کا نافذ کرنا اس کی ذمہ داری ہوتی ہے لہذا اس طرح کا نظریہ قانون مداری، جامعہ مدنی، تمدن اور قوانین کی اتباع کی ضرورت سے ہم اہنگ نہیں ہے کیونکہ انسانی معاشرہ اور تمدن بشریت کی بنیاد یہ ہے کہ اس میں قوانین اور ان کو نافذ کرنے والی قدرت کا ہونا ضروری ہے، اور ظاہر سی بات ہے کہ حکومت قوانین کو نافذ کرنے کے لئے ان پر دباؤ ڈالے گی۔

حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ ضرورت کے وقت مجرموں کو قوانین پر عمل کرنے پر مجبور کرنے کے لئے اپنی طاقت کا استعمال کرے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دے، اور اگر صرف کہنے اور نصیحت کرنے پر کفایت کمرے تو پھر وہ معلم اور مربی ہوگی حکومت نہیں ہوگی علماء اور واعظین کا وظیفہ عوام الناس کو اجتماعی اخلاق اور انسانی آداب کی رعایت کرنے کے لئے وعظ و نصیحت کرنا ہے، لیکن وہ ان وعظ و نصیحت کو نافذ کرنے کے لئے قدرت کا استعمال نہیں کر سکتے، اور قدرت کے زور پر لوگوں کو انسانی اخلاق کی رعایت پر مجبور کرنا بھی ان کی ذمہ داری نہیں ہے لیکن حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اگر ضرورت پڑے تو اپنے قدرت کے زور پر قوانین پر عمل کرائے اور اگر کوئی خلاف ورزی کمرے تو اس کو سزائے اعمال تک پھونچائے اور یا اس پر جرمانہ کرے یا اگر کوئی خلاف ورزی کر کے بھاگ نکلنا چاہے تو اس کا تعقب کرے اور اس کو پکڑ کر اس پر حدود اور سزا جاری کرے اس بنا پر حکومت اور قوہ مجریہ کا وجود خود اس بات پر دلیل ہے کہ انسان مکمل اور مطلق طور پر آزاد نہیں ہے اور مطلق آزادی کا نظریہ باطل اور مردود ہے نیز انسانی تمدن اور اجتماعی زندگی کے ساتھ ہم اہنگ نہیں ہے اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ چاہے حکومت شہری قوانین جو خود شہریوں کی خواہش کے مطابق مرتب ہوتے ہیں یا اسلامی حکومت الہی قوانین جاری کرے۔

قارئین کرام! گذشتوں بحثوں میں ہم نے اس بات کو ثابت کیا کہ قوانین کو نافذ اور جاری کرنے والا یا خود خداوند عالم کی طرف سے منصوب ہو یا خدا کی طرف سے اذن یافتہ ہو، کیونکہ قوانین کو جاری کرنے سے عوام الناس پر دباؤ ڈالا جاتا ہے اور ان کی آزادی کو محدود کیا جاتا ہے اور عوام الناس خداوند عالم کے مملوک اور بندے ہیں لہذا صرف خدا ہی ان میں تصرف کر سکتا ہے، اور ”ربوبیت تشریحی“ اور حاکمیت الہی کی بنا پر کسی بھی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خدا کی اجازت اور مرضی کے بغیر اس کے بندوں پر فشار ڈالے اور ان میں تصرف کرے لہذا حکومت کو خدا کے بندوں میں تصرف کرنے یا ان پر دباؤ ڈالنے کے لئے ان مالک (خداوند عالم) سے اجازت لےنا چاہئے لیکن جو لوگ عوامی ڈیموکریٹک کے قائل ہیں اور معاشرہ کو ادارہ کرنے کے لئے قوانین مدنی کو کافی جانتے ہیں اور حکومت کو انہیں قوانین کو جاری اور نافذ کرنے کی ضامن مانتے ہیں، چنانچہ کہتے ہیں کہ قوانین کو نافذ کرنے والے کا خدا کی طرف سے اذن یافتہ ہونا ضروری نہیں ہے؛ بلکہ عوام الناس سے ووٹ دیتے ہی وہ قوانین کو جاری کر سکتا ہے اور ضرورت کے وقت حکومت اپنی طاقت کو بروئے کار لاسکتی ہے، اور لوگوں پر دباؤ بھی ڈال سکتی ہے۔

یہ لوگ حکومت کے عوام الناس پر دباؤ ڈالنے کے سلسلہ میں کیا دلیل پیش کرتے ہیں؟ ڈیموکریٹک اصول کے تحت اس طرح جواب دیا جاتا ہے کہ عوام الناس چونکہ حکومت کو ووٹ دیتی ہے چاہے وہ ممبر آف پارلیمنٹ کے انتخاب ہوں یا خود حکومت کے صدر اتی انتخاب ہوں، اور یہ ووٹ دینا ہی گویا حکومت کے قوانین اور حکومت کی طرف سے ان کو نافذ کرنے کو قبول کرنا ہے؛ چاہے حکومت ان کو جاری اور نافذ کرنے کے سلسلہ میں اپنی طاقت کا استعمال ہی کیوں نہ کرے لہذا حکومت کی طرف قوانین کو نافذ کرنے کے سلسلہ میں جو دباؤ دیا جاتا ہے وہ آزادی سے منافات نہیں رکھتا؛ کیونکہ اس حکومت اور نظام کو خود انہوں نے قبول کیا ہے، اور اس کے سامنے اپنا سر تسلیم کیا ہے اور یہ بالکل عقل اور وجدان کے اس حکم کی طرح ہے جو انسان کو بعض چیزوں کو انجام دینے اور بعض چیزوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیتی ہے اور وہ آزادی سے مخالفت نہیں رکھتا، اور اس سے آزادی سلب نہیں ہوتی، کیونکہ یہ احکام خود ان کی اندرونی طاقت کی بنا پر ہوتے ہیں اور خود انہیں سے متعلق ہے اور ان پر تھوپنا نہیں گیا ہے۔

البتہ ڈیموکریسی حکومتی نقشے، ان کی کارکردگی اور اختیارات نیز اپنی حقانیت اور مشروعیت کے لئے جو دلیل پیش کرتے ہیں؛ ان تمام چیزوں پر بھت سے اشکالات ہوتے ہیں جو فلسفہ سیاست اور فلسفہ حقوق سے متعلق کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں ہم یہاں پر کچھ اعتراضات بیان کرتے ہیں جو اس وقت مناسب ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ: دنیا میں کوئی بھی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں پر قوانین کو اتفاقی طور پر قبول کیا جاتا ہے، یا متفق طور پر کسی کو وزیر اعظم یا صدر مملکت منتخب کیا جاتا ہو یہاں تک کہ خود جمہوری اسلامی (ایران) جو دنیا میں عوامی ملکوں میں بے نظیر ہے، جس میں ۸۹/۲ فی صد لوگوں نے اس اسلامی نظام کو ووٹ دئے اور ۱/۸ فی صد لوگوں نے اس نظام کو ووٹ نہیں دئے جو اس وقت کی مردم شماری کے لحاظ سے وہ تعداد تقریباً دس لاکھ سے بھی زیادہ ہے جس وقت دنیا بھر میں رائج ڈیموکریسی اور عوامی نظام میں دس لاکھ سے زیادہ افراد اس نظام کے حق میں ووٹ نہ دیں

تو حکومت کو عوام الناس کو اپنے قوانین اور احکام پر عمل کرنے پر مجبور کرنے کا کیا حق ہے؟ جبکہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس نظام حکومتی کو نہیں مانتے تو پھر صرف عوام الناس کے اکثریت کا ووٹ حاصل کرنے سے حقانیت اور مشروعیت حاصل کمر کے کس طرح اپنے قوانین کو اپنے مخالفوں پر نافذ اور جاری کر سکتی ہے؟

ڈیموکریسی اور عوامی نظام کے طرفدار افراد اس طرح کے سوالات کا جواب دیتے ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ اس سلسلہ میں گفتگو اور بحث نہ ہوئی ہو لیکن ان کے جوابات اطمینان بخش نہیں ہیں، اور بھت سے حل نہ ہونے والے اعتراض باقی رہتے ہیں، مثال کے طور پر کہتے ہیں کہ وہ نظام حکومتی جو اکثریت کے ووٹوں سے وجود میں آیا ہے اور اس نظام کو اقلیت نے ووٹ نہیں دیا ہے ان کے بھی کچھ حقوق ہیں اور ان کے حقوق کا لحاظ رکھا جائے اور وہ لوگ اپنے شخصی اور ذاتی احوال میں اپنی مرضی کے مطابق عمل کر سکتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ کافی نہیں ہے کس دلیل کی بنا پر عام قوانین اور حکومت کے اجتماعی قوانین کو ان لوگوں پر تھوپنا جا سکتا ہے؟ نیز اسے مختلف ٹیکس اور دوسرے اخراجات کس دلیل کی بنا پر لئے جاتے ہیں؟ ان میں سے بعض لوگ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ آخر کار ہمیں معاشرہ کو آگے بڑھانے کے لئے کچھ تو کرنا ہی ہوگا اور ہمارے پاس معاشرہ کو چلانے کے لئے ڈیموکریسی حکومتی نظام سے بہتر کوئی نظام نہیں ہے۔

لیکن مذکورہ اعتراض کا جواب اسلامی نقطہ نظر سے یہ ہے کہ قانون گذاری کا حق خداوند عالم سے متعلق ہے یا جو افراد خداوند عالم کی طرف سے اذن یافتہ ہوں وہ خداوند عالم کے مقرر کردہ قوانین کے تحت قوانین بنا سکتے ہیں اسی طرح عوام الناس پر حکومت کرنے اور ان کے لئے قوانین جاری کرنے کا حق اس شخص کو ہے جو خداوند عالم کی طرف سے منصوب ہو یا اس کی طرف سے اذن یافتہ ہو اس صورت میں وہ شخص خدا کے نمائندہ ہونے کے عنوان سے اور وہ شخص جو خداوند عالم کی طرف عوام الناس پر حکومت کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے اس بات کا حق رکھتا ہے کہ قوانین کو معاشرہ میں نافذ کرے اگرچہ اس کو اپنی طاقت کا بھی استعمال کرنا پڑے اس کو حکومت کے مخالف لوگوں اور قانون توڑنے والوں کو بھی قوانین پر عمل کرنے پر مجبور کرنے کا حق ہے بے شک جو شخص خدا اور دین کا اعتقاد رکھتا ہے یہ تھیوری قابل قبول، منطقی اور عقلی اشکالات سے خالی ہے جو ڈیموکریسی حکومت پر وارد ہوتے ہیں لیکن جو شخص دین اور خدا کو نہیں مانتا اور الہی حکومت سے روگرانی کرتا ہے وہ کبھی بھی اس جواب کو بھی قبول نہیں کرے گا لیکن وہ عوام الناس جو مسلمان ہیں اور خدا پر ایمان رکھتے ہیں، الہی حاکمیت ایک عظیم تمنا ہے جو ان کی منطقی عقل، خواہش وجدان اور انسانی اصول سے ہم اہنگ ہے اسی وجہ سے وہ تناقض اور ٹکراؤ جو ڈیموکریسی اور عوامی نظام میں پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ (ڈیموکریسی) نظریہ باطل ہو جاتا ہے، لیکن (وہ تناقض اور ٹکراؤ) اسلامی حکومت میں نہیں پایا جاتا؛ اور اس تھیوری اور نظریہ میں مکمل طور پر معاشرہ کی وحدت اور نظم و ضبط کا خیال رکھا جاتا ہے۔

اگر ہم اسلامی نظام حکومتی کا آج کل کی دنیا میں رائج ڈیموکریسی جو صرف عوام الناس کے ووٹوں کی بنیاد پر ہوتی ہے؛ مقابلہ کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اسلامی نظام حکومت جو ہمارے عقیدہ کی بنا پر خداوند عالم سے نسبت رکھتا ہے اور عوام الناس کی حمایت اور ان کے رائے کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے؛ اس میں مزید اعتبار پایا جاتا ہے؛ کیونکہ ہم عوام الناس کے ووٹوں سے انکار نہیں کرتے اور ان کا احترام کرتے ہیں اور جمہوری اسلامی ایران کے بھت سے ادارے، سازمان وغیرہ عوام الناس کے ووٹوں سے تشکیل پاتے ہیں؛ مثال کے طور پر صدر مملکت کا انتخاب، ممبر آف پارلیمنٹ کا انتخاب، خبرگان رہبری اور شوری اسلامی شہر وروستا جو تمام عوام الناس کے ووٹوں سے بنائے جاتے ہیں اسی وجہ سے ہم عرض کرتے ہیں کہ ہمارا حکومتی نظام خدا کی اجازت کی وجہ سے ہوتا ہے اور عوام الناس کی حمایت بھی اس میں شامل ہوتی ہے، لیکن عوامی اور ڈیموکریسی نظام جو صرف عوام الناس کے ووٹوں پر استحکام پیدا کرتا ہے اگر ہمارے سامنے ڈیموکریسی تھیوری کو لایا جائے تو ان سے یہ کہیں گے کہ جو کچھ تمہاری حکومتوں میں ہے ہمارے یہاں بھی ہے اور ہم بھی عوام الناس کے ووٹوں کے معتقد ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں اس کے علاوہ منطقی اور عقلی لحاظ سے اسلامی حکومت کی تھیوری ڈیموکریسی تھیوری پر برتری اور فضیلت رکھتی ہے، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ ڈیموکریسی نظام اندرونی اتحاد اور صحیح منطقی اور عقلی دلیل نہیں رکھتی، اور اس میں تناقض اور ٹکراؤ پایا جاتا ہے، لیکن ولایت فقیہ کی تھیوری عقلی اور منطقی لحاظ سے بھی مستحکم اور مضبوط ہے جس میں کسی بھی طرح کا کوئی تناقض نہیں پایا جاتا۔

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ بعض روشن فکر اور غلط فکر رکھنے والے کی طرف سے یہ اعتراض ہوتا ہے کہ کیوں خداوند عالم نے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کر کے، آسمانی کتابوں، اور آسمانی شریعتوں کو نازل کر کے نیز فوجداری قوانین جیسے ہاتھ کاٹنا، جرمانہ کرنا اور دوسری حدود و تعزیرات وغیرہ کو پیش کر کے عوام الناس کی آزادی کو سلب کر لیا ہے اور ان کو آزاد نہیں چھوڑا تاکہ جو کرنا چاہیں کر سکیں اور ان کو تحت فشار قرار دیا ہے؛ جبکہ اصل انسانیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ مکمل طریقہ سے آزاد ہو، کیونکہ آزادی انسانی کی اہم خصوصیات میں سے ہے؟

قارئین کرام! جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ مطلق آزادی؛ انسانی حقیقت اور اس کے اجتماعی ہونے سے ہم اہنگ نہیں ہے اگر ہم نے یہ مان لیا کہ انسان کی زندگی اجتماعی ہے تو پھر اس کی اجتماعی زندگی اس بات کی تقاضا کرتی ہے کہ عوام الناس کے نظم و ضبط کے لئے لازم الاجراء قوانین اور مقررات کا ہونا ضروری ہے اور ان کو نافذ کرنے کے لئے ایک حکومت کا ہونا ضروری ہے۔ مذکورہ دلیل دنیا بھر کی تمام حکومتوں میں مقبول ہے اور اسلام بھی اس کو قبول کرتا ہے، اور ہمیشہ سے عوام الناس اس کا اعتقاد رکھتے تھے نیز اس پر کسی طرح کا کوئی اعتراض بھی نہیں ہوتا تھا لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ حکومت کی ضرورت، قوانین اور مقررات کا جاری کرنا، اور بعض حالات میں اپنی طاقت کو بروئے کار لانے کے سلسلہ میں ڈیموکریسی اور عوامی حکومت میں بحد

کافی منطقی دلیل موجود نہیں ہے اور ان کی حکومتی تھیوری اندرونی اتحاد و انسجام نہیں رکھتی اور اس میں تناقض اور ٹکراؤ پایا جاتا ہے۔

لیکن اسلامی حکومتی نظام میں دلیل جدلی بھی موجود ہے کیونکہ ہم بھی ڈیموکریسی اصول پر عمل کرتے ہیں اور عوام الناس کے ووٹوں کو اہمیت دیتے ہیں اور بھت سے حکومتی ادارے عوام الناس کے ووٹوں ہی سے چلتے ہیں، اسی طرح منطقی اور عقلی برہانی اصول پر بنی ہوتی ہے؛ منجملہ یہ کہ اصل حاکمیت خدا کا حق ہے کیونکہ عوام الناس خدا کے بندے ہیں، دوسروں کی حکومت اس وقت صحیح اور حق ہو سکتی ہے جب خدا کی مرضی اور اس کی اجازت سے ہو یعنی صرف خدا کی اجازت سے خدا کے بندوں پر حکومت کی جا سکتی ہے، وہ حکومت جس میں الہی منشاء نہ ہو اور خداوند عالم کی طرف نسبت نہ ہو؛ تو ایسی حکومت باطل اور حق اور عقلی اصول کے برخلاف ہے۔

حوالے

(۱) سورہ کھف آیت ۲۹

(۲) سورہ انسان (دھر) آیت ۳

(۳) سورہ فاطر آیت ۲۴

(۴) سورہ نور آیت ۲

چھٹی سواں جلسہ

اسلامی قوانین قطعی طور پر جاری ہونے چاہئیں

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

قارئین کرام! اس سے پہلے جلسہ میں ہم نے عرض کیا کہ انسانی عقل و وجدان ”بایدھا اور نبایدھا“ (کرنا چاہئے اور نہ کرنا چاہئے) انسان کے لئے معین کرتی ہے اور بھت کاموں کے بارے میں یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کیا کام نہیں کرنا چاہئے اور کیا کام نہ کرنا چاہئے جس کے نتیجہ میں انسان کی آزادی محدود ہو کر رہ جاتی ہے؛ لیکن چونکہ آزادی کی محدودیت انسان کی اندرونی طاقت کے ذریعہ ہوتی ہے لہذا اس کی آزادی سلب ہونے کا سبب نہیں بنتا اور کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ انسانی عقل کی نصیحتوں سے اس کی آزادی سلب ہو جاتی ہے انسانی عقل اور وجدان کی اندرونی نصیحتوں کی طرح مسلمانوں کے لئے خداوند عالم کے اوامر اور احکام ہوتے ہیں جو خدا اور رسول کے ذریعہ صادر ہوتے ہیں جس طرح ہماری عقل کسی کام کو انجام دینے کا حکم کرتی ہے اسی طرح خداوند عالم نے بھی ہمارے لئے کچھ وظائف قرار دئے ہیں وہ وظائف جو واقعی مصالح (و فوائد) کی بنا پر صادر ہوتے ہیں چونکہ خداوند عالم ان کے بارے میں لامحدود علم رکھتا ہے اور ان کا سمجھنا ہماری عقل سے بالاتر ہے۔

گویا یہاں پر اندرونی عقل متصل کے علاوہ خداوند عالم عقل منفصل اور بے نہایت؛ انسان کے کامل مصالح اور اس کے خطرات سے مکمل طور سے معین کرتا ہے اسی وجہ سے ہم سے یہ چاہتا ہے کہ فلاں کام کو انجام دیں کیونکہ یہ کام ہمارے حق میں ہے اور فلاں کام کو انجام نہ دیں چونکہ ہمارے لئے باعث ضرر ہے۔

انسانی آزادی کی یہ محدودیت جو خدا اور بندے کے درمیان موجود رابطہ کی بنا پر پیدا ہوتا ہے سیاسی یا حقوقی فلسفہ سے متعلق نہیں ہے اور سیاسی لحاظ سے بھی مشکل ساز نہیں ہے کیونکہ خدا پر ایمان رکھنے والے افراد اپنے عقیدہ کی بنا پر اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ کچھ کاموں کو انجام دیا جائے اور کچھ کاموں سے پرہیز کیا جائے، اور یہ لازمی عقیدہ اور کارکردگی معاشرہ سے متعلق نہیں ہے بلکہ انسان کے خدا سے رابطہ کی بنا پر ہے جیسا کہ انسان اپنی عقل سے رابطہ رکھتا ہے۔

۲۔ حکومت کی ضرورت اور انسان کی اجتماعی زندگی کا عکس العمل

قارئین کرام! یہاں پر بحث یہ ہے کہ بھت سے کام خود انسان کے ذات اور اس کی دنیا و آخرت سے متعلق نہیں ہوتے بلکہ دوسروں کے لئے بھی موثر ہوتے ہیں اور ان کا فائدہ یا نقصان عوام الناس اور معاشرہ تک بھی پھونچتا ہے چنانچہ اس موقع پر دنیا

بھر کے دانشور حضرات معتقد ہو جاتے ہیں کہ ایک ایسے نظام کا ہونا ضروری ہے جو معاشرہ کے لئے نقصان دہ چیزوں کی روک تھام کر سکے اور جو لوگ خلاف ورزی کریں ان کو سزائے اعمال تک پھونچائے۔

لہذا حکومت کی ضرورت اور یہ کہ ہمیں ایک طاقت کی ضرورت ہے جو معاشرہ کے نقصان کو روک سکے، سماج کا نقصان نہ ہو اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا مل سکے، اسی وجہ سے حکومت کی ضرورت ہوتی ہے اسی بنا پر ”انارشیست“ ”Anarchiste“ (فساد طلب) کے علاوہ دنیا بھر کے تمام صاحب علم سیاست اور حقوق کے رکھوالے حکومت کو ضروری سمجھتے ہیں؛ لیکن اخلاقی اقدار اور وہ اچھائیاں اور برائیاں جن کو خود انسانی عقل اپنی ذاتی زندگی میں معین کرتی ہے ان کا سیاست اور حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہاں پر ایک دوسری بحث یہ ہوتی ہے کہ عقل انسانی انفرادی، ذاتی اور معنوی مسائل کے علاوہ آزادی کے ایک حصے کو محدود کرتی ہے تو کیا حکومت بھی انسان کی آزادی کو محدود کر سکتی ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے لحاظ سے حکومت کی خصوصیت اور اس کا تقاضا ہی آزادی کو محدود کرنا ہے، کیونکہ اگر کوئی حکومت کی ضرورت کو مانتا ہو لیکن آزادی کو محدود کرنے کو قبول نہ کرتا ہو تو اس کی بات تناقض گوئی پر مشتمل ہے حکومت قوانین اور مقررات مرتب کرتی ہے اور بعض کاموں کو جائز اور بعض کاموں کو ممنوع قرار دیتی ہے اور اگر کوئی ان کی خلاف ورزی کرے تو بعض کو مالی جبرمانہ بعض کو زندان اور بعض کو دوسرے طریقوں سے سزائیں دیتی ہے۔

یہاں تک کہ بعض حکومتوں میں مثلاً اسلامی حکومت میں جسمانی سزائیں جیسے سزائے موت بھی قرار دی گئی ہے لہذا اس مقدمہ کو قبول کرنا ضروری ہے کہ بنیادی طور پر حکومت کا وجود اجتماعی آزادی کو محدود کرنے کے لئے ہی ہوتا ہے اور آزادی کے محدود نہ ہونے کا مطلب حکومت کا نہ ہونا ہے ہمیں یہ قبول کرنا چاہئے کہ اجتماعی زندگی کے لئے حکومت کی ضرورت ہے یعنی یہ قبول کریں کہ انسان کی سیاسی اور اجتماعی آزادی محدود ہو، یا یہ قبول کریں کہ انسانی اجتماعی زندگی کے لئے حکومت کی ضرورت نہیں ہے اور کسی کو دوسروں پر مختلف طریقوں سے دباؤ ڈالنے کا بھی حق نہیں ہے؛ جس کے نتیجے میں عوام الناس سیاسی اور اجتماعی مسائل میں مطلق آزادی سے بھرہ مند ہو سکیں۔

قارئین کرام! ہماری گذشتہ گفتگو کے پیش نظر یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ جو لوگ یہ نعرہ لگاتے ہیں کہ ”آزادی حکومت اور قانون سے بالاتر ہے“ صرف ایک مغالطہ ہے حکومت کو چاہئے کہ آزادی کو محدود کرے اور اگر کوئی اس بات کا قائل ہو جائے کہ کوئی بھی حکومت انسانوں کی سیاسی اور اجتماعی آزادی کو محدود نہیں کر سکتی۔؛ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور حکومت بے کار، نامشروع اور غیر قانونی اور طاقت کے بل بوتے پر ہے۔

۳۔ حکومت کی مشروعیت کے منشاء کی طرف ایک اشارہ اور ڈیموکریسی پر اشکالات

قارئین کرام! اب جبکہ ہم نے یہ قبول کر لیا ہے کہ معاشرہ میں ایک قانونی اور مشروع حکومت کا وجود ضروری ہے جس سے سیاسی اور اجتماعی آزادی محدود ہو جائے، اس کے بعد ایک اساسی اور بنیادی مسئلہ ہمارے سامنے ہے: اول یہ کہ حکومت کس وجہ سے قانونی اور مشروعیت پیدا کرتی ہے اور حکومت کس حق کی بنا پر آزادی کو محدود کرتی ہے؟ دوسرے یہ کہ حکومت کس حد تک آزادی کو محدود کر سکتی ہے؟

گذشتہ بحث میں یہ بات واضح اور روشن ہو چکی ہے کہ ہمارے عقیدہ کی بنا پر اسلامی سیاسی نظریہ کے علاوہ حکومت کے لئے کوئی قابل قبول اور عقل پسند دلیل نہیں ہے کیونکہ اگر ہم یہ کہیں کہ حکومت کے زیر سایہ عوام الناس خود اپنی آزادی کو محدود کرتے ہیں البتہ اس چیز سے قطع نظر کہ اگر کوئی چاہے تو اپنی آزادی پر کنٹرول کر سکتا ہے اور پھر اس صورت میں حکومت کی کوئی ضرورت نہیں ہے تاکہ اس کی آزادی کنٹرول کی جاسکے، یہ نظریہ تناقض گوئی پر مشتمل ہے؛ کیونکہ جو شخص آزاد رہنا چاہتا ہے وہ کبھی بھی اپنی آزادی کو محدود کرنا نہیں چاہتا۔

سب سے آخری اور بہترین نظریہ جو دنیا بھر میں حکومت کی مشروعیت اور قانونی ہونے کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے اور دنیا بھر کے لوگ اس نظریہ کو قبول (بھی) کرتے ہیں یہ ہے کہ عوام الناس اپنے بعض حقوق حکومت کے حوالے کر دیتے ہیں یعنی یہ انسان جو اپنی زندگی کا حاکم ہے اور اپنی زندگی کے لئے (مخصوص) قوانین بنا سکتا ہے اور اپنی آزادی کو محدود کر سکتا ہے، لیکن اپنے اس حق کو حکومت کے حوالے کر دیتا ہے تاکہ اس کی اجتماعی زندگی کے لئے (بہترین) قوانین بنائے اور ان کو نافذ کرے یہ حکومت کو حاکمیت کا حق حوالے کرنا آج کل کی دنیا میں ڈیموکریسی کے نام سے مشہور و معروف ہے۔

قارئین کرام! آج کل کی ڈیموکریسی تھیوری پر بھت سے اشکالات وارد ہوتے ہیں، ہم ان میں سے صرف تین اشکالات پر اکتفاء کرتے ہیں:

پہلا اشکال:

کیا انسان کو اپنے اندر ہر طرح کا تصرف کرنے، اپنی آزادی کو محدود کرنے اور اپنے پر دباؤ ڈالنے کا حق ہے؟ یعنی کیا انسان کو حق ہے کہ خود اپنے کو سزا دے؟ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دنیا بھر میں آج کل کی تمام حکومتیں خلاف ورزی کرنے والوں کی سزا معین کرتی ہیں اور بعض جرائم کے لئے قید با مشقت قرار دیتی ہے اور بعض جرائم کے لئے جسمانی سزا، شکنجہ اور سزائے موت قرار دیتی ہے تو کیا انسان کو خود کشی کا حق ہے کہ جس کے نتیجے میں اپنے لئے سولی کا حکم حکومت کے حوالے کر دے؟ اگر انسان خود کشی کا حق رکھتا ہو تو وہ دوسرے کو اس طرح کے قانون بنانے کا حق دے سکتا ہے کہ اگر اس نے بعض ایسے جرائم کو انجام دیا

جن کی سزا سولی ہو اور حکومت اس کے حق میں جاری کر سکے بے شک انسان خودکشی کا حق نہیں رکھتا کیونکہ انسان کو اپنی جان کا اختیار نہیں ہے تاکہ جب بھی چاہے ختم کر دے، انسان کی جان خداوند عالم کی طرف سے ہے، اور کسی کو اپنی جان کو نقصان پہنچانے کا حق حاصل نہیں ہے حد تو یہ ہے کہ اسلامی نظریہ کے مطابق انسان اپنے بدن کو نقصان بھی نہیں پہنچا سکتا کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے بدن کو زخمی کر لے مثلاً اپنے ہاتھ یا انگلی کو کاٹ لے کیونکہ انسان کا بدن خدا سے متعلق ہے اور انسان اس کا مالک اور صاحب اختیار نہیں ہے اس صورت میں کس طرح انسان حکومت کو سزائی اور فوجداری قوانین بنانے کا حق دے سکتا ہے اور حکومت کو مجرموں کو سزا دینے کی اجازت دے اور چور کے ہاتھ کاٹ دے جائیں اور بعض مجرموں کو سزائے موت دیدی جائے؟

دوسرا اشکال:

فرض کر لیں کہ انسان اپنی جان اور بدن میں ہر طرح کا تصرف کر سکتا ہے اور اپنے بدن کو نقصان اور ضرر پہنچا سکتا ہے اور اپنی زندگی کو ختم کر سکتا ہے اور اس صورت میں اپنا یہ حق حکومت کے حوالے کر دیتا ہے درحقیقت جو شخص پارلیمنٹ کو ووٹ دیتا ہے گویا قانون گذاری کے سلسلہ میں پارلیمنٹ کو اپنا وکیل بنا دیتا ہے کہ اس کی اجتماعی زندگی کے لئے قوانین اور مقررات بنائے جن میں سے حقوقی اور سزائے قوانین (بھی) ہیں؛ اسی طرح حکومت کو بھی اپنا وکیل بناتا ہے کہ اس پر قوانین نافذ کرے لیکن اس صورت میں صرف حکومت کو اپنے اوپر تصرف کا حق دیتا ہے، لیکن یہ حق نہیں دیتا کہ حکومت دوسروں پر بھی تصرف کرے اور ان کے حقوق اور ان کی آزادی کو سلب کرے بالفرض اگر انسان اپنے کو سزا دینے کا حق رکھتا ہو اور یہ حق حکومت کو دیدے کہ اگر اس نے خلاف ورزی کی تو اس کو سزا دے، تو اس صورت میں (بھی) صرف اپنا وکیل بنا سکتا ہے کہ اس کی طرف سے تصیم گیری کرے اور اس پر عمل کرے لیکن دوسروں کو سزا دینے کا حق (اسے نہیں ہے تاکہ یہ حق) حکومت کے حوالے کر دے۔

ڈیموکریسی نظریہ کی رائج اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ عوام الناس حکومت کو وکالت دیتے ہیں اور اس کو اپنا وکیل اور نمائندہ قرار دیتی ہیں تاکہ وہ مختلف قوانین بنائے اور ان کو جاری کرے آج دنیا بھر میں رائج ڈیموکریسی حکومت اگر اکثریت سے جیت جائے یعنی ۵۱% یا اس سے زیادہ ووٹ حاصل کر لے تو پھر اسے حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ پورے معاشرہ کے لئے منجملہ ان لوگوں کے لئے (بھی) جنہوں نے حکومت کو ووٹ نہیں دیا ہے؛ قوانین بنائے اور ان کو لاگو کرے درحقیقت جب آدھے لوگوں نے نہ کہ سب نے حکومت کو ووٹ دئے ہیں صرف وہی لوگ حکومتی قوانین کو قانونی مانیں گے اور معاشرہ کے وہی لوگ ان قوانین کے سامنے اپنا سر تسلیم کریں گے لیکن یہاں پر ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تقریباً آدھے لوگوں نے حکومت کو ووٹ ہی نہیں دیا

اور حکومت کو اپنا وکیل ہی قرار نہیں دیا کہ ان کی طرف سے قوانین بنائے اور ان کو جاری کرے، تو پھر اس صورت میں حکومت کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ ان کی اجتماعی زندگی کے لئے قوانین بنائے، اور کس وجہ سے وہ ان پر حکم چلائے؟ اور اگر انہوں نے خلاف ورزی کی ہو تو ان کو سزائے اعمال تک پھونچائے؟ لہذا طے یہ ہوا کہ حکومت کے لئے اپنے مخالفین اور جن لوگوں نے اس کو ووٹ نہیں دیا ہے؛ ان پر حکومت کرنے، اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنی اطاعت پر مجبور کرنے کے لئے کوئی (بھی) عقل پسند راستہ موجود نہیں ہے۔

تیسرا اشکال:

قارئین کرام! موکل کو اپنے وکیل کو معزول کرنے کا حق ہوتا ہے، یا اس کے بنائے ہوئے منصوبوں کو لغو اور بے اثر کرنے کا حق ہوتا ہے لہذا اگر کوئی شخص ممبر آف پارلیمنٹ کو ووٹ دے کر انتخاب کر لے لیکن اس کے بعد اپنی رائے سے پلٹ جائے تو وہ اپنے نمائندہ کو اس مقام سے معزول کر سکتا ہے اس کے علاوہ وکیل کو صرف موکل کی مرضی کے مطابق ووٹ دینے کا حق ہوتا ہے اور یہ حق نہیں ہوتا کہ اپنے موکلوں کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھائے اب اگر تمام عوام الناس یا ان میں آدھے افراد کسی قانون کے مخالف ہوں، تو حکومت اس قانون کو کس حق کے تحت جاری کر سکتی ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ ڈیموکریسی حکومت کی مشروعیت اور قانونی ہونے کے لئے کوئی عقل پسند راستہ موجود نہیں ہے! اور اس سلسلہ میں ڈیموکریسی نظریہ کے طرفدار لوگ یہ کہتے ہیں کہ ملک اور معاشرہ کو چلانے کے لئے ڈیموکریسی نظریہ سب سے بہترین نظریہ ہے کیونکہ اگر اقلیت کی مرضی کے مطابق حکومت بنے اور ان کی مرضی کے مطابق عمل کرے تو پھر اکثر عوام الناس کا حق ضایع ہو جائے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عوام الناس کی اکثریت مظاہرہ کرنے لگیں گے اور اس صورت میں ان کی شورش اور انقلاب کو روکنا مشکل ہو جائے گا یہی وجہ ہے کہ حکومت عوام الناس کی اکثریت سے انتخاب ہو اور ان کی مرضی کے مطابق عمل کرے؛ نہ یہ کہ حکومت عقل پسند مشروعیت رکھتی ہے۔

۲۔ اسلام میں حکومت کی مشروعیت اور اس کا قانونی ہونا

اسلامی نظریہ کے مطابق، وہ عقل جو انسان سے کھتی ہے کہ فلاں کام اچھا ہے اور فلاں کام بُرا ہے، وہی عقل جو انسان سے کھتی ہے کہ ماں باپ، استاد اور عوام الناس تم پر حق رکھتے ہیں لہذا ان کے حقوق کو ادا کرنا چاہئے، وہی عقل انسان سے کھتی ہے کہ وہ خدا جس نے تمام دنیا، تجھے اور تمام مخلوقات کو پیدا کیا ہے اس کے حقوق دوسروں سے بھت زیادہ اور عظیم ہیں اور انسان کو چاہئے کہ ان کو ادا کرنا چاہتے اب چونکہ خداوند عالم نے ہمیں پیدا کیا ہے اور ہمارے وجود بلکہ تمام کائنات کا مالک ہے اور تمام

چیزیں اس کے ارادہ سے وجود میں آتی ہیں، اور اگر وہ ارادہ کمر لے تو تمام چیزیں نابود ہو جائیں گی، اس نے اگر کسی کو قوانین نافذ کرنے کے لئے معین کیا ہے تو اس کا حکومت کرنا قانونی اور مشروعیت رکھتا ہے اور پھر عوام الناس کے قبول کرنے یا نہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے جس وقت وہ خدا جو ہم پر سب سے زیادہ حقوق رکھتا ہے (بلکہ تمام ہی حقوق اسی کی طرف سے ہیں) اس نے حکومت اور ولایت کا حق پیغمبر، ائمہ معصومین علیہم السلام یا امام معصوم (ع) کے جانشین کو دیا ہے، اس کو حق ہے کہ معاشرہ میں خدائی احکام نافذ کرے، کیونکہ یہ شخص اس ذات کی طرف سے منصوب ہوا ہے کہ کل ہستی، تمام اچھائیاں اور تمام حقوق و خوبصورتی اسی کی طرف سے ہے۔

اس بنا پر اسلامی حکومتی نظریہ میں جس میں حاکم اسلامی خداوند عالم کی طرف سے قوانین اور احکام الہی جاری کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے، لہذا وہی مجرموں اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائے اعمال تک پھونچا سکتا ہے، اور اس میں کسی بھی طرح کا کوئی تعارض نہیں ہے اور یہ نظریہ عقلی اصول پر (بھی) منطبق ہے البتہ یہ نظریہ ان لوگوں کے نزدیک قابل قبول ہے جو خداوند عالم پر ایمان رکھتے ہیں ورنہ اگر کوئی شخص خدا کو قبول نہ رکھتا ہو تو پھر وہ شخص اس نظریہ کو بھی قبول نہیں کرے گا، اور ہم پہلے اس کے لئے خداوند عالم کے وجود کا اثبات کریں اور اگر وہ خدا پر ایمان لے آتا ہے تو پھر اس موقع پر اس سے بیٹھ کر حکومت کے سلسلے میں اسلامی سیاسی نظریہ کے بارے میں بحث کریں لہذا جو افراد جو خدا، رسول اور دین کو مانتے ہیں ان کے لئے بہترین راہ حکومت کی مشروعیت اور قانونی ہونے کے لئے یہی ہے کہ کل کائنات کا مالک خدا؛ معاشرہ کے مصلح کی رعایت کے لئے حق حکومت اپنے کسی (خاص) بندے کو عنایت کرتا ہے (تاکہ انسان معاشرہ کی خیر و بھلائی کے ساتھ آخرت کی سعادت بھی حاصل ہو جائے)

اسلامی معرفت کے پیش نظر اسی طرح اسلامی سیاسی نظریہ کی شناخت کی بنا پر معلوم یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کے ایک دوسرے پر حقوق سے بالاتر خداوند عالم حق ہے خداوند عالم کا، اس بنا پر اگر خداوند عالم اپنے کسی بندے کو کوئی کام کرنے کا حکم دے چاہے اس کے نقصان میں ہی کیوں نہ ہو تو اس کو انجام دینا چاہئے؛ البتہ خداوند عالم اپنے بے انتہا لطف و کرم اور مہربانی کی وجہ سے اپنی مخلوقات کے ضرر اور نقصان میں امر و نہی صادر نہیں کرتا، وہ کسی کا نقصان نہیں چاہتا اور اس کے اوامر و نواہی انسان کی دنیا و آخرت کی مصلحت اور اس کی بھلائی میں ہوتے ہیں اور اگر خداوند عالم کے احکام کی تعمیل کی بنا پر انسان کو اس دنیا میں کچھ نقصان بھی ہوتا ہے مثال کے طور پر اگر چند روزہ دنیا میں بعض لذتوں اور نعمتوں سے محروم رہتا ہے تو خداوند عالم اس کو آخرت میں جبران کر دے گا اور دنیا میں ہونے اس کے نقصان کے ہزاروں برابر اس کو ثواب اور اجر عنایت فرمائے گا۔

خداوند عالم نے اپنی طرف سے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا تاکہ عوام الناس کو دین اور دنیا کے خیر و بھلائی کی ہدایت کریں خدا کی طرف سے بھیجا ہوا نبی پہلے تو حق (خدا) کی طرف دعوت دیتا ہے اور خدا کی آیات کو لوگوں کے سامنے تلاوت کرتا ہے اور جب ان کو خدا کی شناخت اور معرفت ہو جاتی ہے اور وظائف اور تکالیف قبول کرنے کا ذمہ فرماہم کرتا ہے درحقیقت اس مرحلہ میں نبی یا پیغمبر عقل منفصل کا کردار ادا کرتا ہے، اور اس سلسلہ میں کسی بھی طرح کا کوئی زور اور دباؤ نہیں دیا جاتا اور ان کی آزادی سلب کئے بغیر ان کی عقل و فہم کو بلند کرتا ہے تاکہ ان میں آزادانہ طور پر انتخاب کا ذمہ فرماہم ہو جائے اور آزادانہ طور پر اسلام اور اس کے عظیم احکام کو قبول کرنے کا مادہ پیدا ہو جائے۔

پیغمبر اس لئے مبعوث ہوتا ہے تاکہ لوگوں کو حق و باطل کی شناخت کرائے اور ان کو حق و باطل کے راستہ پر لا کر کھڑا کر دے تاکہ اپنی مرضی اور آزادی سے یا راہ حق و حقیقت کا انتخاب کر لے یا باطل کا راستہ اپنالے اس کے لئے وہ اپنی طاقت کے ذریعہ رسالت کو قبول نہیں کرتا یا دباؤ ڈال کر اپنے نظریات لوگوں سے قبول نہیں کرتا، (کیونکہ) یہ ارادہ الہی کے برخلاف ہے، خداوند عالم کا ارادہ یہ ہے کہ عوام الناس حق و باطل کے راستہ کو پہنچان کر آزادانہ طور پر کسی ایک کا انتخاب کریں لہذا معلوم یہ ہوا کہ خدا کا بھیجنا نبی پہلے مرحلہ میں عوام الناس سے رابطہ برقرار کرتا ہے اور ان کو اپنے سے مانوس کرتا ہے ان سے گفتگو کرتا ہے نیز عقل دلائل، معجزات اور آیات الہی کے ذریعہ اپنا پیغام ان تک پھونچاتا ہے، اور حق (و حقیقت) کی پہنچان کرتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام خداوند عالم، اس کی آیات اور الہی نظام کو مستقر ہونے کے سلسلہ میں عوام الناس پر کسی طرح کا کوئی سختی اور دباؤ نہیں ڈالتے تھے، ان کے اہداف میں لوگوں کی آزادی اور آگاہانہ انتخاب پر خاص توجہ رکھی جاتی تھی، درحقیقت عوام الناس کی آزادی کا خیال دوسرے نظاموں سے زیادہ رکھا جاتا تھا، ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ عوام الناس دعوت خدا اور نظام کو قبول کرنے میں مکمل طور پر آزاد ہوں اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ انسان کو خلق کرنے سے خداوند عالم کا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ انسان آزاد اور خود انتخاب کرنے والا ہو اور اپنے مکمل اختیار اور آزادانہ طریقہ سے راہ حق کا انتخاب کرے اور اسی کی ہدایت حاصل کرے، انبیاء علیہم السلام کا دعوت خدا اور نظام الہی کا قیام کے لئے اپنی طاقت اور زور کا استعمال کرنا؛ خداوند عالم کے ہدف اور مقصد سے ہم اہنگ نہیں ہے اگر طے یہ ہو کہ انسان کسی راستہ کو مجبوری کی حالت میں یا طاقت کے زور پر قبول کرے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس راستہ کی حقانیت کو نہ پہنچانے، یہاں تک کہ شاید اس راستہ کے صحیح (بھی) نہ مانتا ہو؛ کسی بھی راستہ کی حقانیت اور اس کے صحیح ہونے کو معین کرنے کے لئے پہلے اس کے بارے میں شناخت اور معرفت ضروری ہے اور آزاد طور پر اس راستہ کو انتخاب کرنے کا ذمہ ہموار کیا جائے اور پھر خداوند عالم کے اس ہدف کے تحت کہ انسان علم و آگاہی کے ساتھ آزادانہ طور پر حق و حقیقت کا راستہ انتخاب کرے، خداوند عالم نے معجزہ کے ذریعہ راہ حق کو عوام الناس پر نہیں تھوپنا ہے اور

اس کی مرضی بھی یہ نہیں ہے کہ معجزہ کے ذریعہ لوگوں کو آزادانہ انتخاب سے روک دے اور ان کی مرضی میں تصرف کرے تاکہ غیر اختیاری طور پر راہ حق کو قبول کر لیں، اور اس کے مقابلہ میں سست پڑ جائے، اسی وجہ سے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ إِن نَّشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ﴾ (۱)

”(اے رسول) شاید تم (اس فکر میں) اپنی جان ہلاک کر ڈالو گے کہ یہ (کفار) مومن کیوں نہیں ہو جاتے اگر ہم چاہیں تو ان لوگوں پر آسمان سے کوئی ایسا معجزہ نازل کریں کہ ان لوگوں کی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں“

۶۔ عوام الناس کی ہدایت میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کی ضرورت

قارئین کرام! اس بات پر توجہ رہے کہ خداوند عالم نے عوام الناس کی ہدایت کے لئے اپنی طرف سے انبیاء بھیجے تاکہ راہ حق و باطل میں شناخت کرائیں، تاکہ وہ صحیح راہ کی شناخت اور معرفت کے بعد آزادانہ طور پر اس صحیح راستہ کا انتخاب کریں؛ بعض مستکبر اور منفعت طلب لوگ جو لوگوں کی جھل و نادانی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بھت زیادہ مال و دولت اکٹھا کر لیتے ہیں وہ لوگ انبیاء علیہم السلام کی دعوت حق اور لوگوں کی ہدایت میں اپنے شیطانی اہداف کی بنا پر مانع ہوتے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام سے مقابلہ کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام کو عوام الناس سے گفتگو بھی نہیں کرنے دیتے یا ان کو آیات الہی بھی نہیں سنانے دیتے تاکہ کہیں ایسا نہ ہوں کہ یہ لوگ ہدایت پا جائیں یہ لوگ اپنی طاقت کے بل بوتے پر عوام الناس کو بھت زیادہ آزار و اذیت پھونچاتے ہیں اور ان کے لئے بھت سی مشکلیں پیدا کر دیتے ہیں تاکہ عوام الناس ہدایت سے فیضیاب نہ ہو سکیں یہ لوگ جو عوام الناس کی ہدایت میں مانع ہوتے ہیں خداوند عالم نے ان کو قرآن مجید میں ”ائمہ کفر“ اور فتنہ و فساد کی جڑ کھا ہے، اور حکم دیا کہ پیغمبر اور ان کے ساتھی ان سے مقابلہ کریں اور ان کو اپنے راستہ سے ہٹادیں؛ کیونکہ ان کا وجود اور ان کی شیطانی اور باطل حرکتیں خدائی اہداف میں مانع ہوتی ہیں کیونکہ خداوند عالم تو یہ چاہتا ہے کہ تمام انسان ہدایت سے سرفراز ہو جائیں اور راہ حق و باطل کو پہچان لیں، لیکن یہ لوگ مانع ہوتے ہیں:

ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

﴿فَقَاتِلُوا أِتْمَةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَأِ يْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهِمْ يَنْتَهُونَ﴾ (۲)

”تو تم کفر کے سربر آوردہ لوگوں سے خوب لڑائی کرو ان کی چار قسموں کا ہرگز کوئی اعتبار نہیں ہے تاکہ یہ لوگ اپنی شرارت سے باز آجائیں“

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص سڑک پر گاڑی چلا رہا ہے اور اس کے راستہ میں ایک بڑا سا پتھر موجود ہو تو اس کو اپنا راستہ طے کرنے کے لئے اس پتھر کو سڑک سے اٹھا کر دور پھینکا پڑے گا، اور اس سلسلہ میں اپنی تمام تر کوششوں کو اس میں لگا دے گا تاکہ

اس پتھر کو اپنے راستہ سے ہٹا دے اصولی طور پر ہر صاحب عقل انسان اپنے راستہ میں آنے والی رکاوٹ کو دور کرتا ہے خداوند عالم بھی اپنے اس ہدف کے تحت کہ انسان ہدایت یافتہ ہو جائے؛ حکم دیا ہے کہ پیغمبر اور ان کے اصحاب، بلکہ دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ ہدایت کے سلسلہ میں موجود دنیا بھر کے استکبار، بادشاہ، ستمگر، دولت پرست اور تمام شیطانی قدرتوں کے ساتھ جنگ کریں اور ان کو نابود کر دیں۔

خلاصہ یہ کہ: خداوند عالم کا فرمان یہ ہے کہ انسانوں کی ہدایت میں جو لوگ مانع ہوں (اہل کفر و باطل) ان کے ساتھ طاقت کے ذریعہ مقابلہ کیا جائے اور شدت پسندی کو ان کے حق جائز قرار دیا گیا ہے خداوند عالم نہیں فرماتا کہ ان کے ساتھ بیٹھ کر مسکرائیں اور خوش لہجے، تبسم، التماس اور التجا کریں کہ آپ حضرات اجازت دیں تاکہ ہم عوام الناس کی ہدایت کریں! اگر وہ اس درخواست کو قبول کرنے والے ہوتے اور اپنی خوش لہجہ زبان سے اپنی برے چال چلن سے رکنے والے ہوتے تو پھر وہ مستکبر ہی کیوں ہوتے ان میں بنیادی طور پر استکبار، حیوانیت اور سرکشی ان کے اندر شامل ہے، وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے انسانوں کو اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں اور ان کا خون پی لینا چاہتے ہیں، وہ اس چیز کی اجازت نہیں دیتے کہ ان کے منافع خطرہ میں پڑ جائیں، اسی وجہ سے یہ لوگ نہیں چاہتے کہ عوام الناس ہدایت یافتہ ہو جائیں اور انبیاء (علیہم السلام) کے فرمان بردار بن جائیں مومنین اور ہدایت کے طلبگاروں کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ باقی نہیں ہے کہ ان لوگوں سے شدت اور تشدد کے ساتھ برتاؤ کیا جائے، اسی وجہ سے خداوند عالم اپنے پیغمبر اکرم (ص) کو قرآن مجید میں حکم دیتا ہے کہ ان لوگوں سے جنگ کریں اور تشدد اور غصہ کے ساتھ ان کا مقابلہ کریں وہی پیغمبر جس کی صفت خداوند عالم یوں بیان فرماتا ہے:

﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ﴾ (۲)

”(تو اے رسولیہ بھی) خدا کی ایک مہربانی ہے کہ تم (سا) نرم دل (سردار) ان کو ملا اور تم اگر بد مزاج اور سخت دل ہوتے تب تو یہ لوگ (خدا جانے کب کے) تمہارے گروہ سے تتر بتر ہو گئے ہوتے“
دوسری جگہ پیغمبر اکرم (ص) کو حکم ہوتا ہے کہ کفار (مشرکین اور منافقین) سے شدت کے ساتھ مقابلہ کریں اور ان سے جنگ کریں، اور شدت پسندی کو ان کے حق میں جائز جانتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَا وَأَهُمْ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴾ (۳)

”اے رسول کفار کے ساتھ (تلوار سے) اور منافقوں کے ساتھ (زبان سے) جہاد کرو اور ان پر سختی کرو اور ان کا ٹھکانا تو جہنم ہی ہے اور وہ (کیا) جگہ ہے“

ایک دوسری جگہ خداوند عالم اپنے پیغمبر (ص) کو حکم دیتا ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کی جان اور مال کے لئے خطرہ بنے ہوئے ہیں ان کے ساتھ شدت پسندی سے برتاؤ کریں، اور جیسے وہ کریں ان کو ویسا ہی جواب دیں، اور بھت زیادہ شدت کے ساتھ جنگ کریں، ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَأَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ﴾ (۵)

”اور جو لوگ تم سے لڑیں تم (بھی) خدا کی راہ میں ان سے لڑو اور زیادتی نہ کرو (کیونکہ) خدا زیادتی کرنے والوں کو ہرگز دوست نہیں رکھتا۔ اور تم ان مشرکوں کو جہاں پاؤ مار ہی ڈالو اور ان لوگوں نے جہاں (مکہ سے) سے تمہیں شہر بدر کیا ہے تم بھی انہیں باہر نکال دو۔ اور فتنہ پردازی (شرک) خونریزی سے بھی بڑھ کے ہے اور جب تک وہ لوگ (کفار) مسجد حرام (کعبہ) کے پاس تم سے نہ لڑیں تم بھی ان سے اس جگہ نہ لڑو پس اگر وہ تم سے لڑیں تو (بے کھٹک) تم بھی ان کو قتل کرو۔ کافروں کی یہی سزا ہے۔“

۱۔ الہی اقدار کی حفاظت اور مغربی کلچر سے روک تھام ضروری ہے

دشمنوں سے مقابلہ اور جہاد، شجاعت، غیرت، حمیت، دینی تعصب، دین سے رغبت، فداکاری اور ایثار وغیرہ بہترین اور عظیم ترین اسلامی اقدار ہیں جن کی وجہ سے مسلمانوں میں دینی پہنچان، حیات، استقلال اور آزادی وجود میں آتے ہیں لیکن اس کے مقابلہ میں مغربی کلچر (والے) یہ چاہتے ہیں کہ کچھ جھوٹے اور خود ساختہ اقدار جیسے مطلق طور پر شدت پسندی کو منع کرنا (وغیرہ) کے ذریعہ ہماری اسلامی اقدار کو ہم سے چھینا چاہتے ہیں؛ اسی وجہ یہ کہتے ہیں کہ شدت پسندی مطلق طور پر مذموم اور محکوم ہے!!

جی ہاں ہم بھی مانتے ہیں کہ ابتداء میں کسی کے ساتھ شدت پسندی مذموم اور محکوم ہے، لیکن کیا شدت پسندی کے مقابلہ میں شدت پسندی یا ظلم و ستم، قتل و غارت، جان و مال اور ناموس پر تجاوز، اور ان سب سے مہم اسلام (جس کے لئے مسلمانوں کی جان بھی قربان ہے)؛ سے خیانت کرنے والوں کے مقابلہ میں بھی شدت پسندی بری اور محکوم ہے؟ مسلم طور پر اس طرح کی شدت پسندی نہ صرف یہ کہ مذموم اور محکوم نہیں ہے بلکہ ضروری اور ہر مسلمان کی خواہش ہے۔

تو پھر کیوں ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے دینی اقدار کو پامال ہوتے ہوئے دیکھیں جو کہ ہمیں جان سے بھی زیادہ عزیز ہے ان کو تمہارے ہاتھوں برباد ہوتا ہوا دیکھیں اور اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیں اور کچھ نہ کریں اور ان کے ساتھ بیٹھ کر مسکرائیں؛ پس خداوند عالم نے انسان میں غضب کو کس لئے پیدا کیا ہے؟ کس لئے ہمارے اندر قہر و غضب کے احساس کو پیدا کیا؟ آیا کچھ شدت پسند، خائن اور زر خرید غلاموں کے مقابلہ میں کچھ بھی اقدام نہ کریں یہاں تک کہ اگر ہمارا دین بھی خطرہ میں پڑ جائے کچھ بھی نہ بولیں اور شدت پسندی کو نہ اپنائیں؛ بلکہ آرام سے بیٹھے ہوئے مسکراتے رہیں، پس یہ آیت کہ ہمہ کس کے لئے ہے:

﴿وَأَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ تَقْتُلُوهُمْ﴾

کس لئے خداوند عالم نے یہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ (۶)

”محمد (ص) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لئے سخت ترین اور آپس میں انتہائی رحم دل ہیں“
کھتے ہیں کہ اسلام تشدد اور شدت پسندی کا مخالف ہے، تو آپ حضرات کھیں کہ اسلام کس شدت پسندی کا مخالف ہے؟ بعض مبہم چیزوں کو مطلق اقدار کے عنوان سے پیش کرتے ہیں تاکہ حقیقت کو چھپا سکیں، تاکہ شہادت طلبی، ایثار اور شجاعت وغیرہ کو لوگوں سے چھین لیں، اور ان کی جگہ بے توجہی، دین سے لاپرواہی اور دینی اور ملی غیرت وغیرہ جیسے چیزوں کو عوام الناس میں رائج کریں۔

ہمیشہ تساہل (سستی) اور تسامح (ذو معنی باتیں کرنا) کی باتیں کرتے ہیں، کیا جو شخص ہماری جان کے لئے خطرہ ہو اس کے مقابلہ میں تساہل اور تسامح سے کام لیا جاسکتا ہے؟ کیا وہ شخص جو انسانی ناموس میں خیانت کرے اس کے ساتھ تساہل اور تسامح سے کام لیا جاسکتا ہے؟ کیا وہ شخص جو ہمارے دین کو جو ہماری جان سے بھی زیادہ عزیز ہے؛ ہم سے چھین لینا چاہتا ہو اس کے مقابلہ میں تساہل اور تسامح سے کام لیا جاسکتا ہے؟!

اس بنا پر، اسلامی حکومت کی تشکیل سے پہلے عوام الناس کی ہدایت کرنا ضروری ہے، اور اس مرحلہ میں عوام الناس سے سخت لہجہ میں گفتگو نہیں ہونا چاہئے، اور سختی اور طاقت کے بل بوتے پر اسلامی حکومت کے تحقق کے لئے قدم نہ اٹھایا جائے اسی طرح اس مرحلہ میں لوگوں سے جھوٹے وعدے، فریب کاری اور گمراہ کنندہ وسائل کے ذریعہ عوام الناس کی صحیح ہدایت میں مانع ہونا صحیح نہیں ہے اس مرحلہ میں بھرپور سنجیدگی، بردباری، حوصلہ، صبر اور بھرپور وضاحت، صداقت اور منطق اور عقل کی بنیاد پر عوام الناس سے گفتگو کی جائے تاکہ وہ حقیقت تک پھونچ جائیں اور غفلت و جہالت سے نجات پیدا کر لیں البتہ اس سلسلہ میں پیش آنے والی تمام تر کاوٹوں کو راستہ سے ہٹایا جائے، اور جو لوگ عوام الناس کی ہدایت میں مانع ہوتے ہوں ان سے مقابلہ کیا جائے تاکہ عوام الناس کے لئے حق و حقیقت کے راستے کو انتخاب کرنے کا راستہ فراہم ہو جائے۔

جس وقت عوام الناس کا ایک گروہ حق کی طرف ہدایت پا جائے تو پھر اس حق کے پیروکاروں میں اضافہ کرنے کے لئے اور اسلامی اور الہی معاشرہ کی وسعت کے لئے عوام الناس میں ثقافتی کارکردگی اور راہنمائی صبر و تحمل کے ساتھ ہوتی رہیں؛ جیسا کہ خداوند عالم بھی اپنے پیغمبر کو قرآن کریم میں اپنی رسالت کے پھونچانے میں صبر و تحمل کی طرف دعوت دیتا ہے اور آپ سے یہ چاہتا ہے کہ سختیوں، جبری بھلی باتوں، گالیوں، سخت برتاؤ اور اذیتوں کے مقابلہ میں صبر و تحمل سے کام لیں تاکہ عوام الناس ہدایت یافتہ ہو جائیں:

”اے رسول! صبر کرو اور لو العزم (عالی ہمت) صبر کرتے رہے تم بھی صبر کرو۔“

۸۔ قوانین کو جاری کرنے اور دشمن نظام سے بھرپور مقابلہ

قارئین کرام! جس وقت خداوند عالم کی مرضی کے مطابق اسلامی حکومت تشکیل پائے، تو معاشرہ میں اسلامی احکام اور قوانین جاری ہوں اور دوسری حکومتوں کی طرح اس میں قوہ قہریہ (پولیس یا فوج) سے استفادہ کیا جائے، نیز حکومت کے پاس خلاف ورزی کرنے والوں سے مقابلہ کے لئے کافی اسباب و وسائل موجود ہوں، اور مجرموں اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے زندان، جرمانہ اور دوسری سزائیں معین کی جائیں، اور بیرونی دشمنوں نیز اندرونی فتنہ و فساد سے روک تھام کے لئے پولیس اور فوج کا انتظام کیا جائے؛ کیونکہ حکومت صرف اخلاقی طور پر وعظ و نصیحت سے اپنا کام نہیں چلا سکتی وہ حاکم جس کے پاس طاقت اور قدرت نہ ہو اور فقط وعظ و نصیحت اور تذکر پر اکتفاء کرے وہ اخلاقی معلم تو ہو سکتا ہے حاکم نہیں ہو سکتا!!

پس جس قوت اسلامی حکومت اور قانونی حکومت تشکیل ہو جائے اور عوام الناس اس حکومت کو قبول کر لیں اور اس کی بیعت کر لیں، نیز حکومت بھی اسلامی قوانین اور احکام کو جاری کرنے اور ملکی مسائل میں رسیدگی کرنے میں مشغول ہو جائے، تو اگر کوئی گروہ فتنہ و فساد اور آشوب برپا کرے تو اس سے مقابلہ ضروری ہے جیسا کہ ہماری اسلامی فقہی کتابوں میں وارد ہوا ہے کہ فتنہ و فساد اور آشوب برپا کرنے والوں (جن کو اصطلاحاً ”اہل بنی“ (بغاوت کرنے والے) کہا جاتا ہے) سے جہاد واجب ہے جس طرح حضرت علی علیہ السلام نے فتنہ و فساد پھیلانے والوں سے مقابلہ کیا ہے اور ان کو اپنی جگہ بٹھا دیا ہے۔

حضرت رسول اکرم (ص) کی وفات غم ناک کے بعد عوام الناس حضرت علی علیہ السلام کی بیعت پر آمادہ نہیں ہوئی جس کے نتیجے میں حکومت دوسروں کے ہاتھوں میں چلی گئی، (اس وقت بھی) حضرت علی علیہ السلام نے لوگوں کی ہدایت فرمائی اور ان کی راہنمائی کی ہے، اور حضرت نے ۲۵ سال سے اپنے اس وظیفہ کو انجام دیا اور حکومت (وقت) سے کنارہ کشی اختیار کر لی لیکن جس وقت اسلامی ممالک مثل مصر، عراق اور مدینہ منورہ کے ایک بڑے مجمع نے آپ کی خدمت میں حاضری دی اور آپ کی بیعت کی، اور آپ کو اپنا امام اور مقتدا تسلیم کر لیا، اس وقت حضرت علی علیہ السلام نے اپنے اوپر حجت تمام دیکھی اور عوام الناس پر حکومت کرنے کا اپنا فریضہ سمجھا کیونکہ اس عظیم مجمع کی بیعت کے پیش نظر جس کا وجود تاریخ میں بے نظیر ہے؛ حکومت سے دور رہنے کی کوئی دلیل باقی نہیں رہی، لہذا آپ حکومت قبول کرنے پر مجبور ہو گئے؛ حالانکہ آپ کو حکومت سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی، اور صرف عوام الناس کی بیعت کے ذریعہ الہی وظیفہ کا احساس کرتے ہوئے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھالی، جیسا کہ آپ صحیح البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

”أَمَّا وَ الَّذِي فَلَقَ الْحَبَّةَ وَ بَرَأَ النَّسَمَةَ لَوْلَا حُضُورُ الْحَاضِرِ وَ قِيَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُودِ النَّاصِرِ، وَمَا أَخَذَ اللَّهُ عَلَى الْعُلَمَاءِ أَنْ لَا يُقَارُوا عَلَى كَظْمَةِ ظَالِمٍ وَلَا سَعْبِ مَظْلُومٍ لِأَلْقَيْتُ حَبْلَهَا عَلَى غَارِهَا وَلَسَقَيْتُ آخِرَهَا بِكَأْسِ أَوْلَهَا وَلَا لَفَيْتُمْ دُنْيَاكُمْ هَذِهِ آزَهْدَ عِنْدِي مِنْ عَقْطَةِ عَنَزٍ“ (۸)

دیکھو! اس ذات کی قسم جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور ذی روح چیزیں پیدا کیں، اگر بیعت کرنے والوں کی موجودگی اور مدد کرنے والوں کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہو گئی ہوتی، اور خداوند عالم نے علماء سے یہ عہد و پیمانہ نہ لیتا کہ وہ ظالم کی شکم پری اور مظلوم کی گرسنگی پر سکون و قرار سے نہ بیٹھیں تو میں خلافت کی باگ ڈور اسی کے کندھے پر ڈال دیتا اور اس کے آخر کو پہلے والے کے کاسہ سے سیراب کرتا اور میری نظر میں تمہاری دنیا کی قیمت بکری کی ناک سے بھتے پانی کی طرح ہے۔

لیکن ابھی حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کو صرف چند ہی دن گزرے تھے کہ دنیا پرست اور تبعیض اور بے عدالتی چاہنے والوں نیز اپنے کو دوسروں سے بہتر جاننے والے حضرت علی علیہ السلام کی عدالت کو برداشت نہ کر سکے اسی طرح وہ لوگ جو حضرت علی علیہ السلام کی حکومت میں اپنی شیطانی تمناؤں اور غاصب اور غیر قانونی حکومت کو خطرہ میں دیکھ رہے تھے، اسی طرح وہ سادہ لوح مسلمان جو صحیح اسلامی نظریہ کو سمجھنے سے قاصر تھے نیز ان کی فکر پست اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے حضرت علی علیہ السلام کی عظیم حکمت عملی کو نہیں سمجھ رہے تھے، یہ تمام لوگ ایک کے بعد ایک فتنہ و فساد اور آشوب برپا کرنے لگے، چنانچہ جنگ جمل، جنگ صفین اور آخر کار جنگ نہروان رونما ہوئیں اس موقع پر حضرت علی علیہ السلام ایک اسلامی حاکم کے عنوان سے؛ جب آپ نے الہی اور اسلامی قوانین و احکام کو خطرہ میں دیکھا تو آپ کا کیا وظیفہ تھا؟ کیا آپ ہاتھ پر ہاتھ رکھے تماشا دیکھتے رہتے!! اور فتنہ و فساد اور آشوب کی روک تھام نہ کرتے؟! کیونکہ تشدد اور شدت پسندی محکوم اور مذموم ہے!!؟

لیکن حضرت علی علیہ السلام نے اس وقت اسلامی حکومت اور اس کے ارکان کی حفاظت کے خاطر تلوار اٹھالی اور باغی اور سرکش لوگوں کے ساتھ جنگ کی، جنگ جمل میں بھت سے صحابی رسول یہاں تک کہ طلحہ و زبیر جو مدتوں تک رسول اکرم (ص) کے ساتھ مل جھاد کرتے تھے؛ کو قتل کیا حالانکہ زبیر آپ کا پھوپھی زاد بھائی تھا اور اس کی جانفشانی اور آنحضرت (ص) کے جزم میں اپنے صلاحیت کی وجہ سے آنحضرت (ص) نے اس کے لئے دعا فرمائی ہے، لیکن حضرت علی علیہ السلام نے نہیں فرمایا؛ کہ اے زبیر! تو میرا پھوپھی زاد بھائی ہے اور دونوں دوستی کر لیں، اور میں تجھ سے نرم رویہ اختیار کروں گا اور تیری چاہتوں کو پورا کر دوں گا بلکہ آپ نے اس عقیدہ کے ساتھ کہ چونکہ میری حکومت حق ہے لہذا جو لوگ اس کے مقابلہ میں سرکشی کریں گے ان کو پسپا کر دیا جائے لہذا آپ نے پہلے ان کو وعظ اور نصیحت فرمائی لیکن جب انھوں نے نہ مانا تو پھر تلوار کا سہارا لیا اور ان کو پسپا کر دیا اور بھت سے لوگوں کو قتل کر ڈالا کیونکہ آپ کی نظر میں خدا اور مسلمانوں کا حق ذاتی مفاد سے کھیں بالاتر تھا اور اسلامی نظام کو باقی رکھنے کے لئے تشدد اور شدت پسندی کو ضروری سمجھا؛ کیونکہ اسلامی نظام کی حفاظت کے لئے تشدد اور شدت عمل کو واجب سمجھتے تھے۔

۹۔ سازش کرنے والوں اور زر خرید غلاموں کے مقابلہ میں عوام الناس کی ہوشیاری

قارئین کرام! اسلامی انقلاب سے پہلے جب اسلامی حکومت تشکیل نہیں ہوئی تھی حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تقاریر اور مکاتبات کے ذریعہ عوام الناس کی ہدایت اور راہنمائی کرتے تھے اور حکومت کو نصیحت فرمایا کرتے تھے؛ لیکن جس وقت لوگوں نے امام خمینی (رہ) کی بیعت کی اور اسلام پر اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور اسلام دشمن طاقتوں کو ملک سے باہر نکالنا چاہتے تھے اور اس ملک میں اسلامی و الہی حکومت کے خواہاں تھے، اس وقت حضرت امام خمینی (رہ) نے حکومت کی ذمہ داری قبول کی اور فرمایا:

”میں اس ولایت کی مشروعیت کی بنا پر جس کو خداوند عالم نے مجھے عطا فرمائی ہے نیز آپ حضرات کی مدد اور کمک کے ذریعہ اس حکومت کا جنازہ نکال دوں گا اور خود حکومت بناؤں گا۔“

یعنی امام خمینی (رہ) ولی فقیہ کے عنوان سے عوام الناس پر حکومت کا حق رکھتے تھے اور آپ کی ولایت الہی مشروعیت اور قانونیت رکھتی تھی، لیکن جب تک عوام الناس میدان میں نہ آئی اور آپ کی بیعت نہ کی، اس وقت تک اس ولایت نے عینی تحقق پیدا نہ کیا؛ لیکن عوام الناس کے میدان میں آنے اور انقلابی صحمنوں کم نظیر حاضر ہونے اور راہ اسلام و رہبری کی اتباع کرنے میں وفاداری اور جانفشانی کے اعلان کے بعد، وہ الہی ولایت عینی تحقق موجود ہو گئی اور اسلامی حکومت تشکیل ہو گئی۔

بے شک کہ اس اسلامی حکومت کو لاکھوں شہیدوں کا خون دینا پڑا ہے جس کی وجہ سے آج بھی باقی ہے اور بھت عظیم فداکار اور انقلاب کے فداکاروں کے ذریعہ اس ملک کی سرحد اور انقلابی اقدار کی حفاظت میں مشغول ہیں لہذا چند زر خرید غلاموں کے ذریعہ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے ہمارے عوام الناس اس چیز کی کبھی اجازت نہیں دیں گے کہ چند خود فروش مزدوروں کے ذریعہ؛ اسلامی مصلح، لوگوں کی جان و مال اور ناموس خطرہ میں پڑ جائیں جو لوگ اس مرحلہ میں (۱۸ تیر ماہ ۱۳۷۸ ہجری شمسی کے بعد سے^(۹) کچھ آشوب پھا کرنے والے مزدوروں اور دوسروں کی روٹیوں پر پلنے والے سڑکوں پر نکل کر آشوب پھا کرنے لگے اور لوگوں کے گھروں، دکانوں وغیرہ کو آگ لگائیں اور بھت زیادہ لوٹ مار کریں، لوگوں کی ناموس اور عزت کو پامال کریں، تو کیا ان تمام لوگوں کا سختی کے ساتھ مقابلہ نہ کیا جائے؟! اور کیا اسلام تشدد کی اجازت نہیں دیتا؟! یا یہ کہ ان لوگوں نے اسلام کو نہیں پہنچانا، یا پھر وہ مسلمانوں کے ساتھ خیانت کرنا چاہتے ہیں!!

ہنسی اور لوریاں دے کر تو آشوب گرمی سے روک تھام نہیں کی جاسکتی، ان کے مقابلہ میں پولیس، تشدد اور شدت عمل کے ذریعہ برتاؤ کیا جائے اور طاقت کے بل بوتے پر ان کی روک تھام ہو سکتی ہے، جس کے بعد پھر کبھی ملک میں اس طرح کے درد ناک حوادث رونما نہ ہونے پائیں کیونکہ ہمارے برادران ان لوگوں کے فریب میں نہیں آئیں گے جو کھتے ہیں کہ تشدد اور شدت

پسندی ہمیشہ اور مطلقاً ممنوع ہے، ان کی باتوں کو نہیں مانیں گے اور اگر آج تک صبر کیا اور خون جگر پیا ہے تو وہ مقام معظم رہبری حضرت آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای مدظلہ کی طاعت اور فرمانبرداری کی وجہ سے ہے، ورنہ تو جب ہمارے فداکار لوگوں کو یہ احساس ہو جائے کہ مقام معظم رہبری فلاں کام پر دل سے راضی نہیں ہیں تو پھر ان کی مرضی کے لئے اپنی جان کی بازی بھی لگا سکتے ہیں چنانچہ پوری دنیا نے دیکھا کہ جب مقام معظم رہبری نے ساکت رہنے اور آرام سے رہنے کے لئے کھا تو سبھی لوگ آپ کی اطاعت اور عمومی مصلح کی بنا پر سب پیٹھے دیکھتے رہے اور خون جگر پیتے رہے اور جب تک آپ کا اشارہ نہ ہو اسڑکوں پر نہ آئے اور مظاہرے نہ کئے، لیکن جیسے ہی انقلاب سے وفاداری کے اعلان کا وقت آپہنچا تو دشمنوں کو دکھایا کہ ہم ہمیشہ اسلام اور انقلاب سے دفاع کرنے کے لئے حاضر ہیں، پورے ملک میں وہ عظیم مظاہرے ہوئے جن پر دنیا بھر کے لوگوں اور خود دشمنوں نے تعجب کیا۔

حوالے

(۱) سورہ شعراء آیت ۴ تا ۳

(۲) سورہ توبہ آیت ۱۲

(۳) سورہ آل عمران آیت ۱۵۹

(۴) سورہ توبہ آیت ۷۳

(۵) سورہ بقرہ آیت ۱۹۵۰ تا ۱۹۱

(۶) سورہ فتح آیت ۲۹

(۷) سورہ احقاف آیت ۳۵

(۸) نصح البلاغہ خطبہ نمبر ۳

(۹) یہ تھران یونیورسٹی میں ہونے والے حادثہ کی طرف اشارہ ہے جس کی آگ وہاں سے شروع ہو کر شہر کے مختلف مقامات تک پہنچی اور جس میں امریکہ غلاموں نے قتل و غارت اور بربریت کا وہ کھیل کھیلا جس سے انسانیت لرزا ٹھی یہاں تک کہ عبادت گاہوں اور مساجد میں آگ لگادی گئی (مترجم)

سیتیسواں جلسہ

تشدد کے سلسلہ میں ایک تحقیق

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

ہم نے عرض کیا کہ اسلامی حکومت کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ معاشرہ میں اسلامی قوانین نافذ کرے اور امن و امان برقرار رکھے نیز ملک کو اندرونی اور بیرونی خطرات سے محفوظ رکھے ظاہر سی بات ہے کہ اس سلسلہ میں پولیس، طاقت اور تشدد سے کام لیا جائے گا اور جو لوگ اسلامی ملک سے دشمنی اور عناد کی بنا پر جنگ و جدال کرتے ہیں؛ ان سے پیار و محبت اور نرمی کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جاسکتا، یا وہ لوگ جو اندرون ملک شیطانی حرکتوں کے تحت فساد کرتے ہیں؛ ان سے پیار و محبت کے ذریعہ ان سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

ہم نے یہ بھی عرض کیا کہ جس طرح سے اسلامی قوانین رحمت و محبت اور مہربانی پر مبنی ہوتے ہیں اور اسلام پیغام دوستی و محبت دیتا ہے؛ اسی طرح خاص مواقع پر طاقت، سخت رویے اور خشونت (شدت پسندی) سے بھی کام لیا جاتا ہے، اور اسلام مجرموں اور فساد کرنے والوں کے ساتھ مقابلہ کرنے اور سزا دینے کا بھی حکم دیتا ہے لیکن چونکہ یہ بحث ایک فرعی تھی اور اس بحث کا شمار ہماری اصلی بحث میں نہیں ہوتا، لہذا مختصر طور پر اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی لیکن حق مطلب ادا نہیں ہو سکا لیکن اس سلسلہ میں اخباروں اور جرائد میں ہونے والے عکس العمل (ری ایکشن) سے اندازہ ہوتا ہے کہ محبت اور تشدد کے سلسلہ میں مزید تفصیلی بحث کی ضرورت ہے، لہذا اس جلسہ کے لحاظ سے اس موضوع پر بعض چیزیں بیان کرتے ہیں۔

۲۔ دشمنوں کی طرف اسلام کے خلاف پروپیگنڈا اور کارکردگی

ایک زمانہ سے اسلام کے دشمنوں نے دین اسلام کو تشدد اور شدت پسندی کا دین قرار دے رکھا ہے اور کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، کیونکہ اسلام نے دشمنوں سے جہاد اور مقابلہ کو قابل ستائش قرار دیا ہے، چنانچہ قرآنی بھت سی آیات جہاد کے بارے میں موجود ہیں، اور جہاد کو فروغ دین قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ بعض لوگ اس مسئلہ سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسلام، تشدد اور شدت پسندی کا دین ہے، اور اسلام پھیلانے کے لئے طاقت اور تلوار کا استعمال کیا گیا ہے، یعنی لوگوں نے ڈر کر اسلام کو قبول کیا ہے ان کے مقابلہ میں بعض لوگوں

نے اس نظریہ سے متاثر ہوتے ہوئے دفاعی لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ اسلام میں تشدد نہیں ہے، اسلام ہمیشہ پیار و محبت کی دعوت دیتا ہے، اور جہاد یا شدت پسندی کے مسائل ایک خاص زمانہ اور خاص مقام سے مخصوص تھے، عصر حاضر میں ان مسائل سے کوئی سروکار نہیں ہے، اور ان کو (آج کل) بیان بھی نہیں کرنا چاہئے، آج کل صرف پیار و محبت اور جھک کر باتیں کرنا چاہئے! ہماری ملت جانتی ہے کہ دشمن کن اغراض و مقاصد کے تحت اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کر رہا ہے لہذا ہماری ملت دشمن کے پروپیگنڈے سے متاثر نہیں ہوتی لیکن توجہ رہے کہ مسئلہ یہی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ اس سے آگے قدم رکھا جاتا ہے، اور جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں کہ آج اسلامی دشمن طاقتیں نئے نئے طریقوں سے اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کر رہی ہیں اور ہر روز مختلف طریقوں؛ جیسے ادبی، ہنری اور دیگر طریقوں سے اسلامی معارف میں شبہات و اعتراضات وارد کر رہی ہیں، تاکہ ہماری ثقافت میں خطرناک جرے آثار پھیلا دیں تاکہ عوام الناس دینی سلسلہ میں کمزور ہو جائیں یہ وہ چیز ہے جس کے بارے میں نفسیاتی اور ذاتی تجربات شہادت دیتے ہیں۔

ہم نے اپنی آنکھوں سے اپنے اسلامی معاشرہ اور دوسرے اسلامی ملکوں کو دیکھا ہے کہ جس وقت اسلام دشمن طاقتیں اپنے مختلف طریقوں سے مسلسل پروپیگنڈا کرتی ہیں اور کسی ایک معاشرہ کو تحت تاثیر قرار دیتی ہیں، یہاں تک کہ آنے والی نسل (جو دشمن کے مد نظر ہوتی ہے) دشمن کی تبلیغ سے متاثر ہو جاتی ہے، اور جوان طبقہ دشمن کے پروپیگنڈے کی زد میں آکر اپنی دینی اور قومی حیثیت بھول جاتا ہے اور جیسا کہ دشمن چاہتا ہے اپنی اصلی حیثیت کو بھول کر دشمن کی پیش کردہ صورت اپنا لیتا ہے۔ اگر ہم عصر حاضر کی ثقافت خصوصاً روشن خیال رکھنے والوں کے یہاں رائج ثقافت کو دیکھیں تو دشمن کے پروپیگنڈے کے آثار واضح طور پر دکھائی دیں گے، اور ان چیزوں کا بھی مشاہدہ کر لیں گے جو دشمن نے ہماری یہاں رائج کی ہیں ہماری ثقافت میں دشمن کی رائج کردہ چیزوں میں سے آزادی اور ڈیموکریسی ہیں جس کو مطلق اقدار کی صورت میں ہمارے معاشرہ میں رائج کر دیا گیا ہے، اور ان چیزوں کے بارے میں اس قدر پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ گویا ایک بت ہے کہ کوئی اس ڈیموکریسی کے خلاف بولنے کی جرأت نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے نقائص کو بیان کر سکتا ہے حالانکہ خود مغربی دانشوروں نے ڈیموکریسی کے سلسلہ بھت زیادہ اور سخت تنقید کی ہے، اور آج بھی بھت سے سیاسی فلاسفہ اور سماج ماہرین مختلف مواقع پر ڈیموکریسی کے برخلاف گفتگو کیا کرتے ہیں نیز اس سلسلہ میں کتابیں بھی لکھی جاتی رہی ہیں، اور یہی نہیں بلکہ ان میں سے بعض (بہترین) کتابوں کا دنیا کی مختلف مشہور زبانوں میں ترجمہ ہوتا ہے منجملہ فارسی (و اردو)، ان کو عوام الناس پڑھتے ہیں؛ لیکن اس زمانہ میں دشمنوں کی طرف سے ڈیموکریسی کے اس طرح مقدس جلوہ دکھائے جاتے ہیں کہ جہاں سوم میں کوئی اس کے خلاف بولنے کی جرأت نہیں کرتا اور اس سلسلہ میں تنقید نہیں کر سکتا، اگر کوئی مغربی ممالک میں رائج ڈیموکریسی اور آزادی کے بارے میں زبان کھولے تو اس کو بیک ورڈ اور ظلم و استبداد جیسی تھمتوں سے نوازا جاتا ہے۔

۳۔ مغربی ممالک میں حقوق بشر کا جھوٹا دعویٰ

بے شک مغربی باشندے اپنے پروپیگنڈوں کے پیچھے ایک خاص مقصد چھپاتے ہوئے ہیں، اور اپنے منافع کے خاطر نیز انقلابی ممالک کو اپنے تحت لانے کے لئے ہمیشہ ڈیموکریسی، آزادی اور حقوق بشر کا دم بھرتے ہیں، اور اگر کوئی ان کی مخالفت کرتا ہے تو اس پر ڈیموکریسی کی مخالفت اور حقوق بشر کی پامالی کسی تہمت لگاتے ہیں حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ظالم ترین اور ڈکٹیٹر "Dictator" حکومتوں کے ظلم و ستم کے مقابلہ میں کوئی عکس العمل (ری ایکشن) نہیں دکھایا جاتا، کیونکہ اس حکومت کے ذریعہ ان کے مقاصد پورے ہوتے ہیں بلکہ خود وہ حکومتیں انہیں کی پٹھو ہوتی ہیں۔

قارئین کرام! ان کے جھوٹے دعوں کا پھول تو اس وقت کھلتا ہے جب کسی ملک میں ڈیموکریسی اصول و ضوابط کے تحت انتخابات ہوتے ہیں لیکن اسلام پسند پارٹی اکثریت میں آجاتی ہے اور وہ پارٹی کامیاب ہو جاتی ہے تو اس وقت ان انتخابات کو باطل قرار دیا جاتا ہے؛ اور فوجی بغاوت کے ذریعہ فوجی حکومت قائم کر دی جاتی ہے اور ہر روز ہزاروں بے گناہ لوگوں کا خون بھایا جاتا ہے، اور آزادی خواہ مسلمانوں کو سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جاتا ہے اور حقوق بشر کے یہ جھوٹے نعروں لگانے والے نہ صرف یہ کہ اس حکومت کو حقوق بشر پامال کرنے اور آزادی کی رعایت نہ کرنے کا الزام نہیں لگاتے بلکہ جلد ہی اس حکومت کو تسلیم بھی کر لیتے ہیں اور ان کے کارناموں کی تائید کرتے ہیں اور بھت ہی وسیع پیمانے پر ان کی حمایت کرتے ہیں۔

یا جس وقت صھیونیزم "سرزمین فلسطین" پر قبضہ کرتے ہیں اور لوگوں کو اپنے گھروں سے باہر نکال دیتے ہیں اور ہزاروں بے گناہ لوگوں کا خون بھاتے ہیں اور لاکھوں لوگوں کو اپنے ملک سے باہر نکال دیتے ہیں، اس وقت کوئی نہیں کہتا کہ ان کا یہ کام حقوق بشر کے خلاف ہے بلکہ طاقتور ممالک اور سوپر پاور ممالک اس غاصب اور قابض حکومت کو تسلیم کر لیتے ہیں، جبکہ یہ ظالم اور غاصب حکومت اس سرزمین کے اصلی مالکوں کا قتل عام کرتی ہے اور ان کے گھروں کو مسمار کر رہی ہے، لیکن ان سب کو دیکھ حقوق بشر کا نعرہ لگانے والے کوئی اعتراض نہیں کرتے صرف کبھی کبھار اقوام متحدہ اپنی سیاست کے تحت کوئی بے معنی اور غیر موثر حکم صادر کرتی ہے اور عملی طور پر اس غاصب و ظالم حکومت کو گرین لائٹ دکھاتی ہے کہ اگر اس حکم نامہ پر عمل نہ بھی کیا تو کوئی بات نہیں کوئی مشکل پیش آنے والی نہیں ہے اور کسی طرح کا کوئی ایکشن نہیں لیا جائے گا۔

جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دسیوں حکم نامہ اسرائیل غاصب کے خلاف دئے جا چکے ہیں لیکن اس نے کسی پر بھی عمل نہیں کیا ہے اور ہمیشہ ان کی مخالفت کرتا رہا ہے، لیکن نہ یہ کہ کبھی اس کو سزا دی گئی بلکہ انعام کے طور پر اس کو کروڑوں ڈالر کی (بلا عوض) امداد کی جاتی ہے اور بڑے بڑے اسلحے، مہلک ہتھیار (آئیٹیم بم) بنانے کی ٹکنالوجی دی جاتی ہے تو کیا کوئی حکومت اور حقوق بشر کا دفاع کرنے والوں نے اس غاصب اسرائیل کے بارے میں جو انسانوں کے روزمرہ کے حقوق بھی پامال کر رہا ہے اور اقوام متحدہ

کے حکم ناموں کو بھی نہیں مانتا اور ہمیشہ ان کی مخالفت کرتا ہے، کیا اس کو کبھی کسی نے ڈیموکریسی اور حقوق بشر کا مخالف قرار دیا؟!!!

۳۔ اسلامی نظام پر تشدد طلب ہونے کا الزام اور اس کے خلاف سازشیں

ہمارے ملک میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد (اسلام دشمن طاقتوں نے) تشدد کے سلسلہ میں بھت زیادہ پروپیگنڈا کیا ہے، سب سے پہلے یہ کھا کہ شاہ پہلوی کی قانونی حکومت کے سامنے قیام کرنا تشدد ہے اور انقلاب کی کامیابی کے بعد، جب منافقین گروہوں نے عوام الناس کو اپنے غیر اسلامی اہداف سے ہم اہنگ نہ پایا تو انھوں نے انقلاب اور عوام الناس سے مقابلہ شروع کر دیا اور دینی اور سیاسی مہم شخصیتوں کو قتل کرنے لگے یہاں تک کہ بے گناہ لوگوں پر بھی رحم نہ کیا، جس کے بعد عوام الناس نے بھی ان سے مقابلہ شروع کر دیا اور ان کو ملک سے بھگا دیا؛ اس روز سے آج سے مغربی ممالک ہمارے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ منافقین سے ایسا برتاؤ کرنا تشدد ہے! کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ ان منافقین کے گروہوں نے کس قدر ہمارے ملک کو نقصانات پہنچائے ہیں کوئی مہم شخصیتوں کے قتل کی مذمت نہیں کرتا ہے، لیکن جس وقت ایک ملت اپنے دین اور ملک سے دفاع کرنے کے لئے قیام کرتی ہے اور ٹرورسٹوں "Terroristes" کو پسپا کرتی ہے اور ان میں سے بعض لوگوں کو سزائے اعمال تک پہنچاتی ہے اور بعض کو ملک بدر کرتی ہے تو اس وقت شور و غل مچاتے ہیں کہ یہ سب کچھ حقوق بشر کے خلاف ہے!!

اسی طرح جب ۱۸ تیر ماہ ۱۳۷۸ شمسی کے بعد بعض فتنہ و فساد برپا کرنے والے بیت المال، عوامی مال دولت، بینک، ذاتی اور سرکاری گاڑیوں یہاں تک کہ مسجدوں میں بھی آگ لگا دیتے ہیں اور عورتوں کو بے آبرو کرتے ہیں عورتوں کے سروں سے چادر چھین لیتے ہیں؛ اس وقت کوئی نہیں کہتا کہ یہ کام حقوق بشر کے خلاف ہے، بلکہ ان لوگوں کو اصلاح طلب اور ڈیموکریسی و آزادی کا طرف دار کھا جاتا ہے! لیکن اگر اسلامی جمہوری ایران اور فداکار بسیجی (عوامی رضا کار فوج) بے خوف و خطر ان سے مقابلہ کرتی ہے اور دین و شرف اور اپنے محبوب نظام سے دفاع کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور فتنہ و فساد پھیلانے والوں کا قلع و قمع کرتی ہے تو اس موقع پر یہ سوگ فلک شگاف نصرے لگاتے ہیں کہ ایران میں آزادی نہیں ہے، اور ایرانی نظام حکومت ڈکٹیٹر

شب "Dictatorship" ہے!!

مغربی ممالک اپنے دعویٰ کے باطل ہونے کو جانتے ہیں لہذا انقلاب اسلامی کی کامیابی کے بعد سے اسلامی نظام کو درہم و برہم کرنے کے لئے اس طرح کے پروپیگنڈے کیا کرتے ہیں اگرچہ ہم ان کے نحس مقاصد اور ارادوں سے بے خبر نہیں ہیں، لیکن وہ اپنے تجربات کی بنا پر اچھی طرح جانتے ہیں کہ کس طرح ایک نظام کو سرنگوں کیا جاتا ہے چاہے پچاس سال کے بعد ہی کیوں نہ ہو،

(اگرچہ ان کا یہ خیال باطل اور بے ہودہ ہے) لہذا وہ ابھی سے اس سلسلہ میں مختلف طریقوں سے بھت زیادہ کارکردگی کر رہے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ انقلاب کی ایک دو نسل گزرنے کے بعد جنھوں نے انقلاب کو نہیں سمجھا ہے اور انقلاب سے پہلے مفاسد اور شاہ پہلوی کے ظلم و جور کو نہیں دیکھا ہے اور اسلامی نتائج سے آگاہی نہیں رکھتے نیز حضرت امام خمینی (رہ) اور ان کے ساتھیوں کے تربیت یافتہ نہیں ہے، یہ سبب ان کے پروپیگنڈوں سے متاثر ہو جائیں گے؛ تاکہ اسلامی حکومت کو سرنگون کر کے اپنی مرضی کی حکومت تشکیل دیں جس کو آج کی اصطلاح میں ڈیموکریٹک "Democratic" کہا جاتا ہے۔

۵۔ لوگوں میں انتخابات سے بائیکاٹ کا راستہ ہموار کرنا

یہ لوگ اپنے نفس مقاصد تک پہنچنے کے لئے حساب شدہ منصوبہ بندی کرتے ہیں اور ثقافتی بنیادی فعالیت انجام دیتے ہیں اور موثر و کارگر وسائل کو بروئے کار لاتے ہیں انقلاب کی کامیابی کے بعد سے (خصوصاً آخری چند سالوں سے) جن الفاظ سے استفادہ کرتے ہیں، ان میں سے تساہل (سستی) تسامح (لا پرواہی) اور مدارا (نال میل) ہیں جن کو مطلق اقدار کے عنوان سے پیش کرتے ہیں، اور اس کے مقابلہ میں قاطعیت اور تشدد کی مطلق طور پر مذمت کرتے ہیں۔

اس نظریہ کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ جو چیز نظام اسلامی کے بقاء کی ضامن ہے وہ ہے عوام الناس خصوصاً جوانوں اور بچیوں کا اسلام اور رہبری سے لگاؤ اور محبت ہے؛ یہاں تک کہ ان اقدار کی حفاظت (جو کہ لاکھوں شہیدوں کے خون کی برکت سے حاصل ہوا ہے)؛ کے لئے اپنی جان سے کھیلنے کے لئے حاضر ہیں یہ لوگ علم و ادب اور ثقافتی پروپیگنڈوں سے عوام الناس کی شجاعت، ایثار، بھادری، معنوی طاقت اور دینی غیرت کو چھین لینا چاہتے ہیں اسی وجہ سے منفی، غیر انسانی اور ظالمانہ تشدد جو دنیا بھر میں ہوتی رہتی ہے، اور جس کے تباہ کن نتائج ہر روز دیکھنے میں آتے رہتے ہیں؛ اس کو ہمارے سامنے بیان کرتے ہیں تاکہ یہ سمجھائیں کہ تشدد کے یہ برے نتائج ہوتے ہیں؛ لہذا کسی بھی طرح کی کوئی تشدد صحیح نہیں ہے بلکہ مذموم ہے یہاں تک کہ اگر کوئی غیظ و غضب میں کچھ کھے، یا "امریکہ مردہ باد" کے نعرہ لگائے یا فساد پھیلانے والوں سے مقابلہ کرے اور ان کو کچل دے، تو ان کا یہ کام تشدد، شدت پسندی اور محکوم و مذموم ہے۔

ان لوگوں مقصد یہ ہے کہ اس طرح انقلابی اقدار کا دفاع کرنے والوں کو شدت پسندی کا نام دے کر عوام الناس کو سست کر دیں تاکہ کوئی ان کی خطرناک سازشوں سے مقابلہ کے لئے کھڑا نہ ہو، اور اپنے خیال ناقص میں ۲۸ مرداد ۱۳۳۲ ہجری شمسی کی بغاوت کی طرح ایک دوسری بغاوت کرا دیں اور جیسا کہ ان لوگوں کا کام ہے ۲۸ مرداد میں مٹھی بھرید معاش، لپٹے لفنگے لوگوں کے ذریعہ بغاوت کرا دی اور انھوں نے لوگوں کی جان و مال اور ناموس پر حملہ کیا اور دشمن کے نقشہ کو عملی جامہ پہنایا؛ اسی طرح ۱۸ تیر ماہ ۱۳۴۸ء شمسی کو بھی اپنے ناپاک منصوبہ کے لئے مناسب پایا اور ملک میں بغاوت پھیلادی چنانچہ ان لوگوں نے اس سلسلہ

میں بھت زیادہ مطالعہ اور تحقیق، بھت زیادہ خرچ کر کے سادہ لوح افراد کو فریب دینے کے لئے اس کام کے مقدمات پہلے سے تیار کر رکھے تھے جیسا کہ اس حادثہ میں ملوث افراد نے خود اپنے انٹرویو میں اس بات کا اقرار کیا کہ انھوں نے امریکہ سے پیسہ اور فکری امداد حاصل کی تھی، یہ سب اسی حقیقت کی عکاسی ہے تاکہ جب موقع پائیں تو بد معاش اور لچے لفنگے لوگوں کو میدان میں اتار دیں تاکہ یہ لوگ اندرونی اور بیرونی میڈیا کی امداد اور مختلف طریقوں سے ملک کے ذریعہ بدامنی پھیلائیں اور دکانوں، گھروں اور دفاتروں کو آگ لگائیں خلاصہ بغاوت کے نقشہ کو عملی جامہ پہنادیں۔

جی ہاں، یہ لوگ شدت پسندی کو برا اور مذموم کھ کھ کر عوام الناس میں مقابلہ کے حوصلوں کمزور کرنا چاہتے تھے نیز انقلاب سے دفاع کے سلسلہ میں ان کے حوصلے پست کرنا مقصود ہے، تاکہ جب ضد انسانی اور ضد انقلابی کارناموں کا نظارہ کریں اور عوام الناس کے مال و دولت کو غارت ہوتے دیکھیں نیز سرکاری ملکیت کو نابود ہوتا ملاحظہ کریں اور خود فروش لوگوں کے ذریعہ بلوا ہوتے دیکھیں تو سب کے سب خاموش بیٹھے تماشا دیکھتے رہیں اور فتنہ و فساد پھیلانے والوں کو کچلنے کی فکر نہ کریں بلکہ صرف تباہی پھیلانے والوں سے آرام کے ساتھ گفتگو کرنے کی دعوت دیں اور ان کے مطالبات کو سنیں اور ان سے کھیں کہ ہاں تمہیں اعتراض کرنے کا حق ہے، تم واقعا پریشان ہو، لہذا تم اپنی طرف سے کسی کو نمائندہ بنا کر بھیجو تاکہ آپس میں بیٹھ کر آرام کے ساتھ گفتگو کریں، تمہارے مطالبات کو پورا کیا جائے گا، آؤ اور آپس میں سمجھوتہ کر لیں کچھ تم لوگ اپنے مطالبات کم کرو اور کچھ ہم اپنی سیاست سے پیچھے ہٹیں۔

جب کہ یہ بات ظاہر ہے کہ ان کے مطالبات قوانین اسلامی کو ختم کرنے، اسلامی شعائر کو حذف کرنے، اور اسلام کا دفاع نہ کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہوں گے، اور ان سب مطالبات کو مان لینے کے بعد ملکی پیمانہ پر ایک بھت بڑی بغاوت رونما ہو جائے گا جس کے نتیجہ میں اسلامی اقدار کا خاتمہ ہو جائے گا، اور اگر دوسرے ممالک کی امداد کی ضرورت ہوگی (جیسا کہ پہلے سے طے ہو چکا تھا) مشرقی اور مغربی سرحد پار سے ملک پر حملہ کر کے اس نظام کا خاتمہ کر دیا جائے گا اور پھر اپنی مرضی کے مطابق کسی کو حاکم بنا دیا جائے گا۔

۶۔ اسلامی مقدسات کی توہین کرنے والوں اور ثقافتی سازشوں سے مقابلہ کی ضرورت

المختصر: ان آخری چند سال سے تشدد اور شدت پسندی کے مسئلہ کو مطلق طور پر اقدار کے مخالف قرار دیتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں سستی، لاپرواہی اور تال میل کو مطلق اقدار کے عنوان سے بیان کرتے ہیں، اور مختلف میڈیا کے ذریعہ یہ پروپیگنڈے اس قدر وسیع پیمانے پر حساب شدہ ہوتے ہیں کہ بعض اوقات تو بعض خواص (خاص الخاص افراد) بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں، اور دشمن کے جال میں پھنس جاتے ہیں جب کہ ان لوگوں کا ہدف مسلمانوں سے دینی غیرت کو چھین لینے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے،

تاکہ ضرورت کے وقت اسلام کے دفاع کے لئے کھڑے نہ ہونے پائیں اس بات پر گواہ ابھی کے تازہ ہونے والے واقعات ہیں اور بھت سی سازشیں تو ابھی تک فاش نہیں ہوئی ہیں اور (انشاء اللہ) اہستہ اہستہ معلوم ہو جائیں گی۔

اسی وجہ سے حقیر نے اپنی تشخیص کے مطابق یہ احساس کیا کہ نظام اسلامی کو درہم و برہم کرنے کے لئے ایک بھت بڑی سازش ثقافتی خطرہ درپیش ہے، لہذا یہ طے کیا کہ دشمنوں کی طرف سے ہوئے اعتراضات اور شبہات کا جواب دے اور ان کی ثقافتی سازشوں کو فاش کیا جائے، اور اپنے برادران کو ہوشیار کمروں نیز جو لوگ دشمن کے پروپیگنڈوں کی زد میں آکر خواب غفلت میں سوتے ہوئے ہیں ان کو بیدار کمروں، اور کم سے کم دشمن کی طرف سے ہوئے پروپیگنڈوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے جھوٹے عقائد اور نظریات میں شک و تردید پیدا کریں، اور دینی اور ثقافتی عہدہ داروں کو درپیش عظیم خطرات سے آگاہ کمروں اور اپنے سوالات کو پیش کر کے معاشرہ کو متوجہ کروں تاکہ دشمن کے غلط پروپیگنڈوں کا اثر کم سے کم ہو۔

حقیر نے اپنا وظیفہ سمجھتے ہوئے یہ طے کیا کہ ”مطلق تشدد کے نفی“ کے بت کو توڑ ڈالوں، اور ہر تشدد کو برا نیز ہر نرمی اور پیار محبت کو اچھا کہنے والے تصور کی نفی کروں اسی وجہ سے ہم نے اس سے پہلے بھی جلسہ میں عرض کیا تھا کہ ہر مطلق تشدد اور شدت پسندی محکوم اور مذموم نہیں ہے اور ہر نرمی اور پیار و محبت اچھا نہیں ہے، بلکہ ہر ایک کے لئے مخصوص موقع و محل ہوتا ہے جیسا کہ یہی گفتگو آزادی کے سلسلہ میں بھی کی اور عرض کیا کہ مطلق آزادی اچھی نہیں ہے بلکہ مطلق آزادی باطل اور مردود ہے، ہم اس آزادی کی قدر کرتے ہیں جو قوانین اسلامی اور دینی اقدار کے تحت ہو حالانکہ ہماری یہ باتیں سن کر بعض لوگ غضب ناک ہو گئے کہ فلاں صاحب آزادی کے خلاف گفتگو کر رہے ہیں لیکن جب ان کو آزادی کے نعرے لگانے والوں کی سازشوں کا پتہ چل گیا تو ان پر یہ بات واضح ہو گئی کہ بعض لوگ اس آزادی کا پرچم بلند کر کے دین اور اسلامی اقدار اور مقدسات کی نابودی چاہتے ہیں؛ یہاں تک ہماری حکومت کے ایک بڑے عہدہ دار جو کہ ایک سیاسی شخصیت مانی جاتی ہے اپنی ایک تقریر میں کہتے ہیں:

”ہماری عوام الناس آزاد ہے یہاں تک خدا کے خلاف بھی مظاہرہ کر سکتے ہیں“ !!

چنانچہ (بعض) دوستوں نے واضح طور پر کہا کہ وہ آزادی مطلوب اور مقصود ہے جو اسلامی قوانین اور دینی اقدار کے تحت ہو اور اگر اس طرح کی باتیں بیان نہ کی جاتی تو معاشرہ کو وہ جھٹکا نہ لگتا اور شاید حکومتی عہدار ان بھی یہ احساس نہ کرتے کہ ہم ”اسلامی قوانین اور دینی اقدار کے تحت آزادی“ کی طرف داری کریں نہ کہ مطلق آزادی کی۔

اور آج اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ تشدد مطلقاً مذموم نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگ مطلق تشدد کے نفی کے پرچم کے نیچے اسلام اور اسلامی اقدار کے دفاع میں ہر اٹھنے والے قدم کو تشدد کا نام دے تے ہوئے اس کی مذمت کرتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے نہ صرف یہ کہ ہمارے ذہن کی ایک پیداوار، تاکہ بعض لوگ یہ کھیں کہ فلاں کی باتیں تو خیال خام اور ہوائی گولیاں ہوتی ہیں اتفاق سے ہمارے پاس اس بات پر بھت سے شواہد بھی ہیں، اگرچہ سب کو بیان کرنے کی فرصت نہیں ہے، صرف ان میں سے

بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں: ایک موقع پر بعض لوگوں نے جہاد کے سلسلہ میں اعتراض کیا اور اس کو تشدد اور شدت پسندی کا نام دیدیا، جن میں سے ایک صاحب نے تھران یونیورسٹی میں محرم کے پہلے عشرہ میں اپنے تقریر کے دوران کہا: حضرت امام حسین علیہ السلام کا میدان کربلا میں قتل ہونا؛ جنگ بدر میں رسول اکرم (ص) کی تشدد کا ایک عکس العمل تھا!

یعنی یہ شخص حضرت رسول اکرم (ص) کی اسلامی جنگوں اور غزوات کو بھی محکوم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جب پیغمبر اکرم (ص) نے مشرکین کو قتل کیا تو ان کی آل و اولاد پیغمبر کی آل و اولاد کو قتل کرتی، اور اگر پیغمبر ان کو قتل نہ کرتے تو ان کی اولاد بھی قتل نہ کی جاتی!! درحقیقت وہ یزیدوں کو بری الذمہ اور اسلام و پیامبر اسلام (ص) کو محکوم کرتا ہے اور افسوس کا مقام یہ ہے کہ ان باتوں کو سن کر جو کہ پیغمبر اکرم (ص) کی توہین ہے اور امام حسین علیہ السلام کی شخصیت نیز واقعہ کربلا میں تحریف ہے اور ضروریات دین کا انکار ہے، نہ صرف یہ کہ کوئی کچھ نہیں کہتا بلکہ بعض اخباروں اور جرائد میں اس شخص کی پوری تقریر چھپتی ہے اور وہ بھی صفحہ اول پر!! افسوس کہ ہمارے حکومتی عہدہ داران اس سلسلہ میں کوئی حساسیت نہیں دکھاتے حضرت امام حسین علیہ السلام کے نام پر انقلاب برپا ہونے والے اور امام حسین (ع) کے نام سے باقی رہنے والے اسی ملک میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے قیام کو تحریف کر کے پیش کیا جاتا ہے اور یہ نتیجہ لیا جاتا ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس طرح کے واقعات دوبارہ پیش نہ آئیں اور ہمارے زمانہ کے حسین قتل نہ ہوں تو ہمیں بھی تشدد آمیز برتاؤ اور شدت پسندی کو ترک کرنا ہوگا!!

اور اب ہم اس مقالہ نگار سے مخاطب ہے جس کا مقالہ ایک کثیر الانشار اخبار میں چھپ چکا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ فلاں صاحب موضوع سے الگ اور ہوا میں باتیں کرتے ہیں اور ہم سے خطاب کیا ہے کہ اپنی گفتگو پر تجدید نظر کریں کیا ہم ہوا میں باتیں کرتے ہیں یا عصر حاضر کے اپنے معاشرہ و سماج کی؟ کیا ہماری باتیں اسی موضوع سے متعلق نہیں ہیں جو ہمارے ملک میں رائج ہے، اور کیا ہماری باتیں اسی حقیقت سے متعلق نہیں ہے جو ہر روز ہمارے ملک میں رونما ہوتی جا رہی ہے؟ آیا ہم اپنی باتوں میں تجدید نظر کریں یا آپ کہ ایک وقت آپ ”بین الاقوامی اسلامی“ پارٹی کے عضو تھے اور فدائیان اسلام کی حمایت کو ایک افتخار سمجھتے تھے؟

قارئین کرام! یہاں پر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ حضرت امام خمینی علیہ الرحمۃ کا نورانی اور مشکل کشا کلام کی طرف اشارہ کریں جس میں موصوف نے آزادی کے پرچم کے نیچے پوشیدہ کن کن ثقافتی خطرات کو بیان کیا ہے:

”اب میری وصیت ہے حال حاضر اور آئندہ کمی مجلس شورای اسلامی (پارلیمنٹ) اور اس وقت کے رئیس جمہور (صدر مملکت) اور ان کے بعد والے صدر، شورای نگہبان، شورای قضائی اور ہر زمانہ کی حکومت؛ سب کو چاہئے کہ میڈیا، جرائد اور مجلات کو اسلام اور ملکی مصالح سے منحرف نہ ہونے دیں، اور سب کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ مغربی ممالک کی طرح کی آزادی جو انوں، لڑکوں اور لڑکیوں کو تباہ و برباد کر دے گی اسلام، ملکی مصالح اور عمومی عفت کے برخلاف تبلیغات، مقالات، تقاریر، کتابیں اور

جرائد کا وجود حرام ہے ہم سب پر اور تمام مسلمانوں پر ان کی روک تھام کرنا واجب ہے اور فساد برپا کرنے والی آزادی کی روک تھام کرنا ضروری ہے، اور جو چیزیں شرعی طور پر حرام ہیں یا وہ چیزیں جو ملت و اسلامی ملک کے برخلاف ہیں، یا جمہوری اسلامی کی حیثیت کے مخالف ہے، لہذا اگر ان کے خلاف سخت کارروائی نہ کی جائے تو تمام کے تمام لوگ ذمہ دار ہیں اور ہمارے عوام الناس اور حزب اللہی جوان اگر ان چیزوں کو دیکھیں تو متعلق اداروں کو مطلع کر دیں، اور اگر وہ اس سلسلہ میں کوتاہی کریں تو وہ خود روک تھام کی ذمہ داری پر عمل کریں۔“^(۱)

۱۔ خداوند عالم کی رحمت اور غضب کے بارے میں اسلامی تصویر کشی

اسلام اور قرآن کے سلسلہ میں مغربی افراد کے شبہات اور اعتراض میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کا خدا جیسا کہ قرآن میں بیان ہوا ہے، بد خلق، غصہ والا، اہل غضب اور انتقام لینے والا ہے، جبکہ خدائے انجیل بخشنے والا، مہربان، سہ صدر (کشادہ دل) والا، تحمل کرنے والا اور بھت زیادہ مہربان اور لوگوں سے اس قدر دلسوزی کرنے والا ہے کہ نغوذ باسہ اس نے اپنے بیٹے (عیسیٰ) کو قربانی کے لئے بھیج دیا تاکہ تمام لوگوں کی بخشش ہو سکے اور اس کا خون تمام لوگوں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے!! تو کیا قرآن مجید میں بیان شدہ خدا غصہ ور اور بد خلق ہے یا رحیم اور رؤف ہے؟

قارئین کرام! گذشتہ اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ہمارا خدا صفت رحمت بھی رکھتا ہے اور صفت غضب بھی، وہ ”ارحم الراحمین“ (بھت زیادہ رحم کرنے والا) بھی ہے اور ”اشد المعاقبین“ (سخت عذاب دینے والا) بھی، قرآن مجید کے ۱۱۳ سوروں میں سے ۱۱۳ سورے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ سے شروع ہوتے ہیں جس میں خداوند عالم کی دو صفات یعنی ”رحمن“ اور ”رحیم“ کا ذکر ہوتا ہے اور صرف ایک سورہ کی شروعات ”بسم اللہ“ سے نہیں ہوتی ہے، جبکہ سورہ نمل میں شروع کے علاوہ خود سورہ کے اندر بھی ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ تکرار ہوتی ہے؛ جب ملکہ سبا (بلقیس) حضرت سلیمان علیہ السلام کے خط کو اپنی قوم کے سامنے پڑھتی ہے تو اس کا آغاز ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ سے ہوتا ہے، بھر حال پورے قرآن مجید میں ۱۱۳ بار ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ کی تکرار ہوتی ہے جس میں خداوند عالم کی دو رحمتی صفات کا ذکر ہے لیکن قرآن مجید میں خداوند عالم کی اسی رحمت و اسعہ کے ذکر کے ساتھ ساتھ خدا کے خشم (غصہ) اور غضب بھی ذکر ہوا ہے؛ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ﴾^(۲)

”اور خدا سخت انتقام لینے والا ہے“

﴿اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِیْنَ مُنْتَقِمُوْنَ﴾^(۳)

”ہم یقیناً مجرمین سے انتقام لینے والے ہیں“

﴿فَبَاءُوا بِغَضَبٍ عَلَىٰ غَضَبٍ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ﴾ (۴)

”اب یہ غضب بالائے غضب کے حقدار ہیں اور ان کے لئے رسوا کن عذاب بھی ہے“

اگر یورپی لوگ (اپنے الفاظ میں) اپنے خدا کو صرف مہربان اور رحیم بتاتے ہیں اور کھتے ہیں کہ ہمارا خدا غصہ و غضب والا نہیں ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح قرآن نے خدا کی توصیف کی ہے، ان لوگوں نے اس کو صحیح طریقہ سے بیان نہیں کیا ہے؛ کیونکہ جس خدا پر ہم اعتقاد رکھتے ہیں وہ صرف اہل غضب ہی نہیں ہے بلکہ صاحب رحمت اور مہربان بھی ہے اور صاحب قہر و غضب بھی، لیکن اس کی رحمت اس کے غضب پر چھائی ہوئی ہے، اسی وجہ سے ارشاد ہوتا ہے:

”كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ“ (۵)

”اس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم قرار دے لیا ہے“

اور یہ معنی سنی شیعہ متواتر روایات میں بیان ہوئے ہیں، جیسا کہ ہماری دعاؤں میں وارد ہوا ہے یا مَنْ سَبَقَتْ رَحْمَتُهُ غَضَبَهُ اے وہ جس کی رحمت اس کے غضب پر مقدم ہے۔

یعنی خدا کی رحمت اس کے غضب کی نفی نہیں کرتی بلکہ اس کی رحمت اس کے غضب پر مقدم ہے اور جہاں تک اس کا لطف و کرم اور اس کی حکمت تقاضا کرے وہاں تک بندوں پر اپنے لطف و کرم اور رحمت کی بارش کرتا ہے اور اپنے غضب کا مظاہرہ نہیں کرتا؛ مگر یہ کہ اس کی ضرورت ہو اور خداوند عالم کچھ لوگوں کو قہر و غضب میں گرفتار کرے اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں خداوند عالم نے بعض گذشتہ اقوام جیسے قوم نوح، قوم عاد اور قوم ثمود پر اپنا غضب نازل کیا ہے اور اپنا عذاب بھیج کر ان کو نیست و نابود کر دیا ہے (جیسا کہ ان اقوام کے مفصل واقعات قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں) لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی قوم میں بھیجے گئے انبیاء (ع) ہمیشہ ان کو راہ ہدایت کی دعوت دیتے تھے اور راہ ہدایت کو واضح اور روشن کرنے کے لئے معجزات اور الہی نشانیاں دکھاتے رہتے تھے؛ لیکن ان لوگوں نے ان تمام چیزوں کے باوجود بھی کفر و ضلالت کا راستہ اختیار کیا اور ان کی رفتار و گفتار میں ذرا بھی تبدیلی واقع نہ ہوئی، اور یہی نہیں بلکہ پہلے سے زیادہ فتنہ و فساد، گناہ عصیان اور احکام الہی کی مخالفت میں جبری ہوتے چلے گئے تو اس موقع پر خداوند عالم کی حکمت اور اس کی مشیت کا تقاضا تھا کہ ان کو اپنے غیظ و غضب اور عذاب میں گرفتار کرے تاکہ فتنہ و فساد پھیلانے والوں، لجاجت کرنے والوں، خدا سے دشمنی کرنے والوں، اور متکبرین کے لئے بہترین عبرت حاصل ہو جائے۔

لہذا معلوم یہ ہوا کہ قرآن کریم میں ذکر شدہ خدا غیظ و غضب والا نہیں ہے بلکہ خدائے رحمت و لطف و کرم ہے، اور صرف بعض مقامات پر جب اس کی حکمت اور مشیت کا تقاضا ہوتا ہے، اپنے غیظ و غضب کا اظہار کرتا ہے۔

لہذا اس سوال (کہ کیا اسلام میں رحمت و مہربانی پائی جاتی ہے یا غیظ و غضب اور شدت پسندی؟) کے جواب میں ہم عرض کرتے ہیں: اسلام میں رحمت اصل چیز ہے اور اس کی بنا یہی ہے کہ معاشرہ میں رحمت و محبت کا رواج ہو، لیکن خاص موارد میں (جیسا کہ قرآن مجید نے بھی اشارہ کیا ہے) پیار محبت اور مہربانی سے کام نہیں لینا چاہئے بلکہ وہاں پر غیظ و غضب، تشدد اور شدت پسندی کا مظاہرہ ہونا چاہئے خداوند عالم صفت رحمت بھی رکھتا ہے، اور صفت غیظ و غضب اور انتقام بھی۔

۸۔ ہدایت کے موانع کو برطرف کرنے، دشمنوں اور منافقین سے مقابلہ کی ضرورت

اسلام، اس کی نشر و اشاعت اور اس کے دفاع سے متعلق عرض کرتے ہیں کہ اسلام پہلے مرحلہ میں انسانوں کو ہدایت کی دعوت دیتا ہے، لیکن اگر کوئی دعوت انبیاء (ع) کی نشر و اشاعت میں رخنہ ڈالنا چاہے تو پھر قرآن حکم دیتا ہے کہ ان سے جنگ کی جائے، اور ہدایت کے راستے میں بچھے کانٹوں کو ہٹا پھینک دیا جائے اسی وجہ سے خود پیغمبر اکرم (ص) اور معصومین علیہم السلام کے زمانہ میں ”جہاد ابتدائی“ (یعنی اپنی طرف سے جہاد کی شروعات کرنا) واجب تھا، تاکہ لوگوں کی ہدایت کے موانع برطرف کئے جاسکیں اسی بنیاد پر جب پیغمبر اکرم (ص) مبعوث برسالت ہوئے، بات یہ نہیں کہ آنحضرت (ص) روم اور ایران جیسے ملکوں کے داخلی امور میں دخالت کرنے کا حق رکھتے ہیں یا نہیں؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اکرم (ص) روم نے زمین کے تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے ہیں، لہذا اگر کوئی یہاں تک کہ بادشاہ ایران اور قیصر روم بھی پیغمبر اکرم (ص) کی دعوت اسلام کی مخالفت کریں تو اس صورت میں پیغمبر اکرم (ص) کا وظیفہ بنتا ہے کہ وہ ان سے جنگ کریں اسی وجہ سے آنحضرت (ع) نے (مختلف) ملکوں کے بادشاہوں کو خطوط لکھے اور ان کو اسلام کی دعوت دی اور ان سے یہ چاہا کہ اپنے اپنے ملکوں کی عوام الناس کے لئے رسول خدا اور ان کے نمائندوں کے ذریعہ ہدایت کا راستہ ہموار کریں؛ ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔

اور چونکہ جہاد؛ اسلام کے مسلم اصول میں سے ہے اور تمام شیعہ سنی فرقے اس سلسلہ میں متفق ہیں اور کسی نے کوئی مخالفت نہیں کی ہے، (اور کفر و شرک کے سرداروں سے جہاد اس وجہ سے واجب تھا کہ وہ اپنے تحت لوگوں کی ہدایت و ارشاد اور پیغمبروں کی دعوت کی تبلیغ میں مانع ہوتے تھے، اسی وجہ سے رسول خدا (ص) کا یہ وظیفہ تھا کہ ان لوگوں کو ہدایت کے راستے سے ہٹانے اور عوام الناس کی ہدایت کے راستے صاف کرنے کے لئے ان سے جنگ کریں) ان تمام چیزوں کے پیش نظر یہ بات کیسے کھی جاسکتی ہے کہ اسلام مطلقاً جہاد اور جنگ کو لازم اور جائز نہیں جانتا ہے؟ کیا ہم ان آیات قرآن جو کفار و مشرکین اور منافقین نیز دشمنان اسلام سے جہاد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں ان کو نظر انداز کر دیں اور ان کو چھپادیں؟

قارئین کرام! ہم (یہ بات علی الاعلان) کہتے ہیں کہ دشمنان خدا سے مقابلہ کرنا اسلامی اصول کے تحت ہے اور اسلام نے احکام جہاد کے سلسلہ میں انسانی بہترین اصول کو مد نظر رکھا ہے، اور ان کی رعایت کرنے پر زور دیا ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی زور دیا

ہے کہ جب دشمنان (اسلام) اور وہ لوگ جو دانستہ طور پر حق و حقیقت کے خلاف کھڑے ہو جائے اور دین خدا سے مقابلہ کرنے لگے اور اپنے عہد و پیمانہ کو توڑ ڈالیں؛ تو ان سے جنگ کرو:

﴿وَإِنْ نَكَثُوا إِيمَانَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعْنُوا فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا اِئِمَّةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَا إِيمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُونَ﴾ (۶)

”اگر یہ عہد کے بعد بھی اپنی قسموں کو توڑیں اور دین میں طعنہ زنی کریں، تو کفر کے سربراہوں سے کھل کو جہاد کرو کہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں ہے شاید اسی طرح اپنی حرکتوں سے باز آجائیں۔“

اسی طرح خداوند عالم سورہ تحریم اور سورہ توبہ میں فرمان دیتا ہے کہ پیغمبر اور مسلمان؛ کفار و منافقین سے جنگ کریں اور ان کے ساتھ غیظ و غضب اور شدت پسندی کا برتاؤ کرو:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَا وَأَهُمْ جَهَنَّمَ وَنِيسَ الْمَصِيرِ﴾ (۷)

”اے پیغمبر! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے کہ ان کا انجام جہنم ہے جو بدترین ٹھکانہ ہے۔“
(وہ مذکورہ مقالہ نگار جس نے لکھا تھا کہ جہاد سے متعلق قرآنی آیات کفار سے مخصوص ہیں، اس نے اس آیت پر غور فکر نہیں کیا کہ اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے کفار سے جہاد کے علاوہ داخلی منافقوں سے بھی جہاد اور مقابلہ کا حکم دیا ہے۔)
اسی طرح سورہ توبہ میں ایک دوسری جگہ ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً وَاغْلُظُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾ (۸)

”اے ایمان لانے والو! اپنے آس پاس کفار سے جہاد کرو تاکہ وہ تم میں سختی اور طاقت کا احساس کریں اور یاد رکھو کہ اللہ صرف پرہیزگار افراد کے ساتھ ہے۔“

مذکورہ آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ کفار جو تمہارے نزدیک زندگی گزارتے ہیں؛ ان سے جنگ کرو اور ان سے غافل نہ ہو جانا اور اپنے غیظ و غضب کا مزہ اپنے پڑوسی کفار کو چکھا دو تاکہ وہ (مسلمانوں سے) ڈریں اور ان کے خلاف کوئی خیانت اور سازش نہ کریں۔

اسی طرح خداوند عالم فرماتا ہے:

﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْحَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُوهُمْ اللَّهُ

يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ﴾ (۹)

”اور تم سب ان کے مقابلہ کے لئے امکانی قوت اور گھوڑوں کی صف بندی کا انتظام کرو جس سے اللہ کے دشمن، اپنے دشمن اور ان کے علاوہ جن کو تم نہیں جانتے ہو اور اللہ جانتا ہے سب کو خوفزدہ کر دو، اور جو کچھ بھی راہ خدا میں خرچ کرو گے سب پورا پورا ملے گا اور تم پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

(وہ حضرات جو عربی ادبیات (زبان) جانتے ہیں؛ ہم ان کو اس بات کی تاکید کرتے ہیں کہ وہ لفظ ”ارباب“ کے ہم معنی لفظ دوسری زبانوں میں تلاش کریں؛ اور اگر ہم عرض کمردیں تو کل ہی اخباروں کی سرخی بن جائے گی کہ فلاں صاحب تو ٹروریزم ”Terroisme“ کے طرفدار ہیں۔)

بہر حال قرآن مجید نے حکم دیا ہے کہ جن لوگوں سے منطق اور اصول کے ساتھ گفتگو نہیں کی جاسکتی اور انھوں نے جرات اور دلیری کے ساتھ راہ ہدایت کو بند کر دیا ہے اور بغض و عناد اور دشمنی کی بنا پر اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرتے ہیں، ان کے ساتھ تو تشدد اور غیظ و غضب سے مقابلہ کرنا چاہئے اور مسلمانوں کو چاہئے کہ ان کے درمیان رعب و دہشت ایجاد کمردیں تاکہ ان کے اندر مسلمانوں کے ساتھ خیانت کرنے اور اسلام کو نقصان پھونچانے کا تصور بھی پیدا نہ ہو ان سے یہ نہیں کھا جاسکتا کہ: ”تم اپنے دین پر ہم اپنے دین پر، آؤ مل جل کر ایک ساتھ اطمینان کی زندگی بسر کریں۔“

۹۔ اسلامی سزا کے احکام کی مخالفت

بعض مقالہ نگاروں نے اپنے مقالات میں ہم پر یہ اعتراض کیا کہ اسلام نے کفار و مشرکین کے سلسلہ میں تشدد اور شدت پسندی کے برتاؤ کا حکم دیا ہے، اور ان کو اپنا ہمشہری ماننے سے انکار کیا ہے، حالانکہ یہ لوگ اس بات سے غافل ہیں کہ اسلام نے بعض جرائم پر خود مسلمانوں کے لئے سخت سے سخت سزا معین کی ہے، اور اپنے قوانین میں ایسے لوگوں کے لئے کڑی سزا مقرر کی ہے مثال کے طور پر چوری کے مسئلہ میں اسلام کا حکم ہے کہ چور کے ہاتھ کاٹ دئے جائیں یا زنا، عفت اور عزت کے دوسرے مسائل میں مجرموں کے لئے حد اور سزا معین کی ہے مثلاً زنا کرنے والے کو سوتازیا نے لگانے کی سزا معین کی گئی ہے، اور بعض عفت کے منافی جرائم کے سلسلہ میں سزائے موت بھی رکھی گئی ہے درحقیقت اس طرح کے مجرموں کے لئے اسلامی سزا بھت سخت اور ناقابل برداشت ہیں لیکن اس چیز پر توجہ رکھی جائے کہ اسلام نے بعض عفت کے منافی جرائم جیسے زنا کو ثابت کرنے کے لئے سخت شرائط معین کئے ہیں جس کی بنا پر بھت ہی کم یہ جرم ثابت ہو پاتے ہیں تاکہ ان پر حد جاری ہو سکے۔

بعض شرعی اور اسلامی حدود اور سزا کی بنا پر اسلام دشمن افراد کو اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا ایک بھانہ مل گیا ہے جس کی بنا پر یہ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اسلام میں حقوق بشر کی رعایت نہیں کی جاتی، اور اسلام کی سزا میں تشدد پائی جاتی ہے نیز انسانی شرافت کو نظر انداز کیا جاتا ہے جی ہاں! دشمن اور حقوق بشر کے جھوٹے مدعی کہتے ہیں: ”ایک مسلمان چور کے ہاتھوں کو کاٹنا غیر انسانی عمل اور تشدد آمیز ہے اور انسانی شرافت کے مخالف ہے؛ کیونکہ جس شخص کے ہاتھ کاٹے جاتے ہیں تو وہ انسان پوری زندگی کے لئے اس مفید عضو سے محروم ہو جاتا ہے اور ہمیشہ معاشرہ میں ایک چور کے عنوان سے پہنچانا جاتا ہے۔“

جبکہ اس کے مقابلہ میں بعض اسلام کا دعویٰ کرنے والوں نے اسلام کا دفاع کرتے ہوئے اس طرح کا نظریہ پیش کرتے ہیں: اسلام کے یہ سزا کے احکام گذشتہ زمانہ سے متعلق تھے اور ایک خاص زمانہ سے مخصوص تھے، آج کل تو امنیت کے تحفظ اور چوری سے روک تھام کے لئے نئے نئے طریقے موجود ہیں لہذا کسی چور کے ہاتھ کاٹنے کی ضرورت نہیں ہے اگر امنیت کے تحفظ اور دوسرے جرائم سے روک تھام کے لئے بہتر طریقے موجود ہوں تو پھر امریکہ؛ جس میں جرائم سے روک تھام کے لئے نئے نئے طریقے نافذ کئے جاتے ہیں، لیکن پھر بھی روزانہ ہزاروں جرائم ہوتے ہیں، اور وہاں کے کالجوں میں مسلح پولیس کا رہنا ضروری ہے۔

جو لوگ جو نہایت بے شرمی کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ اسلامی سزائیں ناقابل قبول ہیں اور ان کو تشدد اور شدت پسندی کا عنوان دیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ یہ سزائیں چودہ سو سال پہلے سے متعلق تھیں عصر حاضر میں کوئی ان کو قبول نہیں کر سکتا، کیا وہ لوگ یہ بھول گئے کہ جن لوگوں نے قصاص (بدلا) کے قوانین کو غیر انسانی کہہ کر اس کے خلاف مظاہرے شروع کر دیے تھے، اس موقع پر حضرت امام خمینی (رہ) نے ان کو مرتد قرار دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ ان کا خون مباح اور ان کی بیویاں ان لوگوں پر حرام ہیں اور ان کا مال ان کے مسلمان ورثہ میں تقسیم کر دیا جائے۔

جی ہاں امریکن حقوق بشر کے طرفداروں نے اسلامی سزاؤں کو غیر انسانی اور تشدد آمیز کا عنوان دے کر ان کو محکوم و مذموم قرار دیا ہے لیکن ہم ان سے یہ کہتے ہیں کہ اگر اسلامی سزائیں تشدد آمیز ہیں، مان لیتے ہیں کہ بعض مواقع پر اسلامی حدود اور سزائیں تشدد آمیز ہیں، لیکن ہم اسلامی قوانین کا دفاع کرنے والے ہیں اور اس کے خلاف ہر طرح کی سازش کا مقابلہ کرنے کے لئے دل و جان سے آمادہ ہیں، ہم یہ نہیں مانتے کہ احکام منسوخ ہو گئے ہیں، بلکہ ہمارا تو عقیدہ یہ ہے کہ:

”حَلَالٌ مُحَمَّدٍ حَلَالٌ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَحَرَامٌ مُحَمَّدٍ حَرَامٌ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ“

(آنحضرت (ص) کی حلال کردہ چیزیں قیامت تک حلال اور آپ کی حرام کردہ چیزیں قیامت تک حرام ہیں۔)

ہم نے انقلاب اسی وجہ سے برپا کیا ہے کہ ہمارے معاشرہ میں اسلامی احکام نافذ ہوں، ورنہ تو شاہ پہلوی بھی کہتا تھا: ”جو کچھ میں کہتا ہوں وہ اسلام کے مطابق ہے، اور علماء غلطی پر ہیں، اور یہ لوگ بیک ورڈ ہیں!“

ہمارے معاشرہ میں قرآن مجید کے اندر بیان شدہ اسلامی مسائل اور احکام کو نافذ ہونا چاہئیں یہ وہی اسلام ہے جس کی سرفرازی اور بلندی نیز اسلامی حکومت کے لئے ہم نے اپنے رشتہ داروں کی قربانی پیش کی ہے اور اب بھی جانفشانی کرنے کے لئے تیار ہیں، اسی اسلام کی پہچان مقام معظم رہبری (حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی) نے فرماتے ہوئے کھا ہے: ”اسلام ناب وہی اسلام ہے جو قرآن اور سنت میں بیان ہوا ہے، جس کے احکام اور قوانین مناسب اور اجتہادی طریقہ سے انہیں

دو عظیم الہی منبع و مرکز (قرآن و سنت) سے استنباط (حاصل) کئے جاتے ہیں اور جو لوگ اس اسلام کو نہیں مانتے، انھوں نے گویا بنیادی طور پر اسلام کو قبول ہی نہیں کیا ہے، کیونکہ اسلام (صرف ایک ہی ہے) دو نہیں ہیں۔“

۱۰۔ تشدد، اسلامی سزائی قوانین میں محدود نہیں ہے

ایک مقالہ نگار نے اپنے مقالہ میں یہ بیان کیا کہ ”اسلام نے جن قوانین میں تشدد کو جائز قرار دیا ہے وہ جزائی اور سزائی قوانین ہیں اور ہم بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ اسلام نے فتنہ گروں اور تباہ کاروں کے لئے جو سزائیں معین کی ہیں ان میں کم و بیش تشدد پائی جاتی ہے لیکن جس تشدد کے بارے میں ہماری بحث ہے اور ہم جس کو محکوم کرتے ہیں، وہ اسلام کے سزائی قوانین سے متعلق نہیں ہے اور اصولی طور پر سزائی قوانین ہماری تشدد کی بحث سے متعلق نہیں ہیں۔“

اور یہ لکھا کہ میں موضوع سے ہٹ کر گفتگو کرتا ہوں اور اسی بات کو کئی اخباروں نے سرخی بنایا کہ کیوں فلاں صاحب موضوع سے ہٹ کر گفتگو کرتے ہیں! لہذا ہم عرض کرتے ہیں کہ ہمارا موضوع معاشرہ میں ہونے والے ثقافتی کج روی ہے، جیسا کہ اخباروں نے لکھا تھا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کا قتل ہونا؛ آپ کے جد (رسول اللہ (ص)) کی جنگ بدر میں تشدد کا عکس العمل تھا!!

ہم اس مقالہ نگار کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ اے قاضی اور حقوقدان آپ ہمارے بارے میں لکھتے ہیں کہ فلاں صاحب موضوع سے ہٹ کر گفتگو کرتے ہیں، لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ جو بات حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بارے میں کھپی گئی ہے اس میں کس تشدد کی بات ہے اور کس طرح کی تشدد کی نفی کی گئی ہے؟ ہم تو معاشرہ میں پیدا ہونے والی انہیں چیزوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں ہم تشدد، آزادی اور میل جول جیسے الفاظ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، یہاں تک یہ بھی کھ دیا گیا کہ ”جنگ بدر ایک تشدد تھی“ لہذا اسلام تشدد کا دین ہے! لہذا ہم اپنے موضوع سے خارج نہیں ہوتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کوئی شخص یہ کہے: ”ہم اس طرح کے ناجائز فائدہ اٹھانے والی فکر کو رد کرتے ہیں اور اسلام کو تشدد کا دین نہیں مانتے۔“ ہمارا اس سے کہنا یہ ہے کہ حکومتی قوانین، سزائی قوانین اور وہ عدالت جس میں سزائی احکام بنائے جاتے ہیں ان تمام چیزوں سے صرف نظر کرتے ہوئے؛ کیا عوام الناس بھی تشدد کا برتاؤ کر سکتے ہیں، اور وارد میدان ہو سکتے ہیں اور کیا حکومتی اداروں سے ہٹ کر خود عوام الناس تشدد سے کام لے سکتی ہے؟ ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ تم لوگ اسلامی انقلاب کو تشدد سمجھتے ہو یا نہیں؟ جن لوگوں کو ۱۴/۱۵ شہریور ۱۳۵۷ھ شمسی اور اس کے بعد کے حادثات یاد ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہمارے غیرت مند جوانوں اور بھارد قوم نے شاہ پہلوی کے خلاف کیا کیا اقدامات کئے تو کیا شاہ پہلوی کے خلاف مظاہرے اور اقدامات تشدد تھا، یا نہیں؟ کیا یہ کام

صحیح تھے یا نہیں؟ اور کیا اسلام اس طرح کے اقدامات پر راضی ہے یا نہیں؟ اگر اسلام نے اس طرح کے اقدامات کو جائز قرار نہیں دیا ہے تو آپ کا یہ انقلاب غیر قانونی ہے، کیونکہ (آپ کے نظریہ کے مطابق تو) اسلام میں تشدد نہیں پائی جاتی اور اسلام تشدد آمیز اقدامات کو جائز ہی نہیں مانتا! اسی طرح وہ مقدس کارنامے جو مرحوم نواب صفوی اور فدائیان اسلام نے شاہ کی حکومت کے خلاف کئے، (جن کے مہم کارناموں کی بنا پر ان کا نام ہمیشہ ہمارے ملک میں زندہ رہے گا، اور ہم ان کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور آج کل تھران اور دوسرے شہروں کی بھت سسی سڑکوں کا نام انہیں حضرات کے ناموں پر ہے) تو کیا ان کے یہ اقدامات صحیح تھے یا نہیں؟ اسی طرح ”ہیئت مولفہ اسلامی“ کے اعضاء؛ یعنی شہید محمد بخاری اور ان کے ساتھی جنہوں نے شاہ پہلوی کے جلاؤ وزیر اعظم کو واصل جھنم کیا۔

ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص یہ کھے کہ واقعاً اس طرح کے تشدد والے اقدامات نہیں کرنا چاہئے تھے، بلکہ قانونی طور پر صلح و صفائی کی ایک پارٹی بنانا چاہئے تھی جس کے ذریعہ شاہ پہلوی کے سامنے اپنے مطالبات کو رکھا جاتا اور اس سے گفتگو کی جاتی“ لیکن کیا ان کی باتوں کو سنا جاتا اور وہ حساب شدہ باتوں کو سنتے تو یہ لوگ اس طرح کے غیظ و غضب کے ساتھ قدم نہ اٹھاتے، جب انہوں نے دیکھ لیا کہ ان کی جائز باتیں اس طرح گفتگو کے ذریعہ نہیں سنی جاتی تب جا کے انہوں نے اس طرح کے اقدامات شروع کئے۔ ممکن ہے وہ قاضی صاحب فرمائیں: ہماری نظر میں وہ اقدامات محکوم اور مذموم ہیں، ان کو چاہئے تھا کہ آرام و سکون اور مکمل حوصلہ کے ساتھ برتاؤ کرتے، اور اپنی مشکلات کو حل کرنے نیز اپنے مطالبات کو پورا کرانے کے سلسلہ میں کوشش کرتے! ہم ان کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ:

جب ۱۸ تیر ماہ ۱۳۷۸ھ شمسی اور اس کے بعد بعض فسادی اور بد معاش لوگوں نے بیت المال، عمومی اموال، بینک، ذاتی اور سرکاری گاڑیوں یہاں تک کہ مسجدوں میں بھی آگ لگادی اور عورتوں کو بے آبرو کے عورتوں کے سروں سے چادر چھین لیں اور اسلام کے خلاف نعرہ لگائے، تو کیا آپ نے ان لوگوں کے ساتھ پیار و محبت اور ہنسی خوشی سے اپنی آغوش میں بٹھا کر ان کو خاموش کر دیا، یا یہ کام ہمارے ان بسیجیوں نے انجام دیا جو اپنے جان کو ہتھیلی پر رکھ کر آگے بڑھے اور تمام تر خطرات سے نپٹنے کے لئے میدان عمل میں وارد ہوئے اور ان کو کچل دیا، (بھت افسوس کے ساتھ یہ عرض کرتے ہیں کہ ان مظلوم بسیجیوں کے حق کو آج تک نہیں پہنچانا گیا اور اس کا شکریہ ادا نہیں کیا جاتا؛ جبکہ یہ جو ان انقلاب اور اسلام کے دفاع کے لئے قربۃ الی اللہ حاضر ہوئے تھے اور خدا ہی ان کو بہترین اجر و ثواب عنایت کرے گا۔)

مکن ہے وہ جناب کھیں: کہ ہم فتنہ و فساد پھیلانے والوں کے سلسلہ میں بسیجیوں کے اقدامات کو محکوم کرتے ہیں، اور ان کو اس طرح کا اقدام نہیں کرنا چاہئے تھا، کیونکہ ان کو لوگوں کو بھی یہ حق تھا کہ وہ اپنی بات کھیں اور اعتراض کریں وہ بھی آزاد ہیں جیسا کہ امریکائیوں کا کہنا ہے: جن لوگوں نے قیام کیا اور مظاہرے کئے اور مساجد میں آگ لگائی یہ آزادی خواہ تھے لہذا ان لوگوں کو

یہ کہنے کا حق تھا کہ ہم آزادی چاہتے ہیں، اور دین نہیں چاہتے! (جیسا کہ ایک صاحب اپنی تقریر میں کہتے ہیں کہ لوگوں کو خدا کے خلاف مظاہرے کرنے کا بھی حق ہے۔)

لیکن اگر وہ یہ کہیں: جب ان لوگوں نے دیکھ لیا کہ اگر خوش رفتاری سے اپنی بات کو علی الاعلان کہتے ہیں کہ ہمیں دین و اسلام نہیں چاہئے تو حکومت ان کی بات کو نہ مانتی؛ اسی وجہ سے یہ لوگ مجبور ہو گئے کہ ذاتی اور سرکاری عمارتوں اور مساجد میں آگ لگادیں اور اسلام کے خلاف نعرے لگائیں، تاکہ وہ کسی نتیجے پر پہنچ پائیں؛ اور یہ لوگ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے، نہ کہ ان لوگوں کو کچلنے والے۔

ہم اس کے جواب میں صرف اتنا عرض کرتے ہیں: آخر کار تم لوگ بھی تشدد اور شدت پسندی کو مانتے ہو کیونکہ اس حادثہ کے سلسلہ میں دو باتوں میں سے کسی ایک کو تو ضرور قبول کرو گے، یا فتنہ فساد برپا کرنے والوں اور مساجد میں آگ لگانے والوں کا اقدام صحیح تھا؛ اس صورت میں تم خود تشدد کی تائید کر رہے ہو، چونکہ ان کا اقدام تشدد پر مبنی تھا، یا تم یہ کھو کہ بسبب عوام الناس اور پولیس کا رویہ صحیح تھا؛ تو اس صورت میں بھی تم نے تشدد کی تائید کی، لہذا آپ بتائیں کہ کس تشدد کو جائز قرار دیتے ہو؟

ہم اس طرح کے لوگوں کی باتوں کو نہیں مانتے بلکہ ہمارے لئے معیار بانی انقلاب حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام ہے ہم انہیں کے تابع ہیں ہم نے حکومتی اور ولایتی احکام انہیں سے سیکھے ہیں چنانچہ موصوف نے فرمایا:

”اگر ہمارے جوان اور حزب اللہی عوام الناس نے اس چیز کا مشاہدہ کیا کہ بعض تبلیغات، مقالات، تقاریر، کتابوں اور جرائد میں اسلام اور حکومتی مصالح کے خلاف قدم اٹھایا جا رہا ہے، تو ان کا وظیفہ ہے کہ وہ اس سلسلہ میں متعلقہ اداروں کو رپورٹ دیں اور ان اداروں کی ذمہ داری ہے کہ اس سلسلہ میں قدم اٹھائیں لیکن اگر متعلقہ اداروں نے کوتاہی کی اور قانونی طریقہ سے اس طرح کے انحرافات اور فاسد تبلیغات کا سدباب نہ کیا تو اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ ہمارے دیندار جوان میدان عمل میں گود پڑیں اور ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اس سلسلہ میں اپنا قدم آگے بڑھائے۔“ (۱۰)

تمام لوگ اس بات کے گواہ ہیں کہ جس مرتد سلمان رشدی نے ”شیطانی آیات“ نامی کتاب لکھی جس میں قرآن کریم اور پیغمبر اکرم (ص) کی توہین کی گئی، تو حضرت امام خمینی (رہ) نے اس کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا، ”اور ہر مسلمان پر واجب قرار دیدیا کہ اگر کوئی سلمان رشدی کو قتل کر سکتا ہے تو اس پر قتل کرنا واجب ہے“ اور یہ فتویٰ صرف امام خمینی (رہ) ہی کا نہیں تھا بلکہ تمام اسلامی فقہاء نے اسی طرح کا فتویٰ دیا اور تمام اسلامی ملکوں نے اس فتویٰ کی تائید کی اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا امام خمینی (رہ) کا یہ فتویٰ تشدد پر مبنی نہیں تھا؟ (کیوں نہیں) لہذا معلوم یہ ہوا کہ حضرت امام خمینی (رہ) نے بھی اس شخص کے بارے میں تشدد کا رویہ اختیار کیا جس نے ضروریات دین اور اسلامی مسلم اصول کی توہین کی اور اسلامی مقدسات کو حرمت کو پامال کرنا چاہا، امام خمینی (رہ) نے اس طرح کی تشدد کو جائز قرار دیا بلکہ ضروری سمجھا اور ایسے شخص کو مرتد اور واجب القتل قرار دیا۔

۱۱۔ ہر موقع پر علمی شبہات اور اعتراضات کا جواب دیا جائے (اسلامی نظریہ)

لیکن اگر کوئی شخص سازش یا کسی نقصان پہنچانے کا قصد نہ رکھتا ہو اور دین، ضروریات دین اور احکام اسلام کے بارے میں کوئی شبہ یا اعتراض اس کے ذہن میں ہو تو وہ اس کو بیان کر سکتا ہے، بھرپور ادب و احترام کے ساتھ اس کی باتوں کو سنا جائے گا اور منطق و استدلال کے ساتھ اس کو جواب دیا جائے گا، کیونکہ دین اسلام دین منطق ہے، اس کی بنیاد استدلال اور برہان پر قائم ہے، اور جب مسلمانوں اور علماء اسلام سے جب بھی کسی نے کسی اعتراض کا جواب طلب کیا ہے تو انھوں نے صبر و بردباری اور کشادہ دلی کے ساتھ بہترین دلائل پر بنی عقلی اور شرعی جوابات پیش کئے ہیں اور اسلام کی حقانیت کو ثابت کیا ہے اسی وجہ سے قرآن مجید کا حکم ہے کہ اگر کوئی شخص اگرچہ میدان جنگ میں دشمن کا سپاہی کیوں نہ ہو؛ سفید پرچم کو اٹھائے ہوئے اسلام کی حقانیت کے بارے میں تحقیق و جستجو کرنے کے لئے مسلمانوں کے پاس آئے اور اپنے سوالات کا جواب تلاش کرے، تو اس وقت مسلمانوں کو چاہئے کہ اس کو تحفظ دیں حفاظت کریں اور اس کو کسی طرح کا کوئی نقصان نہ پہنچائیں، آرام و سکون اور پیار محبت سے اس کی باتوں کو سنیں، اور اسلام کی حقانیت اور برحق ہونے کو دلیل اور برہان کے ذریعہ ثابت کریں؛ اس کے بعد اس کو تمام تر حفاظت کے ساتھ دشمن کے لشکر میں واپس کر دیں۔

خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ ابْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (۱۱)

”اور اگر مشرکین میں کوئی تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دو تاکہ وہ کتاب خدا سننے اس کے بعد اسے آزاد کر کے جہاں اس کی پناہ گاہ ہو وہاں تک پھونچا دو اور یہ مراعات اس لئے ہے کہ یہ جاہل قوم حقائق سے آشنا نہیں ہے۔“

قرآن کا حکم ہے کہ اگر کوئی شخص اسلام کی حقانیت کے بارے میں سوال اور تحقیق کے لئے آتا ہے، لیکن تحقیق کے بعد بھی مسلمان نہ ہو تو اس کو مکمل حفاظت کے ساتھ اس امن کی جگہ پھونچا دو اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اس کو کسی طرح کا کوئی گزند پہنچائے؛ کیونکہ وہ اپنے سوالات کا جواب لینے کے لئے آیا تھا لہذا اس کی حفاظت ضروری ہے، اس کے سوالات کا جواب دیدیا گیا ہے۔

قارئین کرام! اب ہم سوال کرتے ہیں کہ دنیا کے کس گوشہ اور کس مذہب میں اسلام کی طرح اس بلند ترین برتاؤ پر زور دیا گیا ہے؟

لیکن اگر کوئی شخص عناد و دشمنی اور سازش کے تحت، نظام اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے کوئی شبہ یا اعتراض کرتا ہے اور مسلمانوں کے عقائد، اصول اور اسلامی اقدار میں شک و تردید ایجاد کرنا چاہتا ہے تو پھر اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے، اور اس

شخص کا مسئلہ اس مسئلہ سے الگ ہے جو اپنے سوالات کا جواب چاہتا ہو اور اس کے دل میں اسلام کو نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں ہو۔

۱۲۔ دشمن کی سازشوں سے مقابلہ کی ضرورت

ہمیں ثقافتی امور میں وسیع پیمانے پر اسلامی اصول اور عقائد کے خلاف سازشیں کرنے والوں کے مقابلہ میں خاموش نہیں رہنا چاہئے، اور اسی طرح ان لوگوں کے سامنے جو اندرون ملک زر خرید قلم کے ذریعہ اسلام کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں؛ خاموش بیٹھے تماشا نہیں دیکھنا چاہئے واقعاً ان لوگوں نے سازش کا پروگرام بنا رکھا ہے جبکہ بعض لوگ اس کو ثقافتی رد و بدل کا عنوان دیتے ہیں، اور اخباروں میں لکھتے ہیں کہ کسی طرح کی کوئی سازش نہیں ہے، اور سازشوں کے دعویٰ کو خیال خام قرار دیتے ہیں، لیکن کچھ مدت پہلے ہوئے حادثے نے ان سازشوں سے پردہ اٹھادیا۔

وہ سب اسلامی نظام کے خلاف مظاہرے اور عمومی اور سرکاری اموال پر حملہ اور فتنہ و فساد؛ یہ سب اسی بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ واقعاً اسلامی نظام کے خلاف ایک بھت بڑی سازش تھی، جیسا کہ مقام معظم رہبری (حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی) نے بھی بیان فرمایا کہ اسلام دشمن طاقتوں کی طرف سے اسلامی نظام کے خلاف سازش تھی اور اسی حقیقت کے پیش نظر جب فتنہ گروں کو اپنے جگہ بٹھادیا گیا اور فتنہ کی لگائی ہوئی اس آگ کو فداکار بسیجیوں نے بجھادیا تو اس وقت ان کی حمایت اور اسلامی نظام کی محکومیت میں دنیا میں شور ہونے لگا یہاں تک کہ خود امریکہ کے ممبر آف پارلیمنٹ نے یہ نعرہ لگایا کہ اسلامی جمہوری ایران کو محکوم ہونا چاہئے اور اس کے خلاف قوانین بنائیں جائیں؛ کیونکہ اسلامی حکومت نے بیرونی زر خرید نوکروں کو فتنہ و فساد پھیلانے کی اجازت نہیں دی!!

دنیا بھر میں ہر روز ہڑتال، مظاہرے اور توڑ پھوڑ ہوتی رہتی ہے اور بھت سے لوگ قتل اور زخمی ہوتے رہتے ہیں ہم ہر روز یہ دیکھتے ہیں کہ صھیونیزم بے گناہ فلسطینی مسلمانوں کا خون بھاتے ہیں جو صرف اپنے پامال شدہ حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں، یہاں تک کہ امریکہ سے وابستہ حکومتوں کے ذریعہ سینکڑوں لوگوں کا قتل ہوتا ہے لیکن کوئی کچھ نہیں کہتا، کہیں سے یہ آواز نہیں اٹھتی کہ یہ حقوق بشر کی پامالی ہے، یا ان لوگوں کا کچلنا آزادی کے خلاف ہے بلکہ اس حکومت کی حمایت کی جاتی ہے اور کہتے ہیں کہ یہ قانونی حکومت کے خلاف قیام تھا اور حکومت کو بھی اپنے دفاع کا حق ہے لیکن جب ایران کی کسی یونیورسٹی میں مشکوک طریقہ سے کسی کا قتل ہو جاتا ہے جس کا قاتل بھی ابھی تک پتہ نہ چل سکا (اگرچہ یہ بھی دشمن کے زر خرید نوکروں اور فساد پھیلانے والوں کا کام ہے) یا کسی شخص کی کسی حادثہ میں موت ہو جاتی ہے، اسی طرح جب فتنہ و فساد پھیلانے والوں کے ذریعہ مساجد میں آگ لگائی جاتی ہے، ناموس پر حملہ کیا جاتا ہے، اور بسیجی ان کا مقابلہ کرتے ہیں؛ تو اس وقت مغربی ممالک خصوصاً امریکہ میں ہمارے ملک کے

خلاف ہنگامہ ہوتا ہے، اور ہماری حکومت کو محکوم کیا جاتا ہے، اور ہمارے ملک کو آزادی اور ڈیموکریسی کا مخالف قرار دیا جاتا ہے دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ مظاہرہ کرنے والے اپنے حقوق اور آزادی کے خواہاں تھے، لیکن ایرانی حکومت نے ان کو کچل دیا، جس کے نتیجے میں ایرانی حکومت کو محکوم کرنے کے علاوہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسلامی جمہوری ایران سے مقابلہ کے لئے قوانین بنائے جائیں!

۱۳۔ دشمنان اسلام سے مقابلہ اور اعلان برائت ضروری ہے (قرآن کریم)

قارئین کرام! نتیجہ یہ ہوا کہ جس خدا کی پہچان قرآن کریم نے فرمائی ہے وہ خدا صاحب رحمت بھی ہے اور صاحب غضب بھی، اگرچہ اس کی رحمت اس کے غضب سے کہیں زیادہ ہے، اور اس کے غضب سے آگے آگے رہتی ہے، اور یہ کہ خدا کی رحمت اس کے غضب کی نفی نہیں کرتی، جیسا کہ خداوند عالم نے گناہوں پر اصرار کرنے والی بعض گذشتہ اقوام پر اپنا غیظ و غضب کا مظاہرہ کیا، اور ان پر اپنا عذاب نازل کیا ہے۔

دوسرے یہ کہ اسلام نے؛ اپنے سے دشمنی اور عداوت رکھنے والوں کے لئے سخت سے سخت قوانین مرتب کئے ہیں اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ اسلام دشمن افراد سے واضح طور پر برائت اور نفرت کا اعلان کریں۔

اس سلسلہ میں آپ حضرات سورہ ممتحنہ کی تلاوت کریں جس میں کفار اور مشرکین سے مسلمانوں کے طور طریقہ کو بیان کیا گیا ہے اور جو لوگ دشمنان خدا سے دوستی کا نقشہ پیش کرتے ہیں ان کی سخت مذمت کی گئی ہے، نیز خداوند عالم دشمنان اسلام سے مخفی طور پر دوستی کرنے سے ڈراتا ہے۔ اس سورہ مبارکہ میں خداوند عالم مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کے اصحاب سے پند حاصل کریں اور دشمنان خدا کے مقابلہ میں ان کے رویہ کو اپنے لئے نمونہ عمل قرار دیں، نہ یہ کہ جو لوگ اسلام اور مسلمین کی نابودی کے لئے ظاہری اور مخفی طریقہ سے فعالیت کرتے ہیں؛ ان کے سامنے بیٹھے مسکراتے رہیں!

چنانچہ ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْفُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ حَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي تُسِرُّونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَإِنَّا أَعْلَمُ بِمَا أَحْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴾ (۱۲)

”ایمان والوں خبردار! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بنا نا کہ تم ان کی طرف دوستی کی پیش کش کرو جب کہ انہوں نے اس حق کا انکار کر دیا ہے جو تمہارے پاس آچکا ہے اور وہ رسول کو اور تم کو صرف اس بات پر نکال رہے ہیں کہ تم اپنے پروردگار (اللہ) پر ایمان رکھتے ہو، اگر واقعاً ہماری راہ میں جہاد اور ہماری مرضی کی تلاش میں گھر سے نکلے ہو تو ان سے خفیہ دوستی

کس طرح کمر رہے ہو؟ جب کہ میں تمہارے ظاہر و باطن سب کو جانتا ہوں، اور جو بھی تم میں سے ایسا اقدام کرے گا وہ یقیناً سیدھے راستے سے بھک گیا ہے۔“

﴿فَدَّ كَانَتْ لَكُمْ اَسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي اِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ اِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَّاءٌ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰى تُوْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهُ﴾ (۱۳)

”تمہارے لئے بہترین نمونہ عمل ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کے ساتھی ہے جب انہوں نے اپنے قوم سے کھ دیا کہ ہم تم سے اور تمہارے معبودوں سے بے زار ہیں ہم نے تمہارا انکار کر دیا ہے اور ہمارے تمہارے درمیان بغض اور عداوت بالکل واضح ہے یہاں تک کہ تم خدائے وحدہ لا شریک پر ایمان لے آؤ“

ہم سے کھا جاتا ہے کہ زندگی کی باتیں کیجئے اور ”امریکہ مردہ باد“ کے نعروں کو چھوڑیے، جی نہیں، ”امریکہ مردہ باد“ کے نعروں پرے زور و شور سے لگائے جائیں گے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ان سے یہ بات واضح طور پر کھ دی جائے کہ جب تک حق کے سامنے سر تسلیم نہ کرو گے، خدا کے سامنے اپنا سر نہ جھکائیں اور دوسروں پر اپنی حکومت جتانا نہیں چھوڑتے اور استکبار کی حالت سے اپنے کو نہیں نکالتے اور اپنے اپنائے ہوئے راستے کو نہیں بدلتے، دنیا بھر کے لوگوں کے منافع کو پامال کرنا نہیں چھوڑتے اور آزاد ملتوں پر ستم کرنا ترک نہیں کرتے، ہم تمہارے دشمن ہیں۔

حالانکہ ان لوگوں نے ہمارے اور دوسرے اسلامی ملکوں کے منافع کو غارت کیا اور بھت زیادہ نقصانات پہنچائے، ہماری عزت و آبرو کو پامال کیا اور ہمارے بھت سے رشتہ داروں کا خون بھایا، ہم بھلا کس طرح ان سے دوستی اور محبت کا مظاہرہ کریں؟ کیا دنیا بھر میں سیکڑوں بار کا تجربہ ہمارے لئے کافی نہیں ہے کہ ہم یہ سمجھ لیں کہ ان کے اندر مفاد پرستی اور استکبار کے علاوہ کچھ نہیں ہے، ہم پھر ان کے مکر و فریب کے جال میں پھنس جائیں؟!

قارئین کرام! قرآن مجید نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ خدا و رسول اور اسلام کے دشمنوں کے سامنے واضح طور پر برانت اور دشمنی کا اظہار کریں اور اگر ہم اسی اسلام اور قرآن کے ماننے والے ہیں جو کمر وٹوں کی تعداد میں ہر مسلمان کے پاس موجود ہے اور دشمنان خدا سے برانت پر زور دیتا ہے، اور یہ برانت اور دشمنی کا اعلان صرف جزائی (سزائی) قوانین کے تحت نہیں ہے بلکہ اس سے بھی آگے ہے؛ تو پھر یہ کس طرح کھا جاسکتا ہے کہ سب کے سامنے بیٹھے مسکراتے رہیں اور سب کے ساتھ مہربان رہیں؟

حوالے

(۱) وصیت نامہ سیاسی الہی امام خمینی (رہ)، بند دوم

(۲) سورہ آل عمران آیت ۴

(۳) سوره سجده آیت ۲۲

(۴) سوره بقره آیت ۹۰

(۵) سوره انعام آیت ۱۲

(۶) سوره توبه آیت ۱۲

(۷) سوره توبه آیت ۷۳، سوره تحریم آیت ۹

(۸) سوره توبه آیت ۱۲۳

(۹) سوره انفال آیت ۶۰

(۱۰) وصیت نامه حضرت امام خمینی (ره)، بند دوم

(۱۱) سوره توبه آیت ۶

(۱۲) سوره ممتحنه آیت ۱

(۱۳) سوره ممتحنه آیت ۴

اڑتیسواں جلسہ

اسلامی قوانین کے ساتھ مغربی نظریات کا ٹکراؤ

۱۔ تحریک مشروطیت اور مغربی کلچر کا رواج

قارئین کرام! ہم نے ”اسلامی سیاسی نظریات“ کی بحث کے دوران بعض ان مشکلات کی طرف اشارہ کیا جو مغربی ثقافت کے نفوذ کی وجہ سے ہمارے ملک میں پیدا ہو گئی ہیں، اور ہم نے ان اسباب کی طرف بھی اشارہ کیا جن کی وجہ سے یہ مشکلات پیدا ہوئی ہیں تاکہ ہمارے برادران خصوصاً جوانان عزیز اور آئندہ انقلاب کے وارث ان مشکلات میں گرفتار نہ ہوں منجملہ ان مشکلات کے جس کو گذشتہ بحث میں بیان کیا آزادی اور ڈیموکریسی کی بحث تھی۔

”تحریک مشروطیت“^(۱) کے آغاز سے اس وقت تک ہمارے رابطہ مغربی کلچر سے زیادہ ہوتا گیا ہے، فرامانسون "Francmaconne"^(۲) اور مغرب پرست (مغربی کلچر سے متاثر افراد) نے مغربی ممالک میں رائج مختلف کلچر کو اپناتے ہوئے ان کو اسلامی معاشرہ میں رائج کرنا شروع کر دیا اگرچہ مختلف وجوہات کی بنا پر بعض چیزوں (جیسے آزادی اور ڈیموکریسی) کے رائج ہونے کا راستہ فراہم تھا، کیونکہ شاہ کے ظلم و ستم سے ہمارا معاشرہ پریشان ہو چکا تھا، لہذا آزادی کی آواز پر فوراً لبیک کہا اور جب بھی کسی نے آزادی کا نعرہ لگایا اس کا بھت زیادہ استقبال ہوا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس طرح کے نعرے سب کی زبان پر آنے لگے، اور آزادی اور آزادی خواہی کے بھت زیادہ طرفدار بن گئے البتہ اسلامی اقدار کے مخالف ان قید و بند اور ظلم و ستم سے عوام الناس آزادی چاہتے تھے لیکن مغربی تمدن سے متاثر حضرات نے آزادی کا دوسرا رخ پیش کیا یعنی اسلام سے آزادی درحقیقت وہ اس نعرے کے ذریعہ عوام الناس کو اسلام سے دور کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ اسلامی قوانین اور اسلامی اقدار کی پابندی نہ کر پائیں۔

اسی طرح وہ عوام الناس جو خان، راجہ اور فوڈل (اشرافی حکومت، یا جاگیرداری) کی ظالم حکومت سے پریشان تھے، لہذا ان کو ڈیموکریسی کا نعرہ اچھا لگا اور ڈیموکریسی حکومت بنانے کی کوشش کرنے لگے، نہ یہ کہ اس طرح کے ظالم و جابر افراد ان کی سرنوشت اور زندگی کے بارے میں منصوبہ بندی بنائیں اسی وجہ سے یہ نظریہ عوام الناس میں قابل قبول تھا لیکن جن لوگوں نے اس معنی کو عام طور پر رواج دیا اور اس مغربی تحفہ کی عبادت و پرستش کرتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کی پرستش کی دعوت دی، تو ان کا مقصد ڈیموکریسی کے اس نعرہ سے اسلامی اقدار کو بالائے طاق رکھ دینا تھا اور دین کو معاشرہ کی سیاسی زندگی سے ہٹانا تھا، نیز عوام الناس کے نظریات اور ان کی مرضی کو اسلامی اور مذہبی اقدار کی جگہ قرار دینا ان کا مقصد تھا لیکن جو لوگ مغرب پرستوں کے ان ناجائز اہداف سے واقف نہ تھے وہ اس طرح کے مطلق شعار کو قبول کر لیتے تھے؛ لیکن جو لوگ دور اندیش اور ہوشیار تھے انھوں

نے اس کے خلاف عکس العمل دکھایا، اور عوام الناس پر اس حقیقت کو واضح کرنے اور دشمن کی سازش کو برملا کرنے کے لئے انھوں نے اپنی جان تک کی بازی لگادی، اور اپنے تمام تر وجود کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کیا کہ وہ مطلق آزادی اور ڈیموکریسی جو اسلام اور اسلامی قوانین کے مخالف ہو؛ وہ اسلامی لحاظ سے قابل قبول نہیں ہے۔

شہید بزرگوار شیخ فضل اللہ نوری رحمۃ اللہ علیہ کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے ڈیموکریسی اور مشروطہ غربی کی مخالفت کی جو کہ اسلامی اور الہی اقدار کے مخالف تھی، اور موصوف نے ”مشروطہ مطلقہ“ کے مقابلہ میں ”مشروطہ مشروعہ“^(۱) پیش کی چنانچہ موصوف فرماتے تھے: ہم مشروطہ کو مطلق طور پر قبول نہیں کرتے، بلکہ ہم اس مشروطہ کو قبول کریں گے جو اسلام اور قوانین اسلامی کے موافق ہو، لیکن دوسرے لوگ مشروطہ مطلقہ کا نعرہ لگاتے تھے، کیونکہ ان کی نظر میں اس کا موافق شریعت ہونا یا نہ ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا؛ لہذا اپنے ناپاک اہداف کے تحت اس عالی قدر عالم روحانی کو ظلم و استبداد کی طرف داری اور مشروطہ مطلقہ کی مخالفت کے جرم میں پھانسی چر لٹکا دیا اور ان کو شہید کر دیا اگرچہ ایک طرف سے ”اصول گریبان“ اور ”اسلام خواہان“ کے درمیان اور دوسری طرف دگر اندیشان اور مغرب پرستوں میں یہ جنگ و جدال اور کشمکش ابھی تک جاری و ساری ہے۔

۲۔ اسلام میں مطلوب اور مقصود آزادی کے نقشہ پر بعض مولفین کی نارضا مندی

قارئین کرام! ہم نے گذشتہ سال آزادی اور ڈیموکریسی کے سلسلہ میں بحث و گفتگو کی جس میں ہم نے بیان کیا کہ ہمارے معاشرہ میں مطلق آزادی قابل قبول نہیں ہے، اور جیسا کہ اسلامی تمدن اور بنیادی قوانین میں مشروط آزادی مقبول ہے بنیادی قوانین کی اصل نمبر ۴ کی بنا پر: بنیادی قوانین کے اصول، قوانین موضوعہ، پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین، یا دوسرے اداروں کے ذریعہ بنائے جانے والے قوانین اس وقت معتبر ہیں جب وہ دلیل شرعی کے عموم اور اطلاق سے کسی طرح کی کوئی مخالفت اور مغایرت نہ رکھتے ہوں لہذا اگر بنیادی قوانین کی ایک اصل بھی آیات و روایات کے عموم اور اطلاق سے مخالفت رکھتے ہوں تو وہ غیر معتبر ہے! ہماری ملت نے اسی بنیادی قوانین کو ووٹ دیا ہے جو اس قدر اسلامی مضبوط پشت پناہی رکھتا ہے لہذا اسلام کے اجیاء اور زندگی کے لئے انقلاب برپا کرنے والے ہماری ملت بنیادی قوانین میں اسلامی احکام اور اسلامی منزلت کے تحفظ کے طلب گار ہیں، تو پھر وہ غیر اسلامی تمدن کو کیسے قبول کر سکتی ہے؛ لہذا ہماری ملت کے نزدیک (جو اسلامی

(۱) یعنی وہ مشروطیت جس میں شرعی قوانین کے تحت کام کیا جائے (مترجم)

نظریہ ہے)؛ وہ آزادی قابل قبول ہے جو اسلامی احکام اور اقدار کے تحت ہو۔

لیکن ہماری اس بحث کے بعد بھت سے اخباروں کے مالکان نے ہماری مخالفت شروع کر دی، اور بھت سے مقالات ہماری مخالفت میں چھپنے لگے، اور ہم کو آزادی اور ڈیموکریسی کا مخالف اور ظلم و ستم کا طرف دار بتایا جانے لگا، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے تو یہ بھی کھ ڈالا کہ فلاں صاحب تو ایران کو پیچھے کی طرف لے جا رہے ہیں! اور آخر کار ایک مسلمان اور انصاف پسند مقالہ نگار نے ہماری باتوں کا اعتراف کیا اور کہا: ہمارا معاشرہ اس آزادی کا دفاع کر سکتا ہے جو اسلامی احکام اور قوانین شریعت کے دائرہ میں ہو؛ جبکہ ہمارے حکومتی عہدہ داران نے بھی بارہا اسی مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں۔

۳۔ مفسد فی الارض کے بارے میں اسلامی حکم

ہم نے گذشتہ بحث میں بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ عدلیہ کو طاقتور ہونا ضروری ہے تاکہ خلاف ورزی کرنے والوں کو ان کی سزائے اعمال تک پہنچایا جاسکے، اور مجرموں کو سزا مل سکے، اور اس کام کے لئے پولیس اور قدرت کا استعمال کرنا ضروری ہے اور اگر اس طرح کی طاقت اسلامی حکومت میں نہ ہو تو پھر وہ معاشرہ میں اسلامی قوانین کو نافذ کرنے کی ضامن نہیں ہو سکتی اس چیز کو دنیا بھر کی حکومتوں میں قبول کیا جاتا ہے سوائے ”آنارشیسٹوں“ ”Anarchistes“ (فساد طلب) اور حکومت کا انکار کرنے والوں کے، اور سبھی افراد حکومتوں کے لئے طاقت اور پولیس کو لازمی اور ضروری جانتے ہیں لہذا اسلامی حکومت کے لئے امن و امان قائم کرنے، معاشرہ میں نظم و ضبط برقرار رکھنے، الہی احکام اور حدود نیز اسلام کے سزائی قوانین کو نافذ کرنے کے لئے قدرت اور طاقت کا استعمال ضروری ہے اسی طرح اگر کچھ لوگ اسلامی نظام کے خلاف مظاہرہ کرنے لگیں اور معاشرہ میں بد امنی پھیلانے لگیں تو اس وقت اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی قدرت اور پولیس کے ذریعہ ان کو اپنی جگہ بٹھادے۔

قارئین کرام! ہم نے عرض کیا کہ بغیر کسی حد اور قید کے مطلق آزادی کو ایک ناقابل انکار ارزش اور اقدار کے عنوان سے بیان کرنے والے اور اس کے مقابلہ میں تشدد اور شدت پسندی کو مطلق طور پر ضد اقدار قلبند کرنے والے افراد کہتے ہیں: ”یہاں تک کہ نظام اسلامی کے مقابلہ میں قیام کرنے والوں اور تشدد اور شدت پسندوں کے مقابلہ میں؛ تشدد اور شدت پسندی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے، بلکہ پیار و محبت اور الہی و اسلامی رحمت کے ساتھ برتاؤ کیا جانا چاہئے۔“

بے شک ان لوگوں کا یہ نظریہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگر مجرموں اور خلاف ورزی کرنے والوں کے مقابلہ میں سخت رویہ نہ اپنایا جائے اور ضروری مواقع پر تشدد اور پولیس کا سہارا نہ لیا جائے تو اس طرح کے فتنہ و فساد دوبارہ بھی ہو سکتا ہے یہاں تک کہ ممکن ہے اس طرح کے برتاؤ سے دوسرے بھی ناجائز فائدہ اٹھائیں، کیونکہ اگر اس طرح کا فتنہ و فساد پیا کرنے والوں، مساجد میں آگ لگانے والوں، عورتوں کے سروں سے چادر چھیننے والوں اور مختلف مقامات پر آگ لگانے والوں نیز دہشت گردی پہلانے والوں کے مقابلہ میں اگر بیٹھے مسکراتے رہیں اور نرمی کے ساتھ برتاؤ کرتے رہیں تو گویا یہ فتنہ و فساد پہلانے والوں کے لئے ایک سبز

چراغ ہوگا اور وہ یہ سوچ سکتے ہیں کہ اس طرح کا کام دوبارہ بھی کیا جاسکتا ہے!! لہذا یہ نظریہ بالکل نادرست اور اسلام کے مخالف ہے کیونکہ اسلام کا حکم یہ ہے کہ محارب (لڑائی جھگڑا کرنے والا) اور مفسد فی الارض کے لئے سخت سے سخت سزائیں دی جائیں۔ عام طور پر حکومتی قوانین کی خلاف ورزی کرنا اور تشدد کا استعمال کرنا دو طریقہ پر ہو سکتا ہے: کبھی تو انفرادی طور پر ہوتا ہے اور کبھی اجتماعی طور پر اجتماعی طور پر اس طرح سے کہ ایک گروہ منصوبہ بندی کے ساتھ حکومت کے خلاف مسلحانہ حملہ کرتا ہے اسلامی فقہ میں اس گروہ کو ”بغاة“ اور ”اہل بغی“ (بغاوت کرنے والا) کہا جاتا ہے اسلامی جہاد کی ایک قسم اسی طرح کے لوگوں سے جہاد کرنا ہے اگر کچھ لوگ کسی گروہ کے تحت اسلامی حکومت کے خلاف مسلحانہ قیام کریں تو ان سے جنگ کرنا ضروری ہے، یہاں تک کہ اسلامی حکومت کے سامنے تسلیم ہو جائیں اور ان سے کسی طرح کی کوئی سازش نہیں کرنا چاہئے لیکن کبھی حکومت کے خلاف اس طرح کا قیام کسی خاص گروہ کے تحت نہیں ہوتا بلکہ ایک یا دو آدمی مسلحانہ حملوں کے ذریعہ معاشرہ میں بد امنی پھیلاتے ہیں اور عوام الناس کی جان و مال اور ناموس پر حملہ ورتے ہیں اور دہشت گردی پھیلاتے ہیں شریعت اسلام میں ایسے افراد کو ”محارب“ کہا گیا ہے ایسے افراد کے مقابلہ میں لشکر کشی کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ ان لوگوں کو اسلامی عدالت کے حوالہ کیا جاتا ہے تاکہ قاضی شرع ان کے بارے میں فیصلہ کرے۔

اور قاضی شرع بھی محارب اور مفسد فی الارض کے سلسلہ میں چار احکام میں سے کوئی ایک حکم لگا سکتا ہے، اور وہ چار حکم درج ذیل ہیں:

۱۔ پھانسی دینا۔

۲۔ تلوار یا بندوق کے ذریعہ موت کے گھاٹ اتار دینا۔

۳۔ مختلف سمت سے ہاتھ پیر کاٹ دینا، (یعنی داہنا ہاتھ اور بائیں پیر، یا بائیں ہاتھ اور داہنا پیر)۔

۴۔ اسلامی ملک سے نکال دینا۔

چنانچہ اس سلسلہ میں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ

خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (۴)

”بس خدا و رسول سے جنگ کرنے والے اور زمین میں فساد کرنے والوں کی سزا یہی ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے یا ان کے ہاتھ پیر مختلف سمت سے قطع کر دئے جائیں یا انہیں ارض و وطن سے نکال باہر کیا جائے، یہ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لئے آخرت میں عذاب عظیم ہے۔“

لہذا معلوم یہ ہوا کہ جو لوگ اسلامی حکومت اور نظام اسلام کے خلاف فتنہ و فساد برپا کریں وہ محارب اور مفسد فی الارض ہیں اور ان کو اسلام کے مطابق سزا دی جائے، کسی بھی صورت میں اسلامی سزا اٹھائی نہیں گئی ہیں اسلامی تمدن کے مخالف افراد کھا کرتے ہیں کہ اسلامی سزائیں اور اسلام کے احکام تشدد آمیز ہیں اور عام طور پر کسی بھی طرح کی تشدد مذموم ہے اور جیسا کہ ہم نے تشدد کی بحث میں بیان کیا کہ جس طرح مطلق آزادی صحیح نہیں ہے اسی طرح مطلق تشدد بھی محکوم اور مذموم نہیں ہے بلکہ بعض موقع پر تشدد اور غیظ و غضب کا مظاہرہ کرنا جائز اور لازم ہے، اور جو لوگ تشدد اور غیظ و غضب کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں ان کے ساتھ میں ویسے ہی تشدد اور قہر و غضب کے ساتھ جواب دیا جائے، ورنہ اگر ان کے ساتھ پیار و محبت کا برتاؤ کیا جائے تو واقعاً یہ ان کے لئے ایک سبز چراغ دکھانے کی طرح ہوگا اور وہ پھر دوبارہ بھی اس طرح کا آشوب برپا کر سکتے ہیں، اور اس طرح دوبارہ فساد پھیلانے کا راستہ ہموار ہو جائے گا۔

۴۔ سخت رویہ نہ اپنانے کا نتیجہ

گذشتہ سال ملک کے بعض مقامات پر مختصر طور پر بد امنی پھیلی، اور بعض دلائل کی بنا پر حکومتی عہدہ داروں نے یہ مصلحت دیکھی کہ بد امنی پھیلانے والوں کے ساتھ تھوڑی نرمی کے ساتھ برتاؤ کیا جائے، اور سخت رویہ نہ اپنایا جائے؛ چنانچہ آپ حضرات نے دیکھا کہ اسی نرم رویہ اپنانے کا نتیجہ تھا کہ ایک بار پھر بد امنی پھیل گئی، جس کے دردناک نتائج ناقابل برداشت تھے لہذا اگر بد امنی پھیلانے والوں اور مفسد فی الارض کے ساتھ سخت برتاؤ نہ کیا جائے اور اسلامی سزائیں ان کے حق میں جاری نہ کی جائیں تو پھر دوبارہ بد امنی نہ پھیلنے کی کوئی ضمانت نہیں ہے اور یہ بھی ضمانت نہیں ہے کہ ایک بار پھر یونیورسٹی کے ماحول سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے گا بے شک ہمارے یونیورسٹی کے طلباء مسلمان، ہوشیار اور موقع شناس ہیں اور بد امنی اور آشوب پھیلانے سے بری ہیں لیکن بعض افراد ایسے بھی موجود ہیں جو انہیں طلباء کے پاکیزہ احساسات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر پھر دوبارہ بد امنی پھیلانا چاہتے ہیں۔

لہذا اگر بد امنی پھیلانے والوں کے ساتھ سخت رویہ نہ اپنایا جائے اور بعض لوگوں کے مطابق؛ ان کے ساتھ تشدد اور شدت پسندی کا برتاؤ نہ کیا جائے تو پھر دوبارہ اس طرح کی بد امنی نہ پھیلانے کی کیا ضمانت ہے؟ لہذا توجہ رہے کہ اگر اسلامی سزائیں سخت ہیں جیسا کہ چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے یا دوسرے جرائم؛ خصوصاً محارب اور مفسد فی الارض کے لئے سخت سے سخت سزائیں معین کی ہیں، تو وہ اس وجہ سے ہیں تاکہ پھر کوئی بد امنی پھیلانے کی جرأت نہ کر سکے، اور اس طرح کے مجرم سخت سزا سے خوف زدہ رہیں کیونکہ دشمن اور مجرم کو ڈرانے کا مسئلہ اسلام کی ایک بھت بڑی حکمت ہے جس کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے، مسلمانوں اور سیاسی مسلمانوں کو اس آیت پر توجہ کرنا چاہئے، ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْحَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَأَخْرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لِاتَّعْلَمُوهُمْ اللَّهُ

يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ﴾ (۴)

” اور تم سب ان کے مقابلہ کے لئے امکانی قوت اور گھوڑوں کی صف بندی کا انتظام کرو جس سے اللہ کے دشمن، اپنے دشمن اور ان کے علاوہ جن کو تم نہیں جانتے ہو اور اللہ جانتا ہے سب کو خوفزدہ کر دو، اور جو کچھ بھی راہ خدا میں خرچ کرو گے سب پورا پورا ملے گا اور تم پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

جن موقع پر عوام الناس کی طرف سے تشدد جاتے ہیں وہ اس وقت ہے جب عوام الناس کو یہ احساس ہو جائے کہ اسلامی عہدہ داران خطرہ میں ہیں، اور اسلامی نظام کے خلاف سازش ہو رہی ہے، اور صرف اسلامی حکومت اسلامی نظام کا دفاع کرنے پر قادر نہیں ہے کیونکہ جب اسلامی حکومت کو نظام کے سلسلہ میں کسی سازش کا پتہ چل جاتا ہے تو وہ خود اپنی ذمہ داری پر عمل کرتی ہے، لیکن اگر اسلامی حکومت تنہا کافی نہ ہو تو عوام الناس کا وظیفہ بنتا ہے کہ اسلامی حکومت کی مدد کریں اور اسلامی حکومت کے عہدہ داروں کا دفاع کریں جیسا کہ آپ حضرات نے دیکھا کہ اس سال (تیر ماہ ۱۳۷۸ھ شمسی) کے دردناک حادثہ میں کس طرح کا ماحول پیدا ہو گیا، اس وقت واقعاً اسلامی نظام خطرہ میں تھا، اس وقت حکومتی قدرت اس فساد کی آگ کو بجھانے کے لئے کافی نہ تھی، لہذا عوام الناس اور بسیجی (عوامی رضا کار فوج) اس آگ کو بجھانے کے لئے آگے بڑھے اور اس کو خاموش کر دیا؛ جیسا کہ بعض حکومتی بڑے عہدہ داروں نے بھی اس بات کی وضاحت کی کہ اس شعلہ و آگ کو ہمارے بسیجیوں نے بجھایا ہے۔

لہذا اگر اسلامی نظام کے خلاف کوئی سازش ہو (جبکہ بعض لوگ اس سازش سے بے خبر رہتے ہیں) اور ہم واضح اور قطعی طور پر اس سازش کا احساس کر لیں اور اس سازش کو ختم کرنے کے لئے تشدد کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ ہو، تو اس صورت میں تشدد اور شدت پسندی کا اظہار کرنا واجب اور ضروری ہے جیسا کہ حضرت امام خمینی (رہ) نے فرمایا کہ ”اس موقع پر تقیہ کرنا حرام ہے، اور قیام کرنا چاہئے، ہرچہ باء اباد“ (چاہے کچھ بھی ہو) جس وقت خود اسلام خطرہ میں ہو اس موقع پر کسی طرح کا کوئی تقیہ جائز نہیں ہے، اور اسلام کے دفاع کے لئے اٹھ کھڑا ہونا چاہئے، یہاں تک کہ اگر ہزاروں لوگ بھی قتل ہو جائیں، اگرچہ دوسرے افراد کسی وجہ سے اس خطرہ کی طرف متوجہ نہ ہوں یا وہ اس کام میں مصلحت نہ سمجھتے ہوں، لیکن جب یقینی دلائل کے ساتھ واضح ہو جائے کہ واقعاً اسلامی نظام اور اسلامی عہدہ داروں کے لئے خطرہ ہے تو پھر عوام الناس کو ان کا دفاع کرنا واجب ہے؛ لہذا یہاں پر تشدد اور غیظ و غضب کا ظاہر کرنا واجب ہے۔

ہماری باتوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر موقع پر تشدد سے کام لیا جائے، ہم تشدد کے طرفدار نہیں ہیں بلکہ ہمارا اعتقاد تو یہ ہے کہ پیار و محبت اور مہربانی اصل ہے، اور صرف ضروری مواقع پر تشدد سے کام لیا جائے ہماری عرض تو اتنی ہے کہ جب اسلامی حکومت موجود ہو تو پھر حکومتی متعلق اداروں اور عدلیہ کے فیصلہ کے مطابق کام ہو؛ لیکن اگر کوئی مسئلہ حکومت کے ہاتھوں سے

نکل جائے اور اسلام اور اسلامی نظام کی حفاظت کے لئے تشدد کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ بچے تو اس وقت تشدد کا مظاہرہ کرنا واجب ہے۔

۵۔ تشدد کی بحث کے مقابلہ میں غیر ذمہ دارانہ رویہ

گذشتہ جلسہ میں تشدد کے سلسلہ میں مطالب بیان کرنے کے بعد بعض مغرب پرست اخباروں نے ہمارے اوپر اعتراضات کئے اور بھت سے مقالات اخباروں میں چھپے حقیر اس سلسلہ میں ان تمام افراد کا شکر گزار ہے جنہوں نے ہماری موافقت یا مخالفت میں گفتگو کی یا مقالہ لکھا کیونکہ ہمارا تو یہ نظریہ ہے کہ اخباروں میں اس طرح کی باتوں پر نقد و تنقید کوئی نقصان دہ نہیں ہوتی؛ بلکہ اس طرح سے بات بالکل صاف ہو جاتی ہے تاکہ عوام الناس اپنے عقائد کو راسخ تر کر لیں، اور اپنے وظیفہ کو بہتر طور پر سمجھ لیں لیکن شرط یہ ہے کہ ایک طرف کی بات سن کر فیصلہ نہ کیا جائے اور دونوں طرف کی مکمل باتوں کو پیش کیا جائے لیکن افسوس کے ساتھ عرض کیا جاتا ہے کہ بعض لوگوں نے ہماری باتوں کو کاٹ چھانٹ کر بعض عہدہ داروں تک پہنچائی جن کی وجہ سے وہ پریشان ہو گئے اور جلد بازی میں ہمارے خلاف فیصلہ کرنے لگے۔

ہمیں دوسروں سے یہ امید نہیں ہے کہ وہ ہماری باتوں کی تائید کریں اسی طرح ان سے کسی طرح کا کوئی خوف بھی نہیں ہے ہم اپنی شرعی اور الہی ذمہ داری پر عمل کرتے ہیں، اگر کسی کو اچھا لگے تو بہتر، ورنہ ہم نے اپنی ذمہ داری پر عمل کر دیا ہے اور خدا پر بھروسہ کیا ہے، ہمیں کسی کی توہین یا دھمکی کا کوئی خوف نہیں ہے لیکن جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ سب کی باتوں کو کشادہ دلی کے ساتھ سننا چاہئے؛ ان سے یہ امید تھی کہ ہماری باتوں کو سنتے اور شاید ہماری پوری بات کو سننے کے بعد ان کو مان بھی لیتے اور اگر ہماری بات کو قبول بھی نہ کرتے تو اس کا جواب دلیل و منطق اور اصول کے تحت دیتے، نہ یہ کہ نامناسب الفاظ سے ہمیں نوازا جاتا۔

افسوس کہ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم ان تمام لوگوں کو تحریری جواب دیں جنہوں نے تقریروں، اخباروں اور مقالوں میں اظہارِ محبت کی اور ہمارے نفع یا ہمارے نقصان میں کچھ بیان کیا اور ان دو ہفتوں میں سیکڑوں مقالے لکھے، اسی طرح ان سب کو الگ الگ زبانی جواب دینے کی بھی فرصت نہیں ہے لہذا ان کو جواب نہیں دیتے، ہمیں امید ہے کہ ان سب کا یہ کام خوشنودی خدا کے لئے ہوگا۔

ہم اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ کے لئے ضروری چیزوں کو دلائل اور برہان کے ساتھ بیان کریں، لیکن اگر کسی کو اچھا نہ لگے تو وہ منطق اور دلیل کے ساتھ اس کا جواب دے۔

۶۔ قرآن مجید میں لفظ ”تشدد“ کے ہم معنی لفظ کی تحقیق

قارئین کرام! ہم یہاں پر ضروری سمجھتے ہیں کہ تشدد کے سلسلہ بیان شدہ باتوں کا خلاصہ کمزیریں: ”تشدد“ عربی لفظ ہے اور فارسی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی سختی سے پیش آنے کے ہیں، اس کے مقابلہ میں لفظ ”لین“ ہے جس کے معنی ”زرمی“ کے ہیں قرآن مجید میں لفظ ”لین“ کے مقابلہ میں لفظ ”تشدد“ کا استعمال نہیں ہوا ہے، بلکہ لفظ ”غلظت“ استعمال ہوا ہے؛ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں (تشدد اور غلظت) مترادف (ہم معنی) الفاظ ہیں جیسا کہ فارسی (یا کسی دوسری زبان) میں مترادف الفاظ ہوتے ہیں، اسی طرح عربی زبان میں بھی بھت سے مترادف الفاظ ہوتے ہیں، قرآن مجید میں کبھی ان دو مترادف الفاظ میں سے ایک لفظ استعمال ہوا ہے اور کبھی کبھی دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور کبھی دو الفاظ میں سے ایک خاص معنی میں استعمال ہوا ہے، مثال کے طور پر لفظ ”قلب“ سے ایک معنی مراد ہوتے ہیں اور لفظ ”فواد“ سے دوسرے معنی، (جبکہ دونوں کے معنی ”دل“ کے ہیں) اور کبھی کبھی ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ استعمال ہوا ہے قرآن مجید میں لفظ ”لین“ (زرمی) کے مقابلہ میں لفظ ”غلظت“ استعمال ہوا ہے، جیسا کہ خداوند عالم نے پیغمبر اکرم سے خطاب فرماتا ہے:

﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظًا لَّفُتْنَا الْقَلْبَ لِأَنفَضُوا مِنْ حَوْلِكَ ۗ ﴾ (۵)

”پیغمبر یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم رہو ورنہ اگر تم بد مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے“

فارسی میں لفظ ”غلظت“ سختی کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا، بلکہ ہماری زبان میں اس لفظ کو ”بھنے والی“ چیزوں میں استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً کھا جاتا ہے کہ خرمے کا رس ”غلیظ“ ہے، یعنی سخت ہے، اور لفظ ”غلظت“ جس کے مقابلہ میں لفظ ”لین“ ہے؛ اس کے ہم معنی لفظ ”تشدد“ ہے جس کے سلسلہ میں ہم نے بحث کی ہے، اور کھا کہ تشدد مطلق طور پر مذموم نہیں ہے، بلکہ بعض مواقع پر نہ صرف یہ کہ مذموم نہیں ہے بلکہ ضروری اور واجب بھی ہے۔

۷۔ مغربی اور اسلامی نظریں تحمل اور ٹولرانس کے معنی

قارئین کرام! ہم نے آزادی کے سلسلہ میں عرض کیا کہ ہمارے سیاسی اور ادبی معاشرہ میں کئے جانے والے آزادی کے معنی لفظ لبرلیزم "Liberalism" کا ترجمہ ہے جس کا رواج مغربی ممالک میں بھت زیادہ ہے اسی طرح لفظ ”تحمل“ (کسی کی بات کو برداشت کرنا) جو لفظ ”تشدد“ کے مقابلہ میں استعمال کیا جاتا ہے یہ انگلش لفظ ٹولرانس "Tolerance" کے ہم معنی ہیں جس کے معنی تحمل اور برداشت کرنا ہیں بھر حال چونکہ یہ دونوں الفاظ مغربی ممالک میں بھت زیادہ رائج ہیں البتہ اس چیز میں کوئی ممانعت بھی نہیں ہے کہ اگر کسی دوسری زبان کا لفظ واضح اور شفاف معنی رکھتا ہو تو اس کو ”ہو بھو“ یا اس کے ہم

معنی کوئی دوسرا لفظ اپنی ادبیات میں شامل کر لیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں البتہ اس نکتہ پر توجہ رہے کہ کبھی کبھی دوسری زبان کے یہ الفاظ بھت سی حد و قید رکھتے ہیں اور خاص الخاص معنی رکھتے ہیں نیز اسی زبان کے ماحول سے اس کے معنی کئے جاتے ہیں یعنی جب کسی زبان میں کوئی لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس کے مثبت یا منفی معنی ہوتے ہیں لیکن اگر اسی کو کسی دوسری زبان میں لے جا کر معنی کئے جائیں تو اس کے معنی بدل جاتے ہیں یا اس کے معنی بالکل برعکس ہو جاتے ہیں، مثال کے طور پر:

یہی لفظ ”آزادی“ جو مغربی تمدن سے ہماری زبان میں وارد ہوا ہے؛ مغربی ممالک میں اس کے بھت زیادہ وسیع معنی ہیں اور جنسی مسئلہ میں کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جب کہ ہمارے معاشرہ میں ایسا نہیں ہے، اور یہ معنی ہمارے معاشرہ بلکہ دوسرے اسلامی معاشرہ میں بھی قابل قبول نہیں ہیں، لہذا ہم اسلامی اور قومی اقدار کی بنا پر مجبور تھے کہ اس آزادی میں کچھ قید و شرط کا اضافہ کریں اور جائز آزادی نیز اسلامی قوانین کے مطابق آزادی کو قبول کر لیں، لہذا واضح طور پر یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم ”مطلق آزادی“ کو نہیں مانتے اسی طرح ”تشدد“ کے وہ معنی جو ہماری زبان میں وارد ہو گئے ہیں اور مغربی ممالک میں اس کو مطلقاً قابل مذمت گردانتے ہیں؛ جب کہ ہم اس کو بطور مطلق ضد اقدار نہیں سمجھتے، جس طرح سے مطلق آزادی کو نہیں مانتے بلکہ ہم منطق اور اصول سے خالی تشدد جو انسانی اخلاق کے مخالف ہو؛ اس کو مذموم مانتے ہیں، اور ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ بعض مواقع پر تشدد؛ عقل کا تقاضا اور معاشرہ کے منافع کو پورا کرنے والی ہے، لہذا اس وقت اس میں کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔

لہذا جب لفظ ٹولرانس "Toleranc" انگلش سے نکل کر ہماری زبان میں داخل ہوا، تو اس کو مطلق طور پر قبول کرنے سے پہلے اس کے صحیح معنی پر توجہ کریں اور یہ دیکھیں کہ مغربی ممالک میں اس کے کیا کیا مثبت یا منفی پہلو ہیں، اور اس کے پشت پردہ کیا راز پوشیدہ ہے اور کس مقصد کے تحت ہماری سیاسی ادبیات میں داخل ہوا ہے؟ نیز یہ دیکھیں کہ اس کے منتقل ہونے کے بعد اس کے معنی میں کیا کچھ تبدیلی پیدا ہوئی ہے یا نہیں؟

لفظ ٹولرانس کا مفہوم مغربی ماڈرن تمدن کا ایک تحفہ ہے جو ”رنسانس“ کے زمانہ بعد سے اہستہ اہستہ رائج ہوتا چلا گیا ہے اور آج کل مغربی ممالک میں بے دینی تمدن کی ایک واضح پہچان ہے (توجہ رہے کہ ہم نے اس سے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ جب ہم مغربی تمدن کا نام لیتے ہیں تو اس سے مراد ان ممالک میں رہنے والے تمام لوگوں کا تمدن نہیں ہے؛ کیونکہ وہاں پر بھت سے دیندار مسلمان بھی موجود ہیں، بلکہ ہماری مراد مغربی ممالک میں حکمران تمدن ہے جس کے مخالف بھی خود انہیں ممالک میں بھت زیادہ پائے جاتے ہیں۔)

اس لفظ ٹولرانس "Toleranc" کی تحقیق کے سلسلہ میں مزید عرض کرتے ہیں:

اولاً: مغربی ممالک میں حکمران تمدن میں تمام اقدار (چاہے وہ اخلاقی اقدار ہوں یا اجتماعی اقدار یا حقوقی اور سیاسی) اعتباری امور ہیں اور ان کی کوئی عقلانی اور واقعی حقیقت نہیں ہے دوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ اقدار کا تعلق عوام الناس کی مرضی اور ان کے سلیقہ پر ہوتا ہے کیونکہ کسی چیز پر اعتقاد رکھنا سب کے لئے اور سب جگہ پر اقدار نہیں کھلاتا بلکہ مغربی ممالک کی نظر میں اقدار اس وقت اقدار ہے جب معاشرہ اس کو قبول کرے، لیکن اگر ایک زمانہ میں عوام الناس کا سلیقہ بدل جائے تو یہی اقدار ضد اقدار میں بدل جائے گا۔

ثانیاً: یہ لوگ اسلامی اعتقاد کو اسی اعتباری اقدار کے ہم پلہ قرار دیتے ہیں، اور انسان کو یہ اختیار دیتے ہیں کہ چاہے وہ ان کو قبول کرے یا ترک کر دے، گویا دینی عقائد کو بھی ایک سلیقہ کی طرح قرار دیتے ہیں:

جس طرح انسان اپنے سلیقہ کی بنا پر اپنے لباس کا رنگ اختیار کرتا ہے مثلاً کوئی نیلا رنگ پھینا چاہتا ہے اور کوئی کالا رنگ، جبکہ کسی کو یہ نہیں کھا جاسکتا کہ تم اس رنگ کو کیوں انتخاب کرتے ہو؟! اور نہ ہی اس کے اس کام پر مذمت کی جاسکتی ہے کیونکہ ہر شخص اپنے سلیقہ میں مختار اور آزاد ہے، اسی طرح یہ لوگ دین کو بھی اپنے سلیقہ کی بنا پر اختیار کرتے ہیں، اس کے بارے میں یہ نہیں کھا جاسکتا کہ تو نے اس دین کو کیوں انتخاب کیا اور اس دین کو کیوں انتخاب نہیں کیا، اور کیوں فلاں دینی عقیدہ کی توہین کرتے ہو اور اس کو نفی کرنے کی کوشش کرتے ہو اور اس سے بھی بالاتر اگر کسی نے اپنے دینی اعتقادات کو بالائے طاق رکھ دیا اور کسی دوسرے مذہب میں داخل ہو گیا تو اس کی بھی مذمت نہیں کی جاسکتی، کیونکہ عقیدہ بدلنا بھی ایک سلیقہ کی طرح ہے جو کسی بھی وقت بدلا جاسکتا ہے!

لیکن اسلامی نقطہ نظر سے دینی مقدسات اور اسلامی اقدار؛ جان و مال اور ناموس سے بھی زیادہ مہم ہے وہ اسلام جو ہمیں اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ مال کی حفاظت کے لئے جان کی حد تک دفاع کر سکتے ہیں (یعنی جب تک جان جانے کا خطرہ نہ ہو اس وقت تک اس کی حفاظت ضروری ہے، لیکن اگر مال کی خاطر جان جانے کا خطرہ ہو تو اس وقت اس مال کو جان پر قربان کر دیا جائے) کیا وہ اسلام دینی مقدسات کے دفاع کی اجازت نہ دے گا؟ (اگرچہ شورامی شہر تھران کے ایک نمائندہ نے اس بات کی بھی اجازت دیدی ہے کہ خدا کے خلاف بھی مظاہرہ کیا جاسکتا ہے) لیکن تمام مراجع تقلید کے فتوای کی بنا پر اور شیعہ و سنی اجماع کی بنا پر تمام مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کوئی شخص ایک جنگل اور بیابان میں کہ جہاں پر کوئی موجود نہ ہو؛ خدا، رسول، مقدسات اسلامی اور دین اسلام کی ضروریات کی توہین کرے، اور اس کو پولیس یا عدلیہ کے حوالہ کرنے کا کوئی امکان نہ ہو تو ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اس کو اسلامی مقدسات کی توہین کی بنا پر قتل کر دے اور اسی اسلامی نظریہ کی بنا پر حضرت امام خمینی (رہ) نے مرتد سلمان رشدی کے قتل کا فتویٰ صادر فرمایا جس کی تمام شیعہ سنی علماء نے تائید کی مغربی تمدن سے ہمارا نقطہ اختلاف یہی ہے جس کو اسلام قبول کرتا ہے لیکن مغربی کلچر نہیں مانتا۔

ہمارا دینی وظیفہ اور دینی غیرت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اسلامی مقدسات کی توہین ہوتے ہوئے خاموش بیٹھے دیکھتے رہیں، اسلام نے دینی مقدسات کی توہین کے مقابلہ کے لئے تشدد کو جائز قرار دیا ہے جب اسلام ہمارے نزدیک اپنی جان و مال اور اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہے تو ہم اس کی حفاظت اور دفاع کے لئے اپنی جان کو بھی خطرہ میں ڈال سکتے ہیں لہذا اگر کوئی اسلامی مقدسات کی توہین کرے تو ہر انسان اس کو سزا دے سکتا ہے یہاں تک کہ اگر اس کو یہ بھی احتمال ہو کہ کل اسے (اسی قتل کی بنا پر) گرفتار بھی کیا جاسکتا ہے اور اس کے خلاف کارروائی کی جاسکتی ہے کہ تجھے اس قتل کا کوئی حق نہیں تھا، اور وہ مقتول کے ”مہدور الدم“ (یعنی قتل جائز) ہونے کو ثابت نہ کر سکتا ہو جس کے نتیجہ میں اس پر قصاص یا سزائے موت کا فیصلہ دیا جائے، تو اس صورت میں بھی وہ اپنے دینی وظیفہ پر عمل کر سکتا ہے اور اسلام کی توہین کرنے والے کو سزائے اعمال تک پہنچا سکتا ہے، مگر یہ کہ اس کے قتل کرنے سے مزید فساد پھیلنے کا خطرہ ہو۔

حوالے:

(۱) مشروطیت اس شاہی حکومت کو کھتے ہیں جس میں قوانین کے تحت کام کیا جائے (مترجم)

(۲) طرفداران انسانیت، تہذیب، اخلاق اور انسانی فکری رشد اور مذہبی اختلافات کو دور کرنے والوں کو فرامانسون کھا جاتا ہے (مترجم)

(۳) سورہ مائدہ آیت ۳۳

(۴) سورہ انفال آیت ۶۰

(۵) سورہ آل عمران آیت ۱۵۹

انتالیسواں جلسہ

دینی عقائد و اقدار کے نسبی ہونے کے نظریہ کی تحقیق و بررسی

۱۔ دینی مسائل کو مطلق یا نسبی قرار دینا

قارئین کرام! ہم نے گذشتہ دو سال میں ”اسلامی سیاسی نظریات“ کے بارے میں گفتگو کی گذشتہ سال اسلامی نقطہ نظر سے ”قانون اور قانون گذاری“ کے سلسلہ میں بحث کی اور اس سال میں ”کشور داری“ (حکومت اور اس کی ذمہ داریوں) کے بارے میں بحث کر رہے ہیں اور ہم نے اپنی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ بعض چیزوں کے لئے عقلی دلائل کا ہونا ضروری ہیں اور اکثر چیزیں آیات و روایات کی طرف مستند ہونا چاہئیں اسی وجہ سے ہماری بحث ایک ”تلفیقی“ بحث ہیں یعنی ہماری بحث میں نہ صرف عقلی دلائل ہیں اور نہ صرف شرعی اور تعبدی، بلکہ قارئین کرام کے لحاظ سے جو طریقہ بھی مناسب ہوتا ہے جس سے بات کو آسان طریقہ سے سمجھایا جاسکتا ہے؛ اسی لحاظ سے بیان کرتے ہیں، چاہے وہ عقلی دلائل ہوں یا شرعی۔

چاہے ہم عقلی دلائل کے ذریعہ کسی چیز کو ثابت کریں اور چاہے شرعی دلائل کے ذریعہ کسی چیز کے بارے میں بحث کریں، دونوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن چیزوں کو ہم اپنی بحث میں ثابت کرتے ہیں کیا وہ سب کے نزدیک معتبر اور حجت ہیں؟ یعنی مطلق طور پر اعتبار رکھتے ہیں، یا مطالب اور اقدار نسبی ہوتے ہیں اور صرف کہنے والے کے نظریہ کو بیان کرتے ہیں، اور ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں دوسروں کا ایک الگ نظریہ ہو جو اس کے مطابق نہ ہو؟ دوسرے الفاظ میں یوں عرض کیا جائے کہ ایک مسلمان، یا شیعہ اور مکتب اہل بیت علیہم السلام کا تابع شخص ہمارے دلائل کے ساتھ بیان پیش کردہ مطالب کو قبول کرتے ہیں اور ان کو مطلق طور پر مانتے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ یہ صرف ایک خاص نظریہ کو بیان کرنے والے ہیں جس کے مقابلہ میں دوسرے بھی نظریات پائے جاتے ہیں جو اعتبار کے لحاظ سے ان کے برابر یا اس سے بالاتر ہو سکتے ہیں؟

بعض اخباروں اور تقریروں میں کہا جاتا ہے کہ ان مطالب اور نتائج کو مطلق طور پر بیان نہیں کرنا چاہئے اور یہاں تک بھی کھ دیتے ہیں کہ ان مطالب کی نسبت اسلام کی طرف نہیں دینا چاہئے؛ اور صرف کہنے والے کا نظریہ ماننا چاہئے یعنی کہنے والا کھتا ہے کہ اسلام سے میرا حاصل کردہ نتیجہ یہ ہے، نہ یہ کہ اپنے حاصل کردہ نظریہ کو اسلامی نظریہ کے عنوان سے بیان کریں اس طرح کی گفتگو خصوصاً گذشتہ ہفتہ میں آپ حضرات نے بھت سنی ہوگی کھ: کسی بھی شخص کو اپنی سمجھ کو مطلق قرار نہیں دینا چاہئے، کیونکہ بعض افراد ایسے بھی ہیں جو اس کے علاوہ بھی فہم اور نتیجہ رکھتے ہیں اور ان کا ایک الگ اعتبار اور اہمیت ہے۔

۲۔ معرفت کے نسبی ہونے کے سلسلہ میں تین نظریات

یہاں پر چند مہم سوال پیدا ہوتے ہیں کہ ”مطلق“ اور ”نسبی“ الفاظ کے معنی کیا ہیں؟ مثلاً ”فلاں مطلب اعتبارِ مطلق نہیں رکھتا“ یعنی چھ؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی معرفت اعتبارِ مطلق نہیں رکھتی؟ اور اس صورت میں مطلق اور نسبی معرفت میں کیا فرق ہے؟ اور کیا معرفت کا نسبی ہونا یا اعتبارِ معرفت کا نسبی ہونا صرف دینی مسائل سے متعلق ہے؟ یا کسی بھی علم کا کوئی بھی مطلب اور واقعہ نسبی ہوتا ہے؟

الف: معرفت کے نسبی ہونے پر پہلا نظریہ

معرفت کے مطلق یا نسبی ہونے کی تحقیق ایک فلسفی مسئلہ ہے جس کو اپیسٹمولوجی "Epistemology" (معرفت شناسی) کہا جاتا ہے قدیم زمانہ سے تقریباً ۲۵ صدی پہلے دانشوروں کے درمیان یہ اختلاف تھا کہ انسانی معرفت، اس کے اعتقادات اور اس کی قضاوت (فیصلے) کیا ”اعتبارِ مطلق“ رکھتے ہیں یا ”اعتبارِ مطلق“ نہیں رکھتے یہ سوفسطائی لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے یونان میں زندگی بسر کرتے تھے اور لفظ ”سفسطہ“ (یعنی مغالطہ) انہیں کے نام سے لیا گیا ہے، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان کو کسی بھی بات پر کوئی جزم و یقین حاصل ہو ہی نہیں سکتا، اور ہر چیز قابل شک و تردید ہے لہذا ان کے بعد سے تمام شکاک فرقے اور آگنوسٹیسٹ "Agnostic"، نسبی گریان اور رلٹویسٹس "Relativists" اس طرح کا نظریہ رکھتے ہیں المختصر: معرفت کے نسبی ہونے کا نظریہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے، بلکہ قدیم زمانہ سے فلسفہ کی تاریخ میں موجود ہے اگرچہ آج کل جہان اسلام میں بھت ہی کم شکاک افراد ہوں گے، لیکن امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں شکاک اور نسبت گرا لوگوں کی بھرمار ہے بلکہ وہاں پر شکاک ہونا انسانی افتخار میں سمجھا جاتا ہے!

اور اگر ہم معرفت کے نسبی ہونے (یعنی انسان کو کسی بھی چیز کے بارے میں یقین حاصل نہیں ہو سکتا) اور شکاکیت کے بارے میں ایکڈمیک طریقہ پر تحقیق کریں تو اس وسیع بحث کی تحقیق کے لئے ایک طولانی زمانہ درکار ہے لیکن ہم یہاں پر مختصر طور پر ایک اشارہ کرتے ہیں۔

جو لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ آپ اپنی سمجھ اور نظریہ کو مطلق تصور نہ کریں، تو کیا ان کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی چیز کے بارے میں یقینی طور پر اعتقاد پیدا نہیں ہو سکتا، اور حقیقت میں انسان کے لئے معرفت حاصل کرنے کا دروازہ بند ہے، اور ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ منطقی اور اصولی طور پر اس پر یقین حاصل ہو سکے، یا ان کا مطلب یہ ہے کہ بعض عقائد اور بعض چیزوں کی یقینی طور پر معرفت حاصل کر سکتے ہیں؟ ”منطقی“ کی قید لگانے کی وجہ یہ ہے کہ کبھی انسان کسی چیز کے بارے میں یقین رکھتا ہے

اور کسی طرح کا کوئی شک اس کے ذہن میں نہیں ہوتا، لیکن ایک مدت کے بعد متوجہ ہوتا ہے کہ اس نے غلطی کی ہے؛ ایسا یقین جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی ”نفسیاتی یقین“ کھا جاتا ہے یعنی انسان یونہی کسی چیز پر یقین کر لیتا ہے اور اس میں کسی طرح کا کوئی شک نہیں ہوتا، اگرچہ اس کا یقین غلط ہو اور جھل مرکب (نہ جاننے کے بارے میں نہ جاننا) کا شکار ہو، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرح کا اعتقاد و یقین باطل ختم ہو جاتا ہے مثال کے طور پر دو اور دو کا چار ہونا ایک صحیح منطق ہے کیونکہ دنیا کے کسی بھی گوشہ میں دو اور دو پانچ یا چہ نہیں ہوتے پس اس حساب کا اعتبار مطلق ہے اور منطقی طور پر صحیح ہے، یہ ایک ذاتی نظریہ نہیں ہے، بلکہ سبھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔

اگر ان لوگوں کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو کسی بھی چیز اور واقعہ میں یقینی اعتقاد حاصل نہیں ہو سکتا، اگرچہ اس فلسفی بحث میں بھت زیادہ نظریات پائے جاتے ہیں اور اس جلسہ کی وسعت سے باہر ہیں، بس مختصر طور پر عرض کرتے ہیں کہ ان کا نظریہ نہ صرف یہ کہ انسانی فطرت سے ہم اہنگ نہیں ہے اور نہ ہی دنیا کے کسی بھی مذہب میں اس کو قبول کیا جاتا ہے اصولی طور پر یہ بات قابل یقین نہیں ہے کہ دنیا بھر میں کوئی عاقل انسان کھے: میں نہیں جانتا کہ کرہ زمین موجود ہے یا نہیں؟ شاید اس کے بارے میں صرف خیال کے علاوہ کچھ نہ ہو! یا کھے کہ میں نہیں جانتا کہ کرہ زمین پر کوئی انسان زندگی بسر کرتا ہے یا نہیں؟ یا مجھے شک ہے کہ یورپ میں کوئی ملک فرانس بھی ہے یا نہیں، اور آیا میرا بھی کوئی وجود ہے یا نہیں، اور یہ تمام چیزیں کسی بھی طریقہ سے قابل اثبات نہیں ہیں! اور اگر ہماری ملاقات اس طرح کے آدمی سے ہو تو ہم اس کے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے؟ یقیناً اس سے کھیں گے کہ کسی نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس جاؤ، کیونکہ ایسا شخص عقلی لحاظ سے صحیح و سالم دکھائی نہیں دیتا پس اگر ان لوگوں کا مطلب یہ ہے (جو کہتے ہیں: اپنی سمجھ اور اپنے نظریہ کو مطلق نہ سمجھیں) کہ کسی بھی عقیدہ اور یقین کو مطلق نہیں سمجھنا چاہئے اور کسی بھی واقعہ کے بارے میں دقیق قضاوت اور مطلق نظریہ قائم نہیں کیا جاسکتا تو ان کا مختصر جواب یہ ہے کہ ان کا اس طرح کا دعویٰ کرنا عقل اور تمام ادیان کے بالکل خلاف ہے اور ہمارے گمان کے مطابق ہمارے قارئین میں اندرون ملک یا بیرون ملک کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جو اس طرح کا احتمال دے؛ لہذا اس سلسلہ میں بحث و گفتگو کرنا بے کار اور بے فائدہ ہے۔

ب۔ معرفت کے نسبی ہونے پر دوسرا نظریہ

البتہ معرفت کے نسبی ہونے کے سلسلہ میں دوسرے نظریات بھی پائے جاتے ہیں جو مذکورہ بالا نظریہ کی طرح مضحکہ خیز نہیں ہے، انھی نظریات میں سے ایک نظریہ یہ ہے: جو افراد اس طرح کا نظریہ رکھتے ہیں وہ یہ نہیں کہتے کہ کسی بھی علم میں یقینی اور مطلق چیزیں موجود نہیں ہیں؛ بلکہ ان کے عقیدہ کے لحاظ سے علوم تجربی، علوم عقلی اور ریاضیات میں ایک حد تک یقینی، قطعی اور مطلق چیزیں موجود ہیں، اور صرف علوم عملی (یعنی اقداری علوم، احکامات اور وظائف) نسبی ہیں یعنی جہاں پر خوب و بد اور

”بایدھا ونبایدھا“ (کرنا چاہئے اور نہ کرنا چاہئے) بیان ہوتے ہیں، تو یہ چیزیں نسبی ہوتی ہیں چنانچہ اقدار اور وظائف کو نسبی قرار دینے والوں نے اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے دل فریب اور گمراہ کن چیزیں بیان کیں ہیں مثال کے طور پر کہتے ہیں: ہم دیکھتے ہیں کہ کسی ایک ملک میں کسی کام کو اچھا سمجھا جاتا ہے جبکہ دوسرے ملک میں اسی کام کو ناپسند اور برا سمجھا جاتا ہے دنیا بھر کے ممالک میں کسی ایک ملک کے آداب و رسوم کو اسی ملک میں اچھا سمجھا جاتا ہے اور ہو سکتا ہے دوسرے ملک میں انہیں ناپسند اور برا سمجھا جائے، اور ان سے عوام الناس نفرت کرتے ہوں۔

کسی کے احترام و اکرام کے بارے میں (جیسا کہ ہم نے سنا ہے کہ) مشرقی ایشیاء کے بعض ممالک میں جب کسی کا بھت زیادہ احترام و اکرام کرتے ہیں تو ایک دوسرے کو بُو کرتے ہیں، جبکہ یہی کام دوسرے ملکوں میں ناپسند اور برا سمجھا جاتا ہے، اسی طرح مغربی ممالک خصوصاً امریکہ میں جب کسی کی تقریر یا باتیں سننے کے بعد اس کا احترام کرتے ہیں تو اس کے چہرے کے بوسے لئے جاتے ہیں اور اس میں فرق نہیں ہے کہ چاہے وہ عورت ہو یا مرد جبکہ ہمارے اسلامی معاشرہ میں کسی نامحرم عورت کے بوسے لینا بھت بُرا سمجھا جاتا ہے پس ممکن ہے کہ بعض معاشرہ میں کسی ایک کام کو اچھا سمجھا جاتا ہو لیکن دوسرے معاشرہ میں اسی کام کو ناپسند اور بُرا سمجھا جاتا ہو، یہاں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خوب و بد اور بایدھا و نبایدھا نسبی ہیں، اور ان کے بارے میں مختلف ممالک اور معاشروں میں الگ الگ حکم لگایا جاتا ہے، یہاں تک کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی معاشرہ میں بعض چیزیں ایک زمانہ میں اچھی مانی جاتی ہوں اور ایک زمانہ میں ناپسند اور بُری سمجھی جاتی ہوں۔

بعض مغربی ممالک میں ثقافتی اور اخلاقی برائیاں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں، حالانکہ تقریباً تیس یا چالیس سال پہلے اگر کوئی شخص ٹی شرٹ میں باہر نکلتا تھا تو پولیس اس کو روکتی تھی ہم سے ایک صاحب نے نقل کیا کہ کناڈا کے ایک شہر میں تقریباً ۴۰ سال پہلے ایک شخص گرمی کی وجہ سے اپنا کوٹ اتار کر ٹی شرٹ میں چھل قدمی کرنے لگا، تو فوراً گھوڑ سوار پولیس نے اس پر اعتراض کیا کہ تم اپنا کوٹ اتار کر کیوں گھوم رہے ہو، عام مقامات پر ٹی شرٹ میں آنا ”شرم و جیا“ کے خلاف ہے! لیکن آج اسی کناڈا میں اگر عورت مرد نیم عریاں بھی سڑکوں پر دکھائی دینے لگیں تو کوئی کچھ نہیں کہتا اور اس کام کو برا نہیں سمجھا جاتا لہذا خوب و بد اور اچھائی برائی؛ زمانہ کے لحاظ سے بھی مختلف اور نسبی ہیں لہذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ علوم جن میں خوب و بد اور بایدھا اور نبایدھا کو بیان کیا جاتا ہے؛ جیسے علم اخلاق، علم حقوق یا اجتماعی اور انفرادی زندگی سے متعلق دوسرے علوم سب نسبی ہیں اور ان کے درمیان کوئی مطلق معیار موجود نہیں ہے، اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں چیز ہر جگہ مطلقاً اچھی ہے یا فلاں چیز ہر موقع پر مطلقاً بُری ہے۔

قارئین کرام! ان لوگوں کی پیش کی جانی والی دلیل یہی ہے جس کو ہم نے بیان کیا، البتہ بعض دوسری دلیلیں بھی بیان کرتے ہیں جن کو یہاں پر بیان کرنے کی فرصت نہیں ہے۔

۳۔ بعض اقدار کا مطلق اور ثابت ہونا

مطلب کی وضاحت کے لئے عرض کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ ہر اقداری مفہوم، حلال و حرام اور بدی اور خوبی مطلق ہے، تو اس کے دعویٰ کو باطل کرنے کے لئے یہ کہنا کافی ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ایک معاشرہ میں اچھی ہو اور وہی چیز دوسرے معاشرہ میں بری ہو ایک جگہ اس کو اقدار میں شمار کیا جاتا ہو اور دوسری جگہ ضد اقدار حساب کیا جاتا ہے دوسرے الفاظ میں یوں کھا جائے کہ وہ گذشتہ دعویٰ جس کو ”موجبہ کلیہ“ کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے یعنی تمام اچھائیاں اور برائیاں؛ مطلق اور کلی ہیں، اسی چیز کو ”سالبہ جزئیہ“ کے عنوان سے بھی پیش کیا جاسکتا ہے، جس کی بنا پر وہ دعویٰ اور ”حکم کلی“ نقض ہو جاتا ہے یعنی جب ہم نے ان اقداری چیزوں کو دیکھ لیا جو مطلق نہ تھے، اور بعض معاشرہ میں وہ اچھی اور بعض دوسرے معاشرہ میں ناپسند اور بری سمجھی جاتی ہوں، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے تمام اقدار اور قضایا مطلق ہوں، بلکہ بعض اقداری قضایا نسبی ہیں بے شک یہ فیصلہ صحیح اور درست ہے، اور ہم بھی یہ نہیں کہتے کہ تمام اقداری مسائل اور تمام بایدہا اور نبایدہا مطلق اور کلی ہیں اور ہر معاشرہ کے لئے ہمیشہ ثابت اور غیر قابل تبدیلی ہیں ہم بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ بعض احکام متغیر اور موقع و محل کے لحاظ سے ہیں؛ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کوئی بھی اقدار مطلق نہیں ہے یعنی اقداری نسبت کا اثبات ”سالبہ جزئیہ“ ہے نہ کہ ”سالبہ کلیہ“ لہذا اس بنیاد کی بنا پر ہم کم ہی اقداری مسائل کے بارے میں مطلق یا نسبی ہونے کو ثابت کر سکتے ہیں

ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارے پاس مطلق اقداری چیزیں موجود ہیں اور بھت سے اقداری مسائل پر مطلق اعتقاد رکھ سکتے ہیں اور اگر یہ نظریہ ثابت ہو جائے، تو پھر ہم اس کی سیکڑوں مثال پیش کر سکتے ہیں، چونکہ عقلی بحث اور عقلی نظریات کا دار و مدار عدد اور اگنتی پر نہیں ہوتا کیا آپ حضرات کو کوئی ایسا شخص مل سکتا ہے جو یہ کہے کہ عدالت ایک معاشرہ میں پسندیدہ اور دوسرے معاشرہ میں ناپسند اور بری ہے؟ اور کیا کوئی ایسا عاقل انسان مل سکتا ہے جو کہے کہ ظلم بعض مقامات پر صحیح اور پسندیدہ ہے؟ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ظلم اور عدل کے مصداق میں غلطی ہو جائے اور الفاظ کا غلط استعمال کریں مثال کے طور پر کوئی یہ ہے کہ کسی بھی شخص کو مارنا ظلم ہے، جبکہ بعض لوگوں کو سزا کے عنوان سے مارا جاتا ہے اور اس کو قصاص کی بنا پر مارنا برا نہیں ہوتا، بلکہ حق و عدل کے عین مطابق ہے نکتہ یہ ہے کہ اگر واقعاً کوئی کام ظلم ہو، تو پھر وہ دوسرے مقام پر اچھا نہیں کھلایا جاسکتا، یا اگر کوئی کام واقعاً عدل کے مطابق ہو تو وہ بعض مقامات پر برا نہیں ہو سکتا اور بعض مقامات پر عدل کو برا نہیں سمجھا جاسکتا اور یہ مسئلہ اس قدر واضح اور سبھی کو معلوم ہے کیونکہ جب قرآن مجید عوام الناس کو شرک سے پرہیز کرنے کے لئے کہتا ہے تو آواز دیتا ہے:

﴿ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴾ (۱)

”بے شک کہ شرک بھت بڑا ظلم ہے۔“

یعنی اس کبریٰ (کہ ”ہر وہ چیز جو ظلم ہے اس سے دوری اور اجتناب کیا جائے“); میں کوئی شک و تردید نہیں ہے، اور یہ قضیہ؛ مطلق، کلی، ثابت اور غیر قابل تبدیلی ہے، کیونکہ شرک ظلم کا ایک مصداق ہے، جو ہمیشہ برا ہے اور اس سے پرہیز کیا جائے۔ ہمارا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ تمام اقداری مسائل بطور مطلق ہیں بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ بعض اقدار مطلق ہیں اسی طرح معرفت کے باب میں؛ ہم ہر معرفت کو مطلق نہیں مانتے، اور یہ بھی نہیں مانتے کہ ہر شخص کو حاصل ہونے والی معرفت اور شناخت صحیح اور مطلق ہے کیونکہ بعض لوگوں کو حاصل ہونے والی شناخت اور معرفت نادرست ہے پس معلوم یہ ہوا کہ بعض معرفت اور شناخت نسبی ہیں اور بعض چیزوں میں نسبت پائی جاتی ہے: مثال کے طور پر آپ سے یہ سوال کیا جائے کہ تھران یونیورسٹی بڑی ہے یا چھوٹی؟ تو چونکہ اگر آپ اس کو اپنے گھر سے مقابلہ کریں گے تو آپ کا جواب ”بڑی“ ہوگا اور کہیں گے کہ تھران یونیورسٹی بھت بڑی ہے لیکن اگر اسی یونیورسٹی کو کرہ زمین سے مقابلہ کریں گے تو اس وقت آپ کا جواب یہ ہوگا کہ تھران یونیورسٹی بھت چھوٹی ہے؛ یہاں تک کہ دریا کے ایک قطرہ کی مانند شمار کی جائے گی۔

پس معلوم یہ ہوا کہ چھوٹا یا بڑا ہونا نسبی چیزوں میں سے ہے اور اسی طرح کے معنی و مفاہیم پر نسبی اطلاق کیا جائے گا لیکن کسی چیز کے چھوٹے یا بڑے ہونے سے یہ نتیجہ نہیں لیا جاسکتا ہے کہ تمام چیزیں نسبی ہیں، یہاں تک کہ خدا بھی نسبی ہے انسانی وجود، کرہ زمین اور عالم ہستی بھی نسبی ہیں چھوٹائی اور بڑائی؛ نسبی اور اضافی ہوتی ہیں اور ”مقولہ اضافہ“ سے تعلق رکھتی ہیں؛ لیکن بعض ایسے معنی اور مفاہیم ہیں جو نسبی نہیں ہیں اور ان کے ذریعہ تشکیل پانے والے قضایا مطلق ہو سکتے ہیں۔

اس بنا پر ہمارا کہنا یہ نہیں ہے کہ ہر اقدار چاہے کسی بھی جگہ ہو یا کسی بھی زمانہ میں ہو اس پر اعتقاد رکھنا مطلق ہے بلکہ ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ ”موجہ جزئیہ“ کے حد تک ہمارے پاس ”مطلق اقدار“ موجود ہیں، یعنی ہمارے پاس ایسے چیزیں موجود ہیں جو مطلق اقدار کھی جاسکتی ہیں اور موقع و محل اور زمان و مکان کے لحاظ سے تبدیل نہیں ہوتی، اور نہ ہی ان چیزوں میں کسی استثناء کا قائل ہوا جاسکتا ہے شک ہمارے سامنے دو طرح کے اقدار موجود ہیں ایک مطلق ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو مطلق نہیں ہوتے ہمارے عقیدہ کے لحاظ سے ظلم ہمیشہ اور ہر جگہ اور ہر ایک کے لئے بُرا ہے اور عدل ہمیشہ اور ہر جگہ اور ایک کے لئے حسن، اچھا اور پسندیدہ ہے ہمارے پاس واقعی قضایا اور علوم تو صیغی سے متعلق قضایا مطلق اور یقینی ہیں مثال کے طور پر ہم یقین اور جزم کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آسمان و زمین اور انسان موجود ہیں، خداوند عالم موجود ہے، وحی اور قیامت کا وجود ہے؛ بے شک یہ تمام چیزیں مطلق ہیں، نسبی نہیں۔

بعض اقدار کے مطلق ہونے کا معیار

قارئین کرام! یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ چیز مطلق ہے یا نسبی؟ تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ہر وہ واضح اور روشن قضیہ یا وہ قضیہ جو صحیح طور پر واضح چیزوں سے حاصل ہو وہ مطلق ہے لیکن وہ قضایا جو واضح نہیں ہیں یا صحیح طریقہ پر واضح و روشن چیزوں سے حاصل نہ ہو وہ نسبی ہے، جس کا نتیجہ بھی واضح اور روشن نہیں ہوگا اور بالکل یہی تقسیم اقدار کے سلسلہ میں بھی ہے: احساسات، محبت، خیالات اور عادات کی بنیاد پر حاصل شدہ اقدار، نسبی ہیں؛ لیکن جن اقدار کی بنیاد عقل پر ہوتی ہے اور جن پر عقلی دلائل قائم کئے جاسکتے ہیں اور ان کے اقداری ہونے پر دلیل پیش کی جاسکتی ہے؛ وہ مطلق ہیں مثال کے طور پر ہم عبادت خدا کو ایک اقدار کے عنوان سے مانتے ہیں جو ہمیشہ بطور مطلق مقصود اور پسندیدہ ہے، اور کبھی بھی اس میں استثناء نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اس کی بنیاد یہ ہے کہ انسان کے لئے واقعی اور حقیقی راہ تکامل (ترقی) عبادت خدا ہے اسی طرح اجتماعی اقدار میں عدالت ہمیشہ اچھی ہے، جس کے بارے میں کبھی بھی کوئی استثناء نہیں کیا جاسکتا، اس کے مقابلہ میں ظلم ہمیشہ اور ہر جگہ ناپسند اور بُرا ہے لہذا معلوم یہ ہوا کہ مطلق اقدار بھی موجود ہیں۔

۴۔ مغربی تمدن میں تمام دینی عقائد نسبی ہیں

آج کل مغربی ممالک میں بھت سے فلسفی مکاتب پیدا ہو گئے ہیں جن میں کھا جاتا ہے کہ اقدار کے سلسلہ میں عقلی اور واقعی پشت پناہی نہیں ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ تمام اقداری مسائل نسبی اور قراردادی (باہمی مفاہمت) ہیں، یعنی جس کو عوام الناس اچھا کہیں وہ اچھا ہے اور جس کو بُرا طے کر لیں وہ برا ہے انہیں فلسفی مکاتب میں سے ایک مہم اخلاقی مکتب بنام "پوزیٹیزم" "Positivism" ہے، جس میں معاشرہ کی پسند کو اقدار کا ملاک قرار دیا جاتا ہے اسی بنا پر اس مکتب کے ماننے والے کہتے ہیں کہ خوب و بد اور اقدار و ضد اقدار طے کئے جانے والے معاملات میں سے ہیں اگر آج عوام الناس کسی چیز کو اقدار اور اچھی مانتے ہیں تو وہ اچھی اور قابل قدر دانی ہے، لیکن اگر لوگوں کا نظریہ بدل جائے تو پھر وہی چیز جس کو اچھا سمجھا جا رہا ہے اس کو بُرا کھا جانے لگے گا، اور وہ ضد اقدار شمار ہونے لگی گی۔

لیکن ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ تمام اقداری مسائل نسبی نہیں ہے اور تمام اقداری مسائل قرارداد کے تحت نہیں ہیں ٹھیک ہے کہ کسی بھی معاشرہ کے آداب و رسوم قراردادی اور موقع و محل کے لحاظ سے قابل تبدیلی ہوتے ہیں، لیکن بھت سے ایسے اقدار ہیں جو انسان کی فطرت میں پائے جاتے ہیں، وہ فطرت جو ثابت اور غیر قابل تبدیلی ہے:

جیسا کہ قرآن مجید میں خداوند عالم کا ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ﴾ (۲)

”آپ اپنے رخ کو دین کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارہ کش رہیں کہ یہ دین وہ فطرت الہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اور خلقت الہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی“

چونکہ فطرت الہی میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، لہذا وہ اقدار جو فطرت پر مبنی ہوں گے وہ بھی غیر قابل تبدیلی ہوں گے لہذا ہمارے پاس مطلق اقدار ہو سکتے ہیں جو لوگ ہم سے کھتے ہیں کہ آپ اپنے نظریہ کو مطلق نہ سمجھے، اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اقداری افکار کو مطلق نہ کھیں کیونکہ ہم ایسے عقائد اور اقدار پر یقین رکھتے ہیں جن پر دوسرے لوگ اعتقاد نہیں رکھتے، اور ہمارے مقابلہ میں دوسری چیزوں کا اعتقاد رکھتے ہیں؛ لہذا ہمیں اپنے عقائد ان لوگوں پر تعمیل نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ ہمارا اقداری نظریہ ہمارے سلیقہ کے تحت ہے اور دوسروں کی اقداری نظر ان کے اپنے سلیقوں کے تحت ہے، اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے سلیقے کو غلط کھے بے شک اگر کوئی شخص اس طرح کا نتیجہ پیش کرتا ہے تو یہ اسی اخلاقی مکتب ”پوزیٹیزم“ کی بنیاد پر ہے جس کی بنیاد عوام الناس کا سلیقہ اور ان کی مرضی ہے، جبکہ یہ نظریہ فاسد اور باطل ہے، اور اسلام اور فلسفہ اخلاق کے صحیح مکتب سے ہم اینگ نہیں ہے۔

اسی پوزیٹیزم اخلاقی مکتب کے طرفدار ہم سے کھتے ہیں کہ ”اپنے نظریات کو مطلق قرار نہ دیں“؛ وہ لوگ واقعاً بھت بڑے دھوکے میں ہیں ہم مطلق اقدار کی حفاظت کی خاطر اپنی جگہ پر اٹل ہیں اور کوشش کرتے رہیں گے تاکہ اسلامی ثابت اقدار معاشرہ میں زندہ رہیں اور ان کی تبلیغ ہوتی رہے، اور ان کے بارے میں کسی طرح کا کوئی اشکال اور اعتراض باقی نہ رہے۔

مغربی افراد ”رنسانس“ کے زمانہ کے بعد سے دینی معنی و مفاہیم کو اقدار کے دائرہ میں قرار دیتے ہیں خصوصاً وہ دینی مسائل جو دینی مناسک اور احکام سے متعلق ہیں اور چونکہ دوسری طرف سے یہ لوگ اقدار کو نسبی قرار دیتے ہیں، اسی وجہ سے دینی اقدار کو بھی نسبی شمار کرتے ہیں، اور ان کے لئے مطلق اقدار کے قائل نہیں ہیں چنانچہ اسی بنیاد پر کھتے ہیں کہ تمام ادیان اور مذاہب اچھے اور برحق ہو سکتے ہیں: اور یہ دین اپنے ماننے والوں کے لئے اچھا اور برحق، اور وہ دین اس کے ماننے والوں کے لئے اچھا اور برحق ہے، اور کسی شخص کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے دینی نظریہ کو مطلق قرار دے، اسی طرح یہ بھی کہنے کا حق نہیں ہے کہ صرف اور صرف دین اسلام صحیح اور برحق ہے اور دوسرے ادیان عالم باطل اور بے بنیاد ہیں چاہے دین اسلام ایک طرح کے اقداری احکام سے تشکیل ہوا ہے مثلاً دینی حلال و حرام چیزیں جیسے نماز پڑھیں، روزہ رکھیں، یا جھوٹ نہ بولیں، یا نامحرم کو نہ دیکھیں اور لوگوں کے مال اور ناموس پر تجاوز نہ کریں جب کہ یہ بات ظاہر ہے کہ اگر اقدار مسائل نسبی اور قرار دادی (باہمی مفاہمت) ہوں تو دینی مسائل بھی نسبی ہوں گے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین اسلام اعتبارات اور قرار داد کا دین بن جائے گا۔

اس پوزیٹیزم نظریہ اور دینی مسائل کو اقدار کے دائرہ میں قرار دینے کی بنا پر بعض لوگ ہم سے کھتے ہیں کہ آپ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اپنے دین کو دوسروں پر تعمیل کریں، اور ان کو مسلمان کرنا چاہیں دین اسلام تمام مسلمان کے لئے محبوب اور پسندیدہ

ہے، اسی طرح دین یھودیت یھودیوں کے لئے پسندیدہ ہے، چونکہ یہ ایان نسبی ہیں اور ان میں سے کوئی بھی مطلق نہیں ہے اور چونکہ یہ ایان اور اقدار نسبی اور قراردی ہیں اسی لحاظ سے مختلف معاشروں میں ان کا حکم بھی مختلف ہے: چودہ سو سال پہلے اسلام؛ سعودی عرب کے لئے مناسب اور اچھا تھا لیکن عصر حاضر میں ماڈرن دنیا کے لئے ایک دوسرا دین مناسب اور مطلوب ہے! لہذا اسلام کو مطلق قرار نہیں دینا چاہئے اور مسلمانوں کو بھی اپنے دینی نظریات کو دوسروں پر نہیں تھونپنا چاہئے اسلام ان لوگوں کے اچھا ہے جن کے سلیقے ان سے میل کھاتے ہیں لیکن دوسروں کے لئے یہ دین اچھا نہیں ہے کیونکہ وہ اس دین کو پسند نہیں کرتے اور اپنے سلیقہ کے لحاظ سے دوسرا دین اختیار کئے ہوتے ہیں لہذا ہمیں اپنے اسلامی سلیقہ کو دوسروں پر تھمیل نہیں کرنا چاہئے اور دوسروں کے سلیقوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

قارئین کرام! گذشتہ نظریہ کا جواب یہ ہے کہ ہم مان لیتے ہیں کہ اسلام کے بعض احکام (جیسے احکام ثانوی) نسبی اور متغیر ہیں اور بعض احکام موقع و محل کے لحاظ سے ہوتے ہیں، لیکن اسلامی تمام احکام متغیر نہیں ہیں؛ بلکہ بھت سے اسلامی احکام ثابت، مطلق اور غیر قابل تبدیلی ہیں اس کے علاوہ یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ اسلام کا کوئی بھی حکم عوام الناس کے سلیقہ کے تابع نہیں ہے، اور متغیر احکام کے لئے بھی خاص دلائل ہوتے ہیں پس اولاً: ہم اس نظریہ کو نہیں مانتے کہ تمام اقدار عوام الناس کے سلیقہ اور ان کی پسند کے تابع ہیں بلکہ ہم اعتقاد رکھتے ہیں کہ بعض اقدار اور بعض ضد اقدار مطلق چیزیں؛ مصلح و مفاسد کے تابع اور نفس الامری ہیں، لہذا وہ ثابت اور غیر قابل تبدیلی ہیں دوسرے: اسلام کے ثابت اقدار اسی قسم کے ہیں (یعنی مصلح و مفاسد کے تابع اور نفس الامری ہیں) لہذا وہ مطلق ہیں اور ہم ان کو ہمیشہ اور ہر جگہ کے لئے معتبر جانتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہمارے اسلامی نظریات مطلق ہیں، اور صرف یہی اسلامی نظریات مطلق، صحیح اور برحق ہیں پس نتیجہ یہ نکلا کہ مغربی ممالک میں نسبی گرائی نظریہ اسلامی نظریات کے مطابق نہیں ہے۔

ج۔ معرفت کے نسبی ہونے پر تیسرا نظریہ (معرفت دینی میں نسبیت کا وجود)

نسبی نظریات میں سے ”معرفت دینی میں نسبیت“ کا نظریہ بھی ہے، چنانچہ اسی نظریہ کے تحت بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم بھی یہ مانتے ہیں کہ دین ثابت اور مطلق ہے، اور دینی اقدار بھی مصلح و مفاسد کے تابع، واقعی اور نفس الامری ہیں، ہم بھی حقیقت دین کو مطلق اور ثابت مانتے ہیں لیکن ہمارے پاس کوئی واقعی اور مطلق دین نہیں ہے، جس سے ہم رابطہ برقرار کریں صرف ہمارے اختیار میں دین کی معرفت اور اس کی شناخت ہے اور جو کچھ بھی ہم دوسروں کو دین کے عنوان سے بتاتے ہیں، درحقیقت وہ دین سے حاصل کردہ ہمارا ایک نتیجہ اور شناخت ہوتی ہے جبکہ دوسرے افراد دین سے ایک دوسرا نتیجہ حاصل کرتے ہیں اگرچہ ہم

اصل دین کو ثابت اور مطلق مانتے ہیں لیکن دینی معرفت اور دینی شناخت کو قابل تغیر اور نسبی مانتے ہیں، ہمارے نظریہ کے مطابق کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے نتیجہ اور شناخت کو مطلق مانے، اور اپنے اس نظریہ کو دوسروں پر تھونپے۔

یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ ہماری بعض دینی شناخت مطلق ہو، اور سبھی لوگ دین سے یہی نتیجہ اخذ کریں اور سبھی اسی کو قبول کریں یا نہ، دینی کوئی بھی معرفت مطلق نہیں ہے بلکہ دینی ہر موضوع کی ہر شناخت نسبی ہے؟ جس کے نتیجہ میں دو دینی شناختوں میں سو فی صد اختلاف ہو سکتا ہے کہ ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہو؛ یعنی کوئی شخص کسی چیز کو دینی مسائل میں شمار کرے جبکہ کوئی دوسرا شخص اس کا انکار کرے، حالانکہ دین سے حاصل کردہ دونوں شناخت مقبول اور معتبر ہوں؟!

قارئین کرام! نسبت کے سلسلہ میں یہ تیسرا نظریہ جو ”معرفت دینی میں نسبت“ کے نام سے شہرت پیدا کرتا جا رہا ہے اور اس نظریہ کے طرفدار اس کو ”قبض و بسط شریعت“ (شرعی مسائل میں کمی و زیادتی) کے عنوان مانتے ہیں، اور یہ نظریہ تقریباً بیس سال سے رائج ہوتا جا رہا ہے اور ہر روز مزید پھیلتا جا رہا ہے نیز اخباروں اور جرائد میں بیان ہوتا ہے، اس کی بنا پر ایسا ظاہر کیا جاتا ہے کہ دین کے متعلق تمام لوگوں کی شناخت برابر نہیں ہے: ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے اعتقاد کی بنا پر کہے کہ نماز صبح دو رکعت ہے، لیکن کوئی اپنے نظریہ کی بنا پر یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ نماز صبح تین رکعت ہے؛ حالانکہ دونوں نظریات معتبر اور مقبول ہیں! اور اگر ہم اپنے عقیدہ کی بنا پر نماز صبح کو دو رکعت سمجھیں تو ہمیں یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے افراد کو بھی نماز صبح دو رکعت پڑھنے کے لئے کہیں اس بنیاد پر ہمارے عقیدہ کی بنا پر نماز صبح دو رکعت ہے، ہو سکتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص دین سے یہ نتیجہ حاصل کرے کہ نماز صبح تین رکعت ہے اور وہ بھی دین کی شناخت اور ایک قرائت کھلائے گی، اور اقداری لحاظ سے دو قرائت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور ہر شخص کا حاصل کردہ نتیجہ اس کے لئے محترم ہے، نیز کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ دین سے حاصل کردہ اپنے نتیجہ کو مطلق قرار دے، چونکہ شناخت اور معرفت قبض و بسط رکھتی ہیں یعنی ان میں کمی یا زیادتی ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ ایک شناخت اور قرائت ایک طرف ہو اور دوسری شناخت اور قرائت اس کے بالکل مخالف ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ایک دینی عقیدہ کو آج ثابت کریں اور کل اسی عقیدہ کی رد کریں اس کی وجہ یہ ہے کہ واقعی دین ہمارے پاس نہیں ہے، بلکہ صرف دینی معرفت ہمارے پاس ہے، جبکہ یہ دینی معرفت قابل تبدیلی ہے اور بعض افراد کے لحاظ سے مختلف ہو جاتی ہے۔

۵۔ قرائت نسبی اور قرائت مطلق دونوں جدا جدا ہیں

بے شک ”معرفت دینی میں نسبت“ کے نظریہ (جو کافی مدت سے ہمارے ملک میں جاری ہے اور اس کے بارے میں بھت سی کتابیں اور مقالات بھی چھپ چکے ہیں) کی تحقیق و بررسی کے لئے کافی مدت درکار ہے، لیکن ہم اس وقت مختصر طور پر عرض

کرتے ہیں: ہم یہاں پر سب سے پہلے یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا ”قبض و بسط شریعت“ کے ماننے والوں کے نزدیک ہر دینی مسائل کی چند تفسیر اور چند قرأت ہو سکتی ہیں؟ یا صرف بعض دینی مسائل کی مختلف تفسیر اور معنی ہو سکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں ان کی پیش کردہ دلائل کے پیش نظر صرف بعض دینی مسائل میں مختلف تفسیر اور قرأت کا ہونا ثابت ہوتا ہے؛ لیکن وہ لوگ اس دلیل کو عام قرار دیتے ہوئے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ تمام دینی مسائل میں مختلف تفسیر اور نتائج ہو سکتے ہیں منجملہ ان کے بعض مجتہدین اور فقہاء کے اختلافی مسائل ہیں۔

ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلامی فقہ میں (بعض) مجتہدوں کا فتویٰ مختلف ہے چنانچہ ایک کھتا ہے کہ نماز جمعہ واجب ہے اور دوسرا کھتا ہے کہ نماز جمعہ واجب نہیں ہے، ایک کھتا ہے کہ ”شترنج“ کھیلنا حرام ہے لیکن دوسرا اس کو حلال قرار دیتا ہے پس معلوم یہ ہوا مجتہدین کا فتویٰ اور اسلام سے ان کا حاصل کردہ نظریہ نسبی اور متغیر ہے، ثابت نہیں، یہاں تک کہ بعض مجتہدین میں خود ان کا فتویٰ مختلف ہے، جیسا کہ بعض مجتہدین کا ایک زمانہ میں کچھ فتویٰ تھا لیکن بعد میں اپنا فتویٰ بدل دیا اور ایک نیا فتویٰ صادر کر دیا لہذا معلوم یہ ہوا کہ یہ فتاویٰ اور نتائج کا اختلاف اس بات کی دلیل ہے کہ دینی معرفت اور قرأت نسبی اور قابل تغیر ہے، اور ممکن نہیں ہے کہ دینی معرفت اور شناخت ثابت اور مطلق ہو۔

قارئین کرام! مذکورہ مسئلہ کے جواب میں ہم عرض کرتے ہیں کہ اس بات کو تو ایک دور دراز کے علاقے میں رہنے والا جاہل انسان بھی جانتا ہے کہ فروع دین کے بعض مسائل میں مجتہدین کا فتویٰ مختلف ہے لیکن فتوؤں کا یہ اختلاف دلیل نہیں ہے کہ آپ لوگ یہ دعویٰ کرنے لگیں کہ وحی کے ذریعہ پیغمبر اسلام (ص) کی معرفت تک مطلق نہیں ہے؛ چونکہ پیغمبر اکرم (ص) کی معرفت بھی انسانی معرفت کی طرح ہے جس میں خطا کا امکان پایا جاتا ہے! یعنی جس وقت خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾^(۳) یا ﴿وَاللَّهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ لَّا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ﴾^(۴) کھتا ہے تو ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ خدا کی وحی کیا ہے ہم پیغمبر اکرم کے فرمان کے مطابق جس میں آپ نے فرمایا کہ خداوند عالم مجھ پر وحی نازل کرتا ہے؛ آگاہ ہو جاتے ہیں کہ پیغمبر اکرم (ص) پر وحی نازل ہوتی ہے، لیکن وحی الہی کی حقیقت کے بارے میں نہیں جانتے اور پیغمبر اکرم (ص) نے وحی کے سلسلہ میں جو کچھ چیزیں ہمیں بتائی ہیں وہ وحی خدا نہیں ہے بلکہ وحی سے اپنی معرفت اور فہم کو پیش کیا ہے؛ اور چونکہ آپ کی فہم و سمجھ بھی انسانی اور قابل خطا ہے، تو ہو سکتا ہے کہ انھوں نے وحی حاصل کرنے میں غلطی کی ہو خداوند عالم بیان کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن آپ نے

اس کے سمجھنے میں غلطی کر دی اور اپنی معرفت اور سمجھ کو وحی خدا کے عنوان سے بیان کر دیا چنانچہ اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن مجید کی کسی بھی آیت کے بارے میں کسی کی فہم اور سمجھ معتبر نہیں ہے اور ان سب میں خطا اور غلطی کا احتمال پایا جاتا ہے!

قارئین کرام! کیا یہ بھی دین اسلام کی ایک نئی قرائت ہے؟ کیا قرائت کا میدان اس قدر لا محدود اور وسیع ہے؟ ہم یہ ماننے ہیں کہ مجتہدین کے فتوؤں میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن کیا خداوند عالم کے وجود میں بھی شک و تردید پیدا ہو سکتا ہے؟ اور کیا اس بات کو قبول کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر اور قرآنی آیات کے تحت کوئی شخص خدا کے وجود کو ثابت کرے اور دوسرا (انہیں قرآنی آیات کے ذریعہ) وجود خدا کی نفی کرے، اور دونوں کو دینی معرفت کے نام سے معتبر سمجھا جائے؟ اور کیا ۱۴۰۰ سال سے تمام شیعہ سنی اسلامی فرقوں کے علماء کے بیان کے مقابلہ میں کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ان سبھی نے غلطی کی ہے اور غلط سمجھا ہے، انہوں نے اپنے نتائج کو بیان کیا ہے اور ہم بھی اپنا نتیجہ بیان کرتے ہیں؟

دین میں کس حد تک مختلف قرائت ہو سکتی ہیں؛ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مختلف قرائت کا وجود صرف فروع دین میں قابل تصور ہیں، نہ کہ اصول دین میں اور وہ بھی ان ظنی مسائل میں جن میں اختلاف کا امکان موجود ہے، نہ کہ قطعی، اجماعی اور اتفاقی مسائل میں اس کے علاوہ فروع دین میں صرف دینی صاحب نظر اور متخصص (ماہرین علماء) کی نظر معتبر ہیں، نہ یہ کہ ہر کس و ناکس کے نظریہ کا کوئی اعتبار ہے ان لوگوں کی نظر معتبر ہے جنہوں نے تقریباً پچاس سال تک بڑے بڑے اساتذہ جیسے مرحوم آیت اللہ بروجردی، مرحوم آیت اللہ امام خمینی اور علامہ طباطبائی (رحمۃ اللہ علیہم) سے درس پڑھا ہے اور اس راستہ میں آنے والی تمام قرآنی سختیوں کو برداشت کیا ہے نیز اپنی رفتار، فہم، تحقیق اور استنباط میں تقویٰ الہی سے مزین ہوں، نیز ہوا پرستی کا شکار نہ ہوں دینی معاملات میں مغربی تمدن سے متاثر چند بول پڑھنے والے (خود کو دینی ماہر کھلانے والے) کی نظر معتبر نہیں ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اختلاف نظر اور مختلف قرائت صرف دین کے ظنی اور متشابہ مسائل میں قابل قبول ہے، اور اسلام کے قطعی مسائل، محکمت، ضروریات اور بینات میں صرف ایک ہی قرائت موجود ہے اور وہ بھی خدا و پیغمبر کی قرائت ہے، لہذا اس سلسلہ میں کسی طرح کے اختلاف نظر، شک و تردید اور مختلف قرائت کی کوئی گنجائش نہیں ہے، جیسا کہ اسلام کو ۱۴۰۰ سال گذر چکے ہیں ان کے بارے میں کسی طرح کا کوئی اختلاف نہیں ہوا ہے ہم نے دیکھا کہ حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ نے مرتد سلمان رشدی کے قتل کا فتویٰ صادر کیا تو اس وقت تمام علماء اسلام نے تائید کی اور اس حکم کے بارے میں کسی طرح کی کوئی مخالفت سنائی نہ دی، اور سب نے یہ اتفاقی طور پر کہا کہ حضرت امام خمینی (رہ) کا بیان کردہ فتویٰ حکم اسلام ہے اگرچہ بعض مغرب پرست نو وارد جنہوں نے اسلام کی بو بھی نہیں سونگھی ہے اس فتویٰ کی مخالفت کی اور کہا: اسلام سے ہماری قرائت یہ نہیں ہے لیکن یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ دنیا بھر کے صاحب عقل صرف اسی شخص کے نظریہ کو اہمیت دیتے ہیں اور صرف اسی کے نظریہ کو معتبر جانتے ہیں جو متعلق علم میں صاحب نظر اور محقق ہو اور صحیح طریقہ اور اس علم سے مناسب تحقیق کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرے۔

حوالے

(۱) سورہ لقمان آیت ۱۳

(۲) سورہ روم آیت ۳۰

(۳) سورہ اخلاص (توحید) آیت ۱، ترجمہ: ”اے رسول کھ دیجئے کہ وہ اللہ ایک ہے“

(۴) سورہ بقرہ آیت ۱۶۳ ترجمہ: ”اور تمہارا خدا بس ایک ہے، اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے وہی رحمن بھی ہے اور وہی رحیم بھی ہے“

چالیسواں جلسہ

دینی معارف افسانہ ہیں یا حقیقت نما آئینہ

۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر

”اسلامی سیاسی نظریات کی وضاحت“ کے سلسلہ میں ہماری بحث یہاں تک پہنچی تھی کہ اگر اسلامی منابع کے لحاظ سے قوانین اور ضوابط بنانا چاہیں اور ان کو اسلامی اقدار کے مطابق نافذ کرنا چاہیں، تو اس کے لئے ہمارے پاس قرآن و سنت (جو ہمارے اصلی منابع ہیں)؛ کی گہری شناخت اور قابل اعتماد پہچان ہونا ضروری ہے، تاکہ قانون گذاری کے وقت اسلامی نظریہ کو مد نظر رکھیں، اور وہ قوانین و ضوابط اسلام کے کلی قوانین کے تحت قرار پائیں، اور اسی طرح قرآن و سنت سے الھام لیتے ہوئے ان کو نافذ کرنے کا طریقہ اپنائیں اس سلسلہ میں کبھی کبھی آیات و روایات سے ہونے والا نتیجہ مختلف ہو جاتا ہے اور بعض آیات و روایات کی مختلف تفسیر و معنی کئے جاتے ہیں نیز بعض روایات سے مختلف استنباط ہوتے ہیں لیکن اس سلسلہ میں بعض لوگ اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ انہیں اختلاف کے پیش نظریہ کہتے ہیں کہ تمام دینی مسائل میں اختلاف جائز ہے، اور کہتے ہیں کہ ہر شخص اسلام سے مخصوص قرائت اور مخصوص نتیجہ حاصل کر سکتا ہے، اور کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے نظریہ کو دوسروں پر تعمیل کرے جیسا کہ اخباروں اور جراند میں مکرر یہ شعار دیا جاتا ہے کہ کسی کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ دین سے اپنے حاصل کردہ نتیجہ کو مطلق گردانے، بلکہ توجہ رہے کہ دوسرے افراد بھی آراء اور نظریات رکھتے ہیں، اور یہ کہ اسلام کی صرف ایک قرائت نہیں ہے، نیز اسلام کے بارے میں مختلف قرائت کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے اور یہ یقین رکھا جائے کہ دین کی ہر ایک قرائت معتبر اور محترم ہے۔

۲۔ وقع نما اور غیر وقع نما زبانوں کی اہمیت

قارئین کرام! ہم نے گذشتہ جلسہ میں دینی سلسلہ میں مختلف نظریات کے مطلق نہ ہونے نیز دین کی مختلف قرائت نہ ہونے کے بارے میں بحث کی، اور نظریات کے نسبی ہونے نیز مختلف قرائت کا سرچشمہ تلاش کرتے ہوئے ”نسبیت معرفت“ کے مسئلہ کو بیان کیا اور عرض کیا کہ ”نسبیت معرفت“ کے سلسلہ میں تین نظریات پائے جاتے ہیں اس جلسہ میں دینی نظریات کے مطلق نہ ہونے کے شعار اور دین کی مختلف ہونے کے بارے میں دوسرے دو نظریات کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اور وہ دو نظریہ یہ ہیں:

”دین کی زبان“ اور ”ہرمنوٹیک“ "H e r m e n e u t i c s" کی بحث اور علم تفسیر متون (تحریر کی شرح و تفسیر کرنا) جو کہ عصر حاضر میں معرفت کا ایک مہم باب کھلاتا ہے، اور دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں مخصوص ڈیپارٹمنٹ اور مخصوص علمی گروہ اس میں مشغول ہیں لہذا ہم اس جلسہ میں انہیں دو چیزوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

دین کی زبان کے سلسلہ میں بحث، اور دینی معرفت مطلق نہ ہونے والے مسئلہ کا سرچشمہ یہ ہے کہ ان آخری چند صدیوں کے دوران یورپی ممالک میں ”فلسفہ دین اور کلام جدید“ کے سلسلہ میں ایک نئی بحث یہ کی گئی ہے کہ کیا دین کی زبان واقع نما ہے یا دین کی زبان سمبلیک "S y m b i l e c" (رمزی) اور قصہ کہانی اور افسانہ کی زبان ہے اس سلسلہ وضاحت کے طور پر یوں عرض کیا جائے کہ انسان اپنی بات کو سمجھانے کے لئے زبانی اور عرفی محاورات یا علمی اور فلسفی اصطلاحات، نیز الفاظ اور ان کی ترکیبات کا استعمال کرتا ہے تاکہ دوسروں کو خارجی یا عینی چیزوں کی واقعیت کی طرف متوجہ کر سکے اور کبھی انسان ان الفاظ کے ذریعہ خارجی اور عینی واقعات کے طرف متوجہ کرتا ہے اور کبھی ان الفاظ کے ذریعہ منطق اور فلسفہ جیسے علم میں ذہنی اور تصویری حقائق کی طرف متوجہ کرتا ہے، مثال کے طور پر کوئی شخص یہ کہے کہ ”فضا روشن ہے“ اس جملہ سے کہنے والے کی مراد یہ ہوتی ہے کہ سننے والے کو اس بات کی خبر دے کہ فضا روشن ہے، اور چراغ کے ذریعہ روشنی کرنے کی ضرورت نہیں ہے بے شک یہ زبان واقع نما ہے اور ایک بیرونی حقیقت کی عکاسی کرتی ہے اور اسی طرح کی زبان ریاضیات، منطق اور فلسفہ میں بھی استعمال کی جاتی ہے، البتہ یہ زبان علوم دقیقہ (منطق و فلسفہ) اور تجربی علوم میں تھوڑے دخل و تصرف کے ساتھ استعمال کی جاتی ہے اسی وجہ سے کھا جاتا ہے کہ زبان علم اور زبان فلسفہ واقع نما ہوتے ہیں اور بیرونی حقیقت یا ذہنی حقیقت کی عکاسی کرتی ہے۔

لیکن کبھی کبھی کسی بھی زبان کے الفاظ بیرونی یا ذہنی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے استعمال نہیں کئے جاتے اگرچہ الفاظ کی ترتیب وہی ہوتی ہے جس کو علوم میں حقیقت نما طریقہ پر استعمال کیا جاتا ہے، لیکن کہنے والے یا لکھنے والے کا مقصد حقیقت سے باخبر کرنا نہیں ہوتا، مثال کے طور پر افسانہ اور قصہ کی زبان، جس میں کسی بھی طرح کی کوئی واقعیت کاپتہ نہیں دیا جاتا، لہذا اس طرح کی زبان واقع نما نہیں ہے جس وقت قصہ اور کہانیوں کی کتابوں میں ”کلید و دمنہ“ کی داستان بیان کی جاتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان قصوں میں استعمال ہونے والے الفاظ کسی طرح کی حقیقت کی حکایت نہیں کرتے اگر ان میں جنگلی حیوانات مثلاً شیر، بھیریا اور لومڑی وغیرہ کا کے بارے میں باتیں بتائی جاتی ہیں تو مولف کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ جنگلی حیوانات میں اس طرح کی گفتگو ہوتی ہے؛ بلکہ مولف اس داستان کے ذریعہ حیوانات کی زبان میں غیر مستقیم طور پر بعض مہم باتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے لہذا افسانہ اور قصہ کی زبان غیر واقع نما زبانوں کا ایک حصہ ہے۔

انھی غیر واقع نما زبانوں میں سے: زبان سمبلیک "S y m b i l e c" (رمزی) ہے جو بھت سے علوم میں استعمال کی جاتی ہے، اسی طرح انسانی معارف کی بھت سی قسموں میں حکایت اور حقائق کے بیان کرنے کے لئے اس زبان سے استفادہ کیا جاتا

ہے، جس کا واضح نمونہ؛ علم ہندسہ اور ریاضی کی مثالیں اور فارمولے نیز اختصار کی علامتیں ہوتی ہیں جیسے "x" ، "y" ، کیونکہ یہ مثالیں اور فارمولے کسی حقیقت کی حکایت نہیں کرتے، بلکہ بعض علمی حقائق کے لئے صرف ایک علامت ہوتی ہیں، اسی طرح شاعروں کی زبان بھی غیر واقع نما ہوتی ہے جب شاعر؛ منے، ساغر اور ساقی جیسے الفاظ کو اپنے شعر میں استعمال کرتا ہے تو حقیقت میں اس کی مراد واقعی ساقی اور شراب نہیں ہوتی بلکہ ان الفاظ کو کناہیۃ استعمال کرتا ہے جب کہ اس کے ذہن میں حقیقی مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔

۳- دین کی زبان کو غیر واقع نما قرار دینے کا سبب

چنانچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دین بھی اپنی خاص زبان رکھتا ہے، اور دین کی زبان غیر واقع نما زبانوں میں سے ہے پہلے تو دین کی زبان کا مسئلہ یورپ میں یہودیت اور عیسائیت کے عقائد کے بارے میں بیان ہوا، اسی وجہ سے دانشوروں اور متفکروں نے اپنے نظریہ کی تائید میں یہودیوں اور عیسائیوں کی کتاب مقدس سے مثالیں پیش کیں، اور یہ کھا کہ جب ہم کتاب مقدس کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے اندر بعض چیزوں کے بارے میں دیکھتے ہیں، تو ہمارا تصور یہ نہیں ہونا چاہئے کہ یہ مقدس کتاب ہم کو علمی (اور سائنسی) کتابوں کی طرح بیرونی حقائق سے آشنا کر رہی ہے، بلکہ دین نے جو زبان استعمال کی ہے وہ ایک افسانہ کی زبان اور سمبلیک "S y m b i l e c" زبان ہے، (واقع نما نہیں)۔

عام طور پر زبان کی دو قسم بیان کی جاتی ہے: ایک واقع نما زبان اور دوسری غیر واقع نما زبان، اور بعض لوگ دین کی زبان کو غیر واقع نما زبانوں میں قرار دیتے ہیں، یعنی دین کی زبان حقائق اور واقعت پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ افسانہ، قصہ و کہانیوں کی طرح ہوتی ہے لیکن یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دین کی زبان کو زبان افسانہ قرار دینے کی علت اور وجہ کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب یورپ میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے پیش نظر ہر روز نئی نئی چیزیں کشف ہوئی، اور زمین، سورج اور دیگر ستاروں کے بارے میں مغربی دانشوروں جیسے "کپلر"، "کپرنیک"، "گالیلو"؛ نے نئے نئے فرضیہ قائم کئے جو یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس کتاب (توریت اور انجیل) سے ہم اہنگ نہ تھے، جس کی وجہ سے انھوں نے یہ اندازہ لگایا کہ عصر حاضر میں سائنس کی نئی تھیوری اور نظریات؛ کتاب مقدس میں بیان شدہ بعض عقائد کو جھوٹا ثابت کرتے ہیں، جس کی بنا پر یہودیت اور عیسائیت کا چراغ گل ہو جائے گا، کیونکہ جب توریت اور انجیل میں بیان شدہ چیزیں نادرست، بے بنیاد اور جھوٹی ثابت ہو جائیں گی تو پھر یہ دین کیسے باقی رہ سکتا ہے خصوصاً عیسائیت جس کے پیروکاروں کی تعداد بھت زیادہ ہے۔

خصوصاً "رنسانس" کے زمانہ کے بعد سے؛ کتاب مقدس کی اہمیت کو بچانے اور یہودیت و عیسائیت کی دیواریں ہلنے سے روکنے کے لئے راہ حل تلاش کرنے کی فکر ہوئی، (اور کافی مدت کے بعد اس نتیجہ پر پہنچنے لگے) توریت اور انجیل میں بیان شدہ عقائد اور

دوسری چیزیں؛ سائنس کے جدید نظریات اور ٹکنالوجی سے اس وقت ہم اہنگ نہ ہوں گی جب ہم دین کی زبان کو واقع نما اور حقائق کی عکاسی کرنے والی زبان کھیں لیکن اگر دین کی زبان کو غیر واقع نما زبان قرار دیدیں اور یہ کھیں کہ دین کی زبان؛ شعر اور افسانہ کی زبان ہے جو حقائق اور واقعیت کی عکاسی نہیں کرتی اور توریث و انجیل میں بیان شدہ چیزیں گویا افسانہ اور قصہ کھانیوں کی طرح ہیں اور خاص اغراض و مقاصد کے تحت تنظیم ہوئی ہیں، تو اس صورت میں سائنس اور دینی باتوں میں کسی طرح کا کوئی اختلاف پیش نہیں آئے گا؛ کیونکہ بنیادی طور پر دونوں زبانوں کا مقصد مختلف ہے اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ توریث اور انجیل میں خدا، وحی، قیامت اور جنت و جہنم کے بارے میں ذکر شدہ مطالب صرف عوام الناس کو اچھائیوں اور برائیوں کے سمجھنے کے لئے بیان ہوئے ہیں، تاکہ دیندار افراد نیک کام کرنے اور برے کاموں سے پرہیز کرنے کی کوشش کریں جھوٹ نہ بولیں، غیبت نہ کریں اور دوسرے پر ظلم و ستم کو جائز نہ مانیں مثلاً اگر ان میں کھا جاتا ہے کہ جو شخص کسی پر ظلم کرے گا تو آخرت میں اس پر عذاب ہوگا، تو درحقیقت اس قول سے ظلم کی برائی کو مزید مجسم کیا گیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ واقعاً آخرت میں کوئی جنت و جہنم موجود ہے، لہذا ہمیں دینی مسائل سے اس طرح کا کوئی تصور اور نتیجہ حاصل نہیں کرنا چاہئے۔

کتاب مقدس (توریث اور انجیل) سے عام فہم عوام الناس یہی نتیجہ حاصل کرتے ہیں کہ ان کتابوں میں ذکر شدہ دینی مسائل حقائق پر مبنی ہیں اور بیرونی حقائق کی عکاسی کرتی ہیں، لیکن روشن خیال رکھنے والوں اور دانشوروں کے نزدیک توریث و انجیل میں بیان شدہ مطالب صرف عوام الناس کے لئے تربیتی پہلو رکھتے ہیں یعنی ان کے پیش نظر عوام الناس میں نیک کام کرنے اور برے کاموں سے پرہیز کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اس کے علاوہ ان مقدس کتابوں میں بیان شدہ مطالب میں کوئی پیغام نہیں ہے یہاں تک کہ دین کی افسانوی زبان میں خدا کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، چنانچہ اگر توریث اور انجیل میں خدا کا ذکر ہے یا انبیاء (علیہم السلام) اور وحی کے بارے میں بیان ہوا ہے، تو اس افسانوی زبان میں یہ صرف خدا کا ایک عکس ہے ورنہ (نعوذ باللہ) نہ تو خدا ہے اور نہ جنت و جہنم اور وحی اور اس عکس کو اس افسانوی زبان میں اس قدر بہترین سلیقہ سے بیان کیا گیا ہے تاکہ عوام الناس میں نیک کام کرنے اور برے کام سے پرہیز کرنے کا شوق پیدا ہو، اور انسانی اقدار کا پاس و لحاظ رکھا جائے ان کی یہ کوشش رہے کہ اسی دنیا میں بہترین زندگی گزاریں اور دوسرے کو آزار و اذیت نہ دیں؛ ورنہ تو توریث و انجیل کی ”کلیلہ و دمنہ“ داستان سے زیادہ اہمیت نہیں ہے جس طرح سے یونانی قدیم تمدن اور دوسرے قدیمی معاشروں میں افسانوی خدا ہوتے تھے، یہاں تک کہ ان کی بعض داستانوں میں یہاں تک بیان ہوا ہے کہ وہ خدا ایک دوسرے سے شادی کیا کرتے ہیں، اور کبھی تال میل کرتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں، اسی طرح دوسرے ادیان کی کتابوں منجملہ توریث اور انجیل میں بھی صرف خیالی اور افسانوی عکس ہوتا ہے جس میں کسی بھی طرح کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

قارئین کرام! جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ یہودیت اور عیسائیت کو نابودی سے بچانے کے لئے توریت اور انجیل میں بیان شدہ دینی مسائل کے بارے میں یہ تھیوری اور نظریہ پیش کیا گیا ہے اور یہ نظریہ اہستہ اہستہ مغربی ممالک کے دیندار لوگوں میں بھی رائج ہوتا چلا گیا، اور کتاب مقدس کی توجیہ (اور دلیل) کے عنوان سے اس نظریہ کو بہترین راہ حل مانا جانے لگا لیکن ”رسانس“ کے زمانہ سے پہلے یہودی اور عیسائی متدین لوگ دینی عقائد اور مسائل کو صادق، حق اور واقع کے مطابق مانتے تھے، اور انھوں نے جب نئی نئی کشفیات اور سائنس کے نظریات کو اپنی کتاب مقدس کے برخلاف پایا تو کتاب مقدس کے دفاع کرتے ہوئے بعض دانشوروں کی سخت مخالفت کی یہاں تک کہ بعض دینی مسائل کے مخالف دانشوروں کو پھانسی دے دی گئی اور بعض کو زندہ آگ میں جلادیا گیا اسی طرح بعض بھت سے دانشوروں کو منجملہ ”گلیٹھ“ کو توبہ پر مجبور کیا جس کی بنا پر اس نے اپنے نظریات واپس لے لئے۔

۴۔ مغربی نسبی گرائی نظریہ کی ترویج (و تبلیغ) کرنے والے مغرب پرست روشن خیال

قارئین کرام! مغربی ممالک میں پہلے یہ نظریہ پیش کیا کہ دین کی زبان؛ سائنس کی زبان سے مختلف ہے اور دین کی زبان کسی بھی طرح کے حقائق پر مبنی نہیں ہے، بلکہ دین کی زبان قصہ کہانی اور افسانہ کی زبان ہے، لیکن مشرقی ممالک سے مغربی ممالک کے تعلقات اور علمی تبادلہ خیالات اور مغربی ممالک میں اسٹوڈینٹ کا تعلیم حاصل کرنے وغیرہ جیسے امور کی وجہ سے یہ نظریہ مشرقی ممالک میں بھی آگیا مغرب پرست اور مغربی کلچر کے عاشق اور دلدادہ نیز مغربی ممالک میں تعلیم یافتہ اسٹوڈینٹ وغیرہ مغربی تمدن کے شیدائی بن گئے، اور وہاں کی تعلیم اور وہاں کی زبان سے آشنائی کو اپنے مہم افتخارات میں شمار کرنے لگے، اور اس الحادی تھیوری اور نظریہ کے حصول کو اپنے لئے باعث سرفرازی سمجھنے لگے، نیز اس نظریہ کو کارگر اور بہترین تحفہ کے عنوان سے عالم اسلام میں داخل کر دیا، اور کھا کہ جس طرح مغربی ممالک میں توریت اور انجیل کے ماننے والے اپنے دین کی زبان کو غیر واقع نما زبان قرار دیتے ہیں اور اس کو صرف قصہ کہانی کی زبان مانتے ہیں جو کسی بھی طرح کے حقائق کو بیان نہیں کرتی، اسی طرح قرآن کریم کی زبان بھی قصہ کہانی اور افسانہ کی زبان ہے جس میں حقائق سے کوئی سروکار نہیں ہے۔!!

عالم اسلام میں بعض عربی ممالک جو اہل بیت علیہم السلام کی تعلیم سے آشنائی نہیں رکھتے تھے لہذا انھوں نے اس تھیوری اور نظریہ کو قبول کر لیا اور بعض عربی اہل قلم نے اس سلسلہ میں کتابیں بھی لکھ ڈالیں اور اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے شواہد یا ”مستندات قرآن“ کا بھی ذکر کیا اور جب انھوں نے قرآن مجید کی آیات کو دیکھا جن کو سمجھنے سے قاصر رہے اور ان کے حقیقی معنی کو درک نہ کر سکے، اور ان کے ظاہری معنی کو علم اور سائنس سے ہم آہنگ نہ پایا تو توریت و انجیل کے ماننے والوں کی طرح اپنے دینی عقائد کی افسانوی تفسیر و توضیح کرنے لگے، اور قرآن مجید کی بھی افسانوی اور سمبلیک "S y m b i l e c"

(رمزی) تفسیر کرنا شروع کر دی تاکہ اپنے خیال ناقص میں سائنس کے نظریات کے، دینی عقائد اور دینی مسائل سے ٹکراؤ کا راہ حل پیش کر سکیں تقریباً تیس سال سے خصوصاً ان آخری چند سالوں میں یورپ اور امریکہ میں تعلیم یافتہ لوگوں نے اس سلسلہ میں بھت زیادہ فعالیت اور کارکردگی کی تاکہ مغربی تمدن کے اس نظریہ کو ہمارے معاشرہ میں رواج دیں اور قرآن کی زبان کو قصہ کھانی اور افسانوی زبان کھ ڈالا، اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے قرآن مجید کی بعض رمزی اور سمبلیک تفسیر کے چند نمونہ پیش کئے:

۵۔ ہابیل اور قابیل کے واقعہ سے انحرافی نتیجہ

تیس سال پہلے انحرافی اور مارکسٹ "Marxist" نظریہ رکھنے والے ایک صاحب نے اپنی ایک تقریر میں ہابیل و قابیل کے واقعہ سے سمبلیک "Symbiolic" تفسیر کی۔
جب کہ قرآن مجید میں اصل واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے:

﴿وَأَنزَلْنَا عَلَيْهِم نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ قَالَ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾^(۱)

” اور اے پیغمبر! آپ ان کو آدم کے دونوں فرزندوں کا سچا قصہ پڑھ کر سنائیے کہ جب دونوں نے قربانی دی اور ایک کی قربانی قبول ہو گئی اور دوسرے کی نہ ہوئی تو اس نے کھا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا تو دوسرے نے جواب دیا کہ میرا کیا قصور ہے خدا صرف صاحبان تقویٰ کے اعمال قبول کرتا ہے“

اسلامی کتب میں واردہ شدہ روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ جناب آدم علیہ السلام کے دو بیٹے ہابیل و قابیل کو خدا کی بارگاہ میں قربانی کرنا تھی چنانچہ قابیل نے ایک گوسفند کی قربانی کی، اور جناب ہابیل نے ایک مقدار گیکھوں راہ خدا میں ہدیہ دئے، جناب ہابیل کی قربانی بارگاہ رب العزت میں قبول ہو گئی لیکن قابیل کی قربانی قبول نہ ہوئی، جس کے بنا پر قابیل کو جناب ہابیل سے حسد ہونے لگا یہاں تک کہ جناب ہابیل کو قتل کر دیا؛ لیکن اپنے کئے پر پشیمان ہوا اس کے بعد اپنے بھائی کے جنازہ کے بارے میں فکر ہوئی کہ اس کو کیا کرے تو خداوند عالم نے ایک کوئے کو بھیجا جس نے قابیل کو دفن کرنے کا طریقہ سکھادیا۔

﴿فَبَعَثَ اللَّهُ غُرَابًا يَبْحَثُ فِي الْأَرْضِ لِيُرِيَهُ كَيْفَ يُؤَارِي سَوْأَةَ أَخِيهِ قَالَ يَا وَيْلَتَا أَعَجَزْتُ أَنْ أَكُونَ مِثْلَ هَذَا الْغُرَابِ فَأُوَارِي سَوْأَةَ أَخِي فَأَصْبَحَ مِنَ النَّادِمِينَ﴾^(۲)

” پھر خدا نے ایک کوئے بھیجا جو زمین کو کھود رہا تھا کہ اسے دکھائے کہ بھائی کی لاش کو کس طرح چھپائے گا تو اس نے کھا کہ افسوس میں اس کوئے کے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش کو زمین میں چھپا دیتا اور اس طرح وہ نادین اور پشیمان لوگوں میں شامل ہو گیا۔“

کوئے نے اپنی غذا کو چھپانے کے لئے زمین میں ایک گڑھا گھودا اور اپنی غذا وہاں چھپادی؛ جب خداوند عالم کے حکم سے کوئے نے زمین میں اپنی غذا کو دفن کیا تو کیونکہ قابیل کو نہیں معلوم تھا کہ زمین میں مردہ کس طرح دفن کیا جاتا ہے، لیکن کوئے کے کام سے اپنے مردہ بھائی کے دفن کا طریقہ سیکھ لیا۔

وہ مقرر اور مولف اس واقعہ کے بارے میں اپنی سمبلک تفسیر میں لکھتا ہے:

اس واقعہ میں جناب ہابیل زحمت کش اور کاشتکاری کا ایک نمونہ ہے جو بھت زیادہ زحمت کے بعد بھت کم نتیجہ حاصل کرتا ہے اور چونکہ خداوند عالم اس طبقہ کا طرفدار ہے لہذا خداوند عالم نے اس کا ناچیز ہدیہ قبول کر لیا اور قابیل مالدار کی کا نمونہ ہے اور جب ایک مالدار نے گو سفند کی قربانی کی تو خدا نے اس کو قبول نہیں کیا؛ کیونکہ خداوند عالم مالدار کی دشمن ہے چنانچہ اس مقرر نے اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ ہابیل و قابیل اور گندم اور گو سفند کسی قربانی کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور صرف سمبلک "S y m b i l e c" (رمزی) پہلو رکھتا ہے، اور یہ واقعہ مزدور اور مالدار طبقوں کے درمیان اختلاف اور جنگ و کشمکش کی حکایت کرتا ہے (لیکن یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جناب آدم و حوا اور ان کے دونوں فرزند ہابیل و قابیل کے علاوہ کوئی تھا ہی نہیں کس طرح غریب، مزدور اور مالدار طبقہ کا تصور کیا جاسکتا ہے، اور اس طرح کی طبقاتی تقسیم اس زمانہ کے لئے معنی نہیں رکھتی بھر حال مارکسٹ "Mar x i s t" نظریہ کے رواج اور اس الحادی نظریہ کے طرفداروں کی وجہ سے یہ سمبلک تفسیر قابل قبول قرار پائی)

قارئین کرام! مذکورہ مقرر نے ہابیل و قابیل کے بارے میں تو یہ سمبلک تفسیر بیان کر دی لیکن یہ نہیں بتایا کہ کوا کس چیز کا نمونہ تھا؛ یہاں تک کہ اس کے ایک شاگرد نے اس کے بارے میں ایک نظریہ پیش کیا کہ وہ کالا کوا مولویوں کا نمونہ تھا جو مجلس پڑھتے ہیں اور عزاداری کرتے ہیں جو نمبر چر جا کر روزی کے سیاہ و سفید کے بارے میں بیان کرتے ہیں اور مالداروں اور سرمایہ داروں کی حمایت کرتے ہیں اور مزہ کی بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَإِنلُّ عَلَيْهِم نَبَا ابْنِی آدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا﴾ یعنی (اے رسول) اس واقعہ کی حقیقت لوگوں کے لئے بیان کریں، گویا خداوند عالم یہ خبر دے رہا ہے کہ ایک روز ایسا بھی آئے گا جب اس واقعہ کے سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لیا جائے گا، لہذا آپ پہلے ہی اس واقعہ کی حقیقت کو بیان فرمادیں۔

جی ہاں، ان چند سالوں میں بعض مغربی ممالک کے کلچر سے متاثر افراد قرآن مجید سے اس طرح کی تفسیر بیان کرتے ہیں اور آج کل دین اور قرآن کے بارے میں اس طرح کی باتیں اپنے زوروں پر ہے اور ان کی تبلیغ و ترویج ہو رہی ہے، یہاں تک کہ بعض علماء بھی اس نظریہ سے متاثر ہو چکے ہیں اور یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) قرآن کی زبان واقع نما نہیں ہے اور ایسا نہیں کہ قرآن مجید کی آیات کے ذریعہ ہمیں کسی حقیقت کے بارے میں پتہ چلتا ہو، ہمارے پاس قرآنی آیات کی تفسیر کے سلسلہ میں قطعی، برہانی اور مسلم معیار نہیں ہیں تاکہ ان کی بنا پر ہم یہ دعویٰ کریں کہ قرآن مجید کی فلاں آیت سے یہ نتیجہ ہے اور دوسری تفسیریں باطل

اور نادرست ہیں بلکہ ہر شخص اپنے ذہن اور علم کی بنا پر قرآن کے بارے میں سمبلیک تفسیر بیان کر سکتا ہے، چاہے اس کی تفسیر دوسری تفاسیر سے بالکل مخالف اور متضاد ہو!!

۶۔ دین کی زبان واقع نما نہ ہونا یا دین کی ایک مبہم تصویر

دینی مسائل اور قرآن کریم کی زبان کو غیر واقع نما قرار دینے کے سلسلہ میں وضاحت کے لئے عرض کرتے ہیں کہ ماڈرن ہنری میوزیم "Museum" میں بھت سی مختلف ہندسی اور مبہم چیزوں کی تصویر ہوتی ہیں جس کو دیکھ کر واضح طور پر معلوم نہیں ہو پاتا کہ یہ کس چیز کی تصویر ہے جس کی بنا پر مختلف احتمالات دئے جاتے ہیں اور ہر شخص اپنے ذوق کے لحاظ سے ان کی توضیح و تفسیر کرتا ہے اور ان کو کسی خاص چیز کا سمبل (اشارہ) بتایا جاتا ہے شاید ان کا مصور دوسروں کے مختلف نظریات کی طرف متوجہ بھی نہ ہو اسی طرح بعض نفسیاتی لیباریٹری "Laboratory" میں ایک کاغذ پر تھوڑی روشنائی ڈال دی جاتی ہے اور اس کو پھیلا کر بعض لوگوں سے سوال کیا جاتا ہے کہ یہ کس چیز کی شکل ہے؟ تو وہ تھوڑی دیر غور و فکر کے بعد اپنے ذہن کے لحاظ سے کوئی شکل کھ دیتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ یہ ایک عورت کے بال ہیں اور یہ اس کا ہاتھ ہے اور اپنے ذہنی خیالات کی بنا پر اس کو ایک عورت کی تصویر کھ ڈالتے ہیں جبکہ اس کام کے کرنے والے نے کسی خاص تصویر کے لئے یہ کام نہیں کیا ہوتا اور نا ہی اس کام کو منظم طریقہ سے کیا جاتا ہے بلکہ یونہی روشنائی ڈال دی جاتی ہے کہ ہر شخص اپنے ذہن کے لحاظ سے اس کے بارے میں فیصلہ کرے۔

چنانچہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کی زبان واقع نما نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید میں بیان شدہ مسائل کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے لحاظ سے اس کو سمجھے، اور کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ قرآن مجید سے اپنے حاصل کردہ نظریہ کو مطلق قرار دے، اور یہ کھے کہ میری بیان کردہ ہی تفسیر قرآن ہی درست اور صحیح ہے اور دوسروں کی بیان کردہ تفسیریں غلط ہیں جس طرح ایک مبہم تصویر کو دیکھ کر کوئی یہ فیصلہ کرے کہ صرف میرا ہی نظریہ صحیح ہے اور دوسروں کا نظریہ غلط ہے؛ یہ کہنا اس کے لئے صحیح نہیں ہے، کیونکہ جس طرح وہ اپنے ذاتی خیالات اور تصورات کے ذریعہ کوئی خاص تفسیر کرنے کا حق رکھتا ہے اسی طرح دوسرے بھی اپنے ذہن اور موقع محل کے لحاظ سے تفسیر کر سکتے ہیں، جن میں سے کسی ایک کو صحیح اور دوسری کو غلط قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اس طرح کی چیزوں میں صحیح اور غلط ہونا ثابت نہیں ہے، یہ نہیں کھا جاسکتا کہ فلاں صاحب کا حاصل کردہ نتیجہ صحیح ہے اور فلاں صاحب کا نتیجہ غلط ہے!

قارئین کرام! کیا قرآن مجید بھی (نعوذ باللہ) ایک ماڈرن میوزیم کی تصویروں کی طرح ہے کہ ہر شخص کو اس کی تفسیر کرنے کا حق ہے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ آسمانی کتابوں کے بارے میں اس طرح کا نظریہ رکھتے ہیں غالباً وہ لوگ خدا اور وحی پر عقیدہ

نہیں رکھتے، اور اگر زبان سے مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں، تو ان کا یہ مسلمان ہونے کا دعویٰ صرف دکھاوے کے لئے ہوتا ہے اس وقت اختلاف قرأت کا نظریہ رکھنے والے کتاب مقدس کی تفسیر کے بارے میں کھتے ہیں: بالفرض اگر خدا بھی ہو، وحی بھی نازل ہوئی ہو اور انبیاء نے وحی کو صحیح سمجھا ہو (اگرچہ ان باتوں میں بھی شک ہے)، تو چونکہ انبیاء بھی انسان ہیں اور انسانی درک و فہم رکھتے ہیں اور انسانی درک و فہم؛ غلطی سے خالی نہیں ہے، لہذا بہت ممکن ہے کہ نبی نے خدا کی باتوں کو صحیح نہ سمجھا ہو اور اگر یہ بھی مان لیں کہ پیغمبر نے وحی کو حاصل کرنے میں غلطی نہیں کی ہے، تو بھی قرآن مجید کی یقینی تفسیر بیان کرنے کے لئے کوئی راستہ نہیں ہے، تاکہ اسی معیار کی بنا پر کسی ایک تفسیر کو یقینی قرار دیں اور دوسری تفاسیر کو غلط سمجھیں لہذا قرآن مجید سے کوئی بھی شخص اپنے لحاظ سے نتیجہ نکال سکتا ہے اور اپنے نظریہ اور نتیجہ کو صحیح و معتبر قرار دے سکتا ہے اور کسی دوسرے کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کے حاصل کردہ نظریہ کو رد کرے ہم کتاب مقدس کی تفسیر کے بارے میں بالکل انہیں افراد کی طرح ہیں جن کے سامنے نفسیاتی لیباریٹری "Laboratory" میں ایک مبہم تصویر پیش کی جاتی ہے جس کے بارے میں ہر شخص کو اپنا اپنا نظریہ دینا پڑتا ہے مثلاً کوئی شخص کھتا ہے کہ یہ شکل تو میری معشوقہ کے بالوں کی طرح ہے اور کوئی کھتا ہے کہ یہ رستم کی شکل ہے، اور اس سلسلہ میں ہر ایک شخص کی نظر محترم ہے اور کسی دوسرے کو اعتراض کا حق نہیں ہے، اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس مبہم تصویر کو سمجھنے میں سب نے غلطی کی ہو اور کسی نے بھی صحیح نہ بتایا ہو بلکہ اس طرح سے کاغذ پر روشنائی ڈالنے والے کا ہدف بھی صرف یہی ہو کہ ہر شخص اپنے لحاظ سے اس کے بارے میں اپنا تصور بیان کرے!

۷۔ قرآن مجید کا شعراء کی زبان سے مقابلہ کرنا؛ بھت سے نتائج ہونے پر دلیل ہے!!

دین کی زبان کے سلسلہ میں معرفت کو نسبی قرار دینے والوں کے نظریہ کو بیان کرنے کے لئے ایک دوسری مثال یہ بھی پیش کی جاسکتی ہے: جیسا کہ عرفانی اور عشقی اشعار سے مختلف نتائج نکالے جاسکتے ہیں خصوصاً حافظ کی غزلیات، جیسا کہ اکثر اربابوں کے گھر میں "دیوان حافظ" ہوتا ہے اور ایک قدیم زمانہ سے دیوان حافظ سے فال بھی نکالی جاتی ہے مثلاً جب کسی شخص کا رشتہ دار سفر میں ہوتا ہے اور وہ اس کے بارے میں باخبر ہونا چاہتا ہے تو وہ دیوان حافظ کے ذریعہ فال نکالتا ہے اور سامنے نکلنے والے صفحہ پر موجود غزل کو پڑھ کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کا رشتہ دار خیریت سے ہے اور جلد ہی پلٹنے والا ہے اور اگر کوئی شخص مریض ہو اور دیوان حافظ سے فال نکالتا ہے تو وہ بھی اسی غزل سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ جلد ہی اس کو بیماری سے شفا ملنے والی ہے؛ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اسی غزل سے ایک شخص پریشان کن نتیجہ نکالے جبکہ حافظ کی عارفانہ اور عاشقانہ غزلیں اس طرح فال نکالنے کے لئے نہیں ہیں، اور حافظ کا ان غزلیات سے بالکل یہ مقصد نہیں ہے کہ فلاں مریض شفا یاب ہو جائے گا یا فلاں مسافر سفر سے جلد لوٹ آئے گا، یا فلاں شخص کی یہ آرزو پوری ہو جائے گی یا فلاں صاحب کی یہ حاجت پوری نہیں ہوگی کیونکہ حافظ نے عرفانی اور شاعری

ماحول میں شعر کہیں ہیں جبکہ فال نکلنے والا اپنے ذہن کے لحاظ سے مختلف نتیجے نکال رہا ہے جب کہ شاعر اور دوسروں کے نتیجے سے میلوں فاصلہ موجود ہے مولانا (شاعر) نے کیا خوب کہا:

ہر کس از ظن خود شد یار من
از درون من نجست اسرار من

(اپنے خیال میں ہر شخص ہمارا دوست بن گیا ہے لیکن کسی نے ہمارے اندر کے اسرار کا پتہ نہ لگایا)
کھتے ہیں کہ قرآن کریم بھی حافظ کی غزلوں کی طرح ہے جس سے ہر شخص مختلف نتیجے نکال سکتا ہے بلکہ ایک دوسرے کے بالکل مخالف بھی، اور ہر کوئی شخص اپنے ذہن اور سابقہ علم کی بنا پر قرآن کریم کی آیات سے نتیجے نکال سکتا ہے، اور کسی شخص کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے حاصل کردہ نتیجے اور قرائت کو مطلق قرار دے۔

یہاں پر پھونچنے کے بعد یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے یا کم سے کم یہ احتمال پایا جاتا ہے کہ اس نعرہ (کہ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دین سے حاصل کردہ اپنے نظریہ کو مطلق قرار دے)؛ کی اصلی بنیاد یہی دین کی زبان کا مسئلہ ہے کیونکہ اس نظریہ کی بنا پر دین کی زبان قصہ کھانی اور افسانہ کی زبان ہے، اور یہ زبان سمبلیک "S y m b i l e c" (رمزی) اور غیر واقع نما ہے، لہذا ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ذہنیت کے لحاظ سے دینی مسائل کے معنی و تفسیر کرے، نیز کسی شخص کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ صرف اپنی قرائت اور تفسیر کو صحیح قرار دے اور دوسروں کے حاصل کردہ نتائج کو باطل و بے بنیاد!

تو کیا واقعاً اس بے بنیاد اور الحادی نظریہ کی نشر و اشاعت کے بعد جس میں قرآن کریم کو دیوان حافظ کی طرح قرار دیا جاتا ہے اور جس سے ہر کس و ناکس اپنے ذہن کے لحاظ سے معنی و تفسیر کرنے کا حق رکھتا ہے تو کیا اس صورت میں یہ قرآن کریم؛ کتاب ہدایت باقی رہے گی؟! اور کیا قرآن کریم سے اس طرح کے پیش کردہ نتائج کے بعد وہی کتاب باقی رہے گی جس کے لئے پیغمبر اکرم (ص)، ائمہ معصومین علیہم السلام نے اپنی جان خطرات میں ڈالی اور اس راہ میں کس قدر شہید فدا ہو گئے؟ اگر ہر کس و ناکس قرآن مجید کی تفسیر کر سکتا ہو اور اپنے حاصل کردہ نتیجے کو حجت قرار دے سکتا ہو تو پھر آیات قرآن کی صحیح تفسیر پر قرآن مجید کیوں زور دیتا ہے اور تفسیر بالرائے کرنے سے کیوں ڈراتا ہے، نیز دین میں بدعت گزاری کی کس قدر مذمت کی گئی ہے؟ اگر قرآن مجید کی تفسیر من پسند ہونے لگے اور دو بول پڑھنے والا ہر شخص قرآن مجید سے نتیجے حاصل کرنے لگے، تو پھر ہمارے انقلاب کا کیا فائدہ؟ کیوں ہم نے شاہ کی حکومت کو سرنگون کیا؟ کیونکہ شاہ بھی اپنے کاموں اور اپنی سمجھ کو قرآن اور دین کے مطابق سمجھتا تھا، یہاں تک کہ وہ تو یہ بھی کھتا تھا کہ جو کچھ میں کھتا ہوں وہ ملاؤں کی بیان کردہ باتوں سے زیادہ مناسب ہے!! اور یہ دعویٰ کرتا تھا کہ میں ملاؤں سے زیادہ قرآن کو

سمجھتا ہوں، میرے خلاف بے وجہ تقریریں کی جاتی ہیں بلا وجہ عوام الناس کو میرے خلاف ورغلا یا جاتا ہے!! دین کے سلسلہ میں شاہ کی بھی ایک قرأت تھی کیوں اس کی قرأت کو باطل قرار دیا گیا!

اگر کوئی شخص اسی نظریہ کی بنا پر یہ دعویٰ کرے کہ دین سے حاصل کردہ میرا نتیجہ یہ ہے کہ خداوند عالم وجود عینی اور واقعی نہیں رکھتا اور مسلمان ہونا خدا کو ماننے میں منحصر نہیں ہے، تو کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے؛ چونکہ اس نے اپنے درک و فہم کو بیان کیا ہے اور دین سے اس طرح کا نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ حافظ کے اشعار میں بھی مختلف معنی اور تفسیر کرنے کی گنجائش پائی جاتی ہے مثلاً حافظ لکھتے ہیں:

اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقان ریزد
من و ساقی بہ ہم سازیم و بنیادش بر اندازیم

(اگر لشکر میں طلطم پیدا ہو جائے تو عاشقوں کا خون بھی بھادیا جاتا ہے، ہم اور ساقی آپس میں پیار و محبت سے رہیں تو پھر اس کی بنیاد کو گرا سکتے ہیں۔)

چنانچہ اس شعر کو پڑھ کر ہر شخص اپنی ذہنیت کے لحاظ سے نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اس کی بیماری کو شفا ہو جائے گی، یا اس کی حاجت پوری ہو جائے گی، اور اپنے حاصل شدہ نتیجہ کے لئے مثال کے طور پر یہ کھا جاتا ہے کہ ”مئے اور ساقی“ سے مراد؛ مریض اور ڈاکٹر ہے، اور ”بنیادش بر اندازیم“ سے مراد یہ ہے کہ یعنی مرض کو جڑ سے ختم کر دیا جائے گا لیکن کوئی دوسرا شخص اسی دیوان حافظ سے فال نکالے اور یہی شعر نکلے تو وہ اس سے بالکل مخالف نتیجہ نکال سکتا ہے۔

اگر قرآن مجید میں ایسے نتائج کی گنجائش پائی جاتی ہو کہ مثلاً خدا کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، اور خداوند عالم کے اثبات کرنے کے لئے کوئی دلیل بھی نہ ہو، تو پھر اسلام میں کیا باقی بچے گا؟ اگر ہر کس و ناکس قرآن مجید سے مستقل طور پر ایک نتیجہ نکالنے کا حقدار ہو اور تمام لوگوں کے حاصل کئے ہوئے نتائج کا احترام کیا جائے تو پھر دین اسلام سے دفاع، اور دین کے سلسلہ میں غیرت مندی کا مظاہرہ اور اسلامی اقدار کے مقابلہ میں حساسیت دکھانا؛ بے معنی اور بے ہودہ ہوگا سب کو ٹولرانس "Tol er an ec" کی رعایت کرتے ہوئے دوسروں کی باتوں کو برداشت کرنا چاہئے اور دوسروں کے نظریات پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے ہر شخص اپنے لحاظ سے دینی مسائل پر عمل کرے، اور اگر اس کا یہ نظریہ ہے کہ واقعاً خداوند عالم واحد اور یکتا ہے تو اس کو اپنے وظیفہ کے مطابق عمل کرنا چاہئے، لیکن اگر کسی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہزاروں خدا موجود ہیں تو اس کا وظیفہ اسی لحاظ سے ہوگا؛ اور جب ہر شخص کی

اپنی سمجھ حجت ہے تو کسی طرح کا کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہئے اور سب پیار و محبت کے ساتھ بہترین زندگی بسر کریں، اور کوئی بھی ایک دوسرے کے نظریات کے مقابلہ منفی اعتراض نہ کرے۔

بھر حال، یہ نظریہ جس میں دین کی زبان کو سمبلیک "S y m b i l e c" زبان قرار دیا گیا ہے، جس میں ہر شخص کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنے ذہن کے لحاظ سے دینی راز اور مخفی باتوں کے من پسند معنی کرے، اسی بنیاد پر کہنے والے کہتے ہیں کہ دینی معرفت اور شناخت نسبی اور سیال (رواں دواں) ہے اور کسی کو اپنے نظریہ کو مطلق قرار دینے کا حق نہیں ہے بے شک اس طرح کا فاسد نظریہ دین اور قرآن کی نظر میں باطل اور بے بنیاد ہے اور اس طرح کا نظریہ دین سے کسی بھی ہم آہنگ نہیں ہے ہم عقلی دلائل سے یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ خداوند عالم کی حکمت اور اس کا لطف اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ایک مقصد اور ایک راہ حق و مطلق کی طرف ہدایت کرے، جس کے لئے خداوند عالم نے قرآن مجید نازل کیا جس میں ہر انسان کے لئے حجت اور موعظہ ہے اور جو نوع بشریت کی روحی و نفسیاتی بیماریوں کا علاج کرتا ہے جب کہ پیامبر اکرم (ص) اور ائمہ علیہم السلام کے مکتب سے تعلیم حاصل کرنے والوں کے نزدیک قرآن مجید کی ایک ہی قرأت اور تفسیر ہے اور وہ بھی پیغمبر اور اہل بیت علیہم السلام کی تفسیر ہے اور صرف انہیں حضرات کی رائے اور نظریہ صحیح اور برحق ہے جو معرفت کے آب زلال کا سرچشمہ ہیں، دین کی یہ قرأت دوسری مختلف قرأتوں سے سازگار نہیں ہے، اور ان کو باطل قرار دیتی ہے اگرچہ عالم اسلام میں "نارٹن" اور "لوٹری" پیدا ہو جائیں اور ایک نیا دین ایجاد کر لیں جس کی بنا پر مختلف اور مخالف قرأتیں پیدا ہونے لگیں اور معرفت کے نسبی قرار دینے کی وجہ سے تمام قرأتوں کو صحیح قرار دیا جانے لگے، لیکن ائمہ علیہم السلام سے نقل شدہ بے شمار روایات کے ذریعہ قرآن مجید کی صحیح قرأت ہم تک پہنچنی ہے اور لوگوں کو تفسیر بالرائے سے سخت منع کیا گیا ہے۔

اولیاء اللہ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ عوام الناس کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے طرف سے دین میں کچھ چیزوں کو شامل کر دیں اور اگر کسی مقام پر غیر واضح تشابہ بیان ہو، تو اس موقع پر توقف کیا جائے اور اہل بیت علیہم السلام کی موجیں مارتے ہوئے دریائے معرفت سے اس کی تفسیر حاصل کریں، اور خدا اور اسلام کی طرف اسی چیز کی نسبت دیں جو خود خداوند عالم، قرآنی آیات اور پیغمبر اکرم و ائمہ معصومین علیہم السلام کے فرمان میں موجود ہو۔

۸۔ ہر منونک فلسفہ میں قرأت کی کثرت اور معرفت کا سیلاب

تعدد قرأت اور اپنی نظریہ کو مطلق قرار نہ دینے کے نعرہ کی ایک دلیل؛ علم ہر منونیک "H e r m e n e u t i c s" (تحریر کے معنی اور تفسیر کرنا) ہے؛ یہ علم آج کل معرفت اور شناخت کے بارے میں ایک عظیم شعبہ ہے جس کی تحقیق کے سلسلہ میں دنیا بھر میں بھت سے افراد مشغول ہیں اس علم کسی پیدائش بھسی مغربی ممالک میں ہوئی ہے، پہلے یہ ہر

منوٹیک "Hermeneutics" عیسائیت کے علم کلام اور حکمت (فلسفہ) کے کام میں آتا تھا جس کا موضوع کتاب مقدس (عہد عتیق اور عہد جدید) کی حقائق کی معنی و تفسیر کرنا تھا لیکن اس کے بعد اس میں وسعت دیدی گئی اور اس کو انسانی کردار، رفتار و گفتار و آثار کی اہمیت کے معنی و تفسیر کے سلسلہ میں ایک فن اور مہارت سمجھا جانے لگا اور اس آخری معنی کی وجہ سے علم ہرمنوٹیک کو خدا شناسی (الہیات) سے نکال کر فلسفہ سے مخصوص کر دیا گیا، اور یہ انسانی علوم کے مطالعات یا علوم انسانی کے لئے خاص روشوں میں استعمال ہونے لگا۔

اس علم میں بیان ہونے والی تھیوری اور نظریات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہمارے استعمال کردہ الفاظ دوسروں تک مافی الضمیر منتقل کرنے سے قاصر ہیں، ہمارے یہ الفاظ کسی بھی صورت میں اس معنی اور حقائق کی طرف منتقل نہیں کرتے جن کو مولف نے بیان کئے ہیں پس جس وقت کوئی شخص دوسروں سے گفتگو کرتے وقت الفاظ کا استعمال کرتا ہے تو سننے والا کہنے والے کے اصلی مقصد تک نہیں پہنچ سکتا مثال کے طور پر ہر انسان کی باطنی احساسات ہوتے ہیں جیسے محبت، عشق، غصہ، نفرت اور تعجب تو اگر کوئی شخص کوئی تعجب آور چیز دیکھتا ہے اگر وہ اپنے تعجب کے احساس کو دوسرے سے بیان کرنا چاہے، تو سننے والا صرف یہ بات سمجھتا ہے کہ اس کو تعجب ہوا ہے، لیکن کسی بھی صورت میں استعمال ہونے والے الفاظ کے اندر حقیقت تعجب کا پتہ نہیں چلتا، درحقیقت الفاظ کے ذریعہ صرف ایک احساس کی خبر دی جاتی ہے لیکن اس احساس کی ماہیت اور کیفیت منتقل نہیں ہوتی مثال کے طور پر اگر آپ کسی سے کہیں کہ میں فلاں چیز کا عاشق ہو، تو آپ کا مخاطب آپ کے اندر احساس کو نہیں سمجھ سکتا وہ آپ کے بعض حالات سے ایک طرح کا اندازہ لگا سکتا ہے لیکن تفصیلی طور پر اس کی شناخت اور اندرونی احساس کو نہیں سمجھ پاتا۔

۹۔ الفاظ کے ذریعہ مختلف حقائق کو سمجھا جاسکتا ہے

جیسا کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو چکا ہے کہ ان لوگوں کے دعووں میں ایک دعویٰ یہ ہے کہ کسی مولف یا مقرر کے الفاظ مقصد کو بیان کرنے اور مافی الضمیر کو منتقل کرنے سے قاصر ہیں، اور الفاظ کا مافی الضمیر کے منتقل کرنے میں ناکافی ہونا ہرمنوٹیک کی بحث کا ایک حصہ ہے نیز دینی تحریروں میں بھی اس سے کام لیا جاتا ہے گذشتہ اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگر ہم گذشتہ چند ہزار سال پہلے کی مختلف اقوام و مذاہب کا تاریخی مطالعہ کریں اور ہر دین و مذہب اور مسلک کے ماننے والوں کی ادبیات پر سرسری نظر دوڑائیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ تمام ہی اقوام اور مذاہب کی رونق بخش تعلیمات "عشق" کی بنیاد پر ہے اور اس نکتہ سے پتہ یہ چلتا ہے کہ عشق ایک ایسی حالت ہے جس کا احساس تمام انسانوں کے یہاں پایا جاتا ہے، جو سب کے لئے قابل فہم ہے اب اگر کوئی جاپانی، چینی، ایرانی یا عرب باشندہ اپنے عشق کے بارے میں خبر دے تو پھر یہ دعویٰ کیسے کیا جاسکتا ہے کہ ہم اس کے احساس

کو درک نہیں کر سکتے؟ کیونکہ یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ لیلیا مجنون یا شیرین اور فرہاد کی داستانِ عشق ہمارے لئے قابل فہم نہیں ہے اور ہم ان داستانوں میں عشق کو صحیح طریقہ سے سمجھ نہیں سکتے؛ اور یہ بھانہ کریں کہ الفاظ کے ذریعہ احساسات منتقل نہیں ہوتے ہیں، اگر عشق جیسی حالت اور احساس تمام کہنے والوں یا سننے والوں کے لئے قابل فہم نہ ہو تو پھر ہر قوم و ملت میں عشق کے سلسلے میں اس قدر نظم و نثر کیوں موجود ہے، اور عشق کے بارے میں اس زبان کی ادبیات کیوں بھری ہوئی ہے؟

ہم بھی اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ انسان اپنی اندرونی احساسات کو کما حقہ (ہو بھو) دوسروں کی طرف منتقل نہیں کر سکتا، لیکن قرآن و شواہد اور دوسری چیز کو دیکھ کر دوسروں کے احساسات کو سمجھا جاسکتا ہے (مثلاً) ہم اپنے اندر موجود احساس خوف کو دوسرے کی طرف منتقل نہیں کر سکتے جس سے ہمارے احساس کو سمجھ سکے؛ لیکن چونکہ خوف اور ڈر کا احساس ایک ایسی چیز ہے جو تقریباً کم و بیش سبھی کے اندر پایا جاتا ہے، لہذا دوسرے افراد بھی ہمارے اندر موجود خوف کا احساس کر سکتے ہیں لیکن اگر کسی کے یہاں ہماری طرح کا احساس نہ پایا جاتا ہو تو وہ قرآن اور شواہد کے ذریعہ بھی ہمارے احساس کا پتہ نہیں چلا سکتا مثال کے طور پر اگر کسی کے اندر عشق و محبت کا احساس نہ پایا جاتا ہو، تو پھر وہ عشقی داستان سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا، لیکن یہ بات بھی ماننا پڑے گی کہ ایسے شخص کو انسان بھی مشکل سے کھا جائے گا کیونکہ ہر شخص میں تھوڑا بھت محبت کا احساس پایا جانا ضروری ہے، اب اگر کوئی شخص اپنے اس اندرونی احساس کے بارے میں خبر دے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس حالت میں شدت اور زیادتی کا امکان پایا جاتا ہے، تو اس کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ جب یہ حالت اپنی سرحد کمال اور بھت زیادہ شدت تک پہنچتی ہے تو اسی کو ”عشق“ کھا جاتا ہے پس ایسا نہیں ہے کہ ہم اپنے اندرونی احساسات کو دوسروں تک منتقل نہیں کر سکتے، جس کے نتیجے میں ہمارے استعمال کردہ الفاظ اپنی دلی حالت کی ترجمانی کرنے کے ناکافی اور قاصر ہوں۔

۱۰۔ قرآن کریم سے مطلق اور واقعی معرفت کا حاصل کرنا ممکن ہے

جی ہاں، ہم بھی یہ بات مانتے ہیں کہ عام طریقوں اور معمولی شناخت کے ذریعہ کُنہ حقائق (جوہر حقائق) اور ماورای طبیعت مثلاً فرشتہ کے ماہیت اور حقیقت کے بارے میں آگاہی حاصل نہیں کی جاسکتی، اور ان کے بارے میں مکمل طور پر شناخت حاصل نہیں ہو سکتی، ان کے بارے میں ہونے والی گفتگو متشابہ اور ذو معنی ہیں، اسی وجہ سے بعض آیات قرآن میں اس طرح کی موجودات کے بارے میں بیان شدہ مطالب متشابہ ہیں ان حقائق کی پہچان کے لئے مخصوص راستے موجود ہیں جو عام انسان کو معلوم نہیں ہیں اور صرف وہی حضرات ان طریقوں کو جانتے ہیں جنہوں نے مدتوں تہذیب نفس اور اخلاقی و عرفانی سیر و سلوک کا راستہ طے کیا ہے، جس کی بنا پر ان بعض موجودات کو درک کیا ہے لیکن قرآن مجید کی بعض باتوں کو نہ سمجھنا دلیل نہیں ہے کہ ہم یہ کھ دیں کہ جو کچھ بھی قرآن مجید میں بیان ہوا ہے وہ سب اسی طرح ہے، ہم اس کو نہیں سمجھ سکتے، اور ہمارے لئے قابل فہم

نہیں ہے، نیز الفاظ کے ذریعہ ہمیں حقائق کا پتہ نہیں چلتا، اور ہر انسان اپنے ذہن کے لحاظ سے ان الفاظ کے معنی و تفسیر کر سکتا ہے اگرچہ یہی ماوراء طبیعت حقائق (جیسے ملک و فرشتہ)؛ کے بارے میں مکمل معرفت حاصل نہیں ہو سکتی، اور ایک عام انسان ان کی شناخت اور حقیقت سے باخبر نہیں ہو سکتا، لیکن ان کے بارے میں جن صفات اور خصوصیات کا ذکر قرآن مجید میں ہوا ہے ہم ان کے ذریعہ کافی حد تک ان کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔

دین اور قرآن کی زبان کو افسانوی زبان قرار دینے والوں کی ایک دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید اور دیگر آسمانی کتابوں میں استعارات، کنایات، تشبیحات اور تمثیلات ذکر ہوئی ہے، منجملہ یہ مثال قرآن مجید میں ذکر ہوئی ہے:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا﴾ (۳)

”اور خبردار! اس عورت کے مانند نہ ہو جاؤ جس نے اپنے دھاگے کو مضبوط کاتنے کے بعد بعد اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا“

اگرچہ قرآن مجید میں یہ مثال بیان ہوئی ہے اور شاید اس طرح کی کوئی بڑھیا کا وجود ہی نہ ہو۔

اسی طرح گدھے کے بارے میں ایک مثال قرآن مجید میں یہ ذکر ہوئی ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِينَ حُمِلُوا الثَّوْرَةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا﴾ (۴)

”ان لوگوں کی مثال جن پر توریت کا بار رکھا گیا اور وہ اسے اٹھانے سکے اس گدھے کی مثال ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے

”ہو“

کہنے والے کہتے ہیں کہ جب اس طرح کی افسانوی مثالیں قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں تو پھر قرآن مجید میں بیان شدہ دوسری باتیں منجملہ خدا، قیامت، وحی اور جنت و دوزخ کس طرح افسانوی نہ ہوں گی!

قارئین کرام! اس طرح بے بنیاد اور بے ہودہ نیز الحاد کی باتیں مقالات کی صورت میں پورے ملک کی یونیورسٹیوں کے اسٹوڈینٹس تک پہنچائی جا رہی ہیں، تاکہ ان کو یہ بات تلقین کی جائے کہ پورے کا پورا قرآن افسانہ اور کہانی ہے یہاں تک کہ گستاخی اس قدر بڑھتی جا رہی ہے کہ ایک اسٹوڈینٹ نے اپنے مقالہ میں قرآن مجید میں بیان شدہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے رومانٹک "Romantique" نتیجہ حاصل کیا اور ایک خیالی داستان کے عنوان سے لکھا، اور اس کے بعد اس پر ادبی تنقید کی اور اس پر بھت سے اعتراض و اشکال کئے، اور جب حضرت یوسف کی اس رومانٹک داستان کو استاد کی موجودگی میں سب کے سامنے پڑھا، تو اس داستان کو سننے کے بعد استاد نے بھی بھت سے اعتراضات کئے، جس کے بعد یہ نتیجہ نکالا گیا کہ داستان یوسف کا لکھنے والا کوئی ماہر ادیب نہیں تھا جس کی بنا پر یہ داستان صحیح طریقہ پر نہیں لکھی گئی ہے!!

افسوس کہ جبراندگی "آزادی بیان" کے زیر سایہ اور یونیورسٹیوں و دیگر مراکز میں آزاد سیاسی ماحول، اسی طرح ہمارے ملک کے سرکاری و غیر سرکاری تعلیمی نظام کی کمزوری، نیز انقلاب کے بعد سے تعلیم و تربیت کے عہدہ داروں کی بے توجہی خصوصاً یونیورسٹی کا موجودہ ماحول میں؛ اسلامی اقدار کے خلاف وسیع پیمانہ پر زہریلی تبلیغات اور پروپیگنڈے ہو رہے ہیں، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ عصر حاضر میں بعض یونیورسٹی طلباء کا سوال یہ ہے کہ جب قرآن مجید میں داستان، افسانہ اور استعارات و کنایات بیان ہوئے ہیں اور ان کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں اور ان کی جگہ مجازی معنی مراد لئے جاتے ہیں، تو پھر قرآن مجید کے دوسرے مطالب بھی اسی طرح کے ہونے چاہئیں؟ شاید خدا، وحی اور قیامت جیسے الفاظ سے بھی مجازی اور غیر حقیقی معنی مراد ہوں؟

جی ہاں، یہ سب معرفت کے نسبی ہونے، زبان دین کے سبب ہونے اور ہر منوٹیک "Hermeneutics" کے ذریعہ دینی تحریر کے معنی و تفسیر کرنے کا نتیجہ ہے جس کے ذریعہ ہمارے عظیم الشان اعتقادات اور اصول کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے جو ہمیشہ ہماری ثقافت اور معاشرہ کے لئے باعث عزت ہے اور ہمارے گزشتہ اور حال کے افتخارات انہیں اسلامی اعتقادات کی وجہ سے ہیں اور تمام انبیاء اور اولیاء اللہ کی امانت کی حفاظت کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

یہ نسبت گرائی اور شکاکیت کا نتیجہ ہے کہ کہنے والے کہتے ہیں کہ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اپنے نظریہ کو مطلق قرار دے، اور دین سے حاصل شدہ مختلف نتائج کو قابل احترام سمجھا جائے کیونکہ قرآن کی زبان واقع نما اور حقیقی نہیں ہے بلکہ سبب ہر شخص قرآنی آیات سے مستقل طور پر نتیجہ نکال سکتا ہے ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن مجید میں مثالوں، استعاروں اور داستانوں کو بھانہ بنا کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن کریم اصولی طور پر حقائق اور واقعت کو بیان کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف داستانوں، افسانوں اور کنایات و استعارات کی گفتگو کو بیان کرنا چاہتا ہے ہم یہاں پر یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر کسی کتاب یا مقالہ یا نظم میں کوئی مثال ذکر ہوئی ہو تو کیا اس کو شعر اور مثل کی کتاب کا نام دیا جائے گا؟ اگر کوئی مقرر اپنی تقریر کے دوران کوئی لطیفہ یا کوئی طنز بیان کرے تو کیا اس کی تمام باتوں کو مسخرہ اور طنز آمیز کہا جاسکتا ہے؟ اگر کوئی شخص کسی موقع پر اپنی گفتگو میں مثال، شعر، استعارہ، تشبیہ، کنایہ اور مجاز جیسی چیزوں کا استعمال کرتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہے کہ اس کی تمام گفتگو شعر اور افسانہ ہے جس میں کچھ استعارات، کنایات، تشبیحات اور مثالیں بیان ہوئی ہیں اس صورت میں پھر کسی بھی قلم کار کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی کتابوں میں مثال، شعریا طنز کا استعمال کرے، ورنہ تو اس کی کتاب شعر اور طنز کی کتاب کھلانے کی اگر خداوند عالم نے قرآن مجید میں مثل ذکر کی ہے تو کیا خداوند عالم کے اس قول ﴿وَأَنذِرْ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَتِي آدَمَ بِالْحَقِّ﴾^(۵) کو ایک افسانہ اور مثل قرار دیا جاسکتا ہے؟ اور کیا خداوند عالم کے اس فرمان ﴿وَبِالْحَقِّ أَنْزَلْنَاهُ وَبِالْحَقِّ نَزَّلَ﴾^(۶) کو شعر اور افسانہ قرار دینے سے نہیں؟!

یہ لوگ ہر منوٹیک "Hermeneutics" نظریہ اور عبارت و تحریر کی تفسیر کے اعتبار پر ایک دلیل یہ ذکر کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے یہاں ہمیشہ تفسیر اور تاویلات ہوتی رہی ہیں اور علماء و عرفاء نے تاویل اور تفسیر کے بارے میں بھت سی کتابیں

بھی لکھی ہیں؛ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی مختلف تفاسیر اور مختلف تاویلات ہو سکتی ہیں جس طرح عرفاء اور علماء نے قرآن مجید کی تاویلات اور تفاسیر ذکر کی ہیں اسی طرح ہمیں بھی قرآن مجید کی جدید تفسیر کرنے کا حق حاصل ہے، اگرچہ ہماری بیان کردہ تفسیر علماء کی تفسیر سے بالکل مخالف ہو جیسا کہ بعض روایات میں قرآن مجید کی تفسیر؛ قرآن کے ظاہری الفاظ سے بالکل مختلف ہے، لہذا قرآن مجید میں مختلف تفاسیر کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن مجید کی مختلف تفاسیر اور تاویلات کی جاسکتی ہیں؛ لہذا ہم بھی یہ کام کر سکتے ہیں اور چونکہ ان کے درمیان فرق نہیں کیا جاسکتا کہ ان میں سے کون سے تفسیر صحیح ہے اور کون سی غلط؛ لہذا ان سب کو معتبر ماننا چاہئے!

قارئین کرام! یہ بات صحیح ہے کہ قرآن مجید میں مشابہ آیات پائی جاتی ہیں جس کی تفسیر آیات محکمات کے لحاظ سے ہونا چاہئے، اور روایات میں بھی بیان ہوا ہے کہ قرآن مجید میں بہت سارے باطن اور مختلف پردہ ہیں، لیکن قرآن مجید کی کسی بھی آیت میں یہ بیان نہیں ہوا کہ ظاہر آیات اور کلمات و الفاظ حجیت نہیں ہیں، اور ہم پر حقائق کو آشکار نہیں ہوتے۔

قارئین کرام! آیات کے ظاہری اعتبار کے علاوہ قرآن مجید میں اور بھی مزید دقیق اور گہرے مطالب موجود ہیں جن کو بطون اور تاویل آیات کھا جاتا ہے، اور اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اصلاً قرآنی ظواہر معتبر نہیں ہیں، اور صرف ان سے حاصل کردہ ہمارا نتیجہ معتبر ہے اور وہ بھی وہ تاویلات جو تاویل کرنے والے کے ذہن کے مطابق اور اس کے ذہن کی پیداوار ہوں اس طرح دینی سلسلہ میں مختلف اور متضاد قرأت پیش کی ہو رہی ہیں اور ہم سے یہ کھا جاتا ہے کہ ان سب کو قابل احترام مانیں !!

۱۲۔ تحریف دین کے سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام کا اظہار افسوس

قارئین کرام! ہم اپنی گفتگو کے آخر میں لازم اور ضروری سمجھتے ہیں کہ حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے ان نورانی کلمات کی طرف اشارہ کریں جس میں آپ نے رسول اکرم (ص) کی وفات کے بعد پیدا ہونے والے دینی انحرافات اور شبہات کو بیان کیا ہے اور جن کی بنا پر افسوس ناک اور بُرے نتائج برآمد ہوئے ہیں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی حکومت رسول اکرم (ص) کی وفات کے ۲۵ سال کے بعد قائم ہوئی ہے، اس وقت تک وہ اصحاب رسول موجود تھے جنہوں نے خود رسول اکرم (ص) کی زبان مبارک سے آیات قرآن کی تفسیر اور شان نزول کو سنا تھا اور پیغمبر اکرم (ص) پر نازل ہونے والی آیات کے موقع کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؛ کیونکہ اس وقت قرآن کے نزول کو زیادہ وقت نہیں گذرا تھا لیکن وہ منافقین اور دشمنان اسلام موجود تھے جو اہل بیت علیہم السلام کے بے انتہا دریائے معرفت سے بے بھرہ تھے، اور جاہ و حشم کے دلدادہ اور ہوا پرست دین میں شبہات اور تحریفات ایجاد کر رہے تھے جس کی وجہ سے اسلام میں انحرافات پیدا ہو گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے درمیان برادر کشی ہونے لگی چنانچہ اس موقع پر حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

” وَ لَكِنَّا إِنَّمَا اصْبَحْنَا نُقَاتِلُ إِخْوَانَنَا فِي الْإِسْلَامِ عَلَى مَا دَخَلَ فِيهِ مِنَ الرِّبِّغِ وَ الْإِعْوَجَاجِ وَ الشُّبُهَةِ وَ التَّوَابِلِ “ (۷)

(مگر اب ہم کو ان لوگوں سے جو اسلام کی رو سے ہمارے بھائی کھلاتے ہیں ان سے جنگ کرنا پڑ گئی ہے، چونکہ (ان کی وجہ سے) اس میں گمراہی، کجی، شبہات اور غلط سلط تاویلات داخل ہو گئے ہیں)

یہی وہ شبہات اور اعتراضات ہیں جو عصر حاضر میں علمی طریقہ سے بیان کئے جاتے ہیں اور منظم طور پر بیان ہوتے ہیں، حضرت علی علیہ السلام کے زمانہ میں انہیں اعتراضات کی وجہ سے مسلمانوں میں مقابلہ بازی شروع ہو گئی، اور اسی طرح کے شبہات اور اعتراضات کو قبول کرتے ہوئے جنگ جمل اور جنگ نہروان میں حقیقی مفسر قرآن حضرت علی علیہ السلام کے مقابلہ میں آگئے جس کی بنا پر بہت سے لوگ قتل کر دیئے گئے۔

حضرت علی علیہ السلام خداوند عالم کی بارگاہ میں عوام الناس کی جھالت کی شکایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

” إِلَى اللَّهِ أَشْكُوا مِنْ مَعْشَرٍ يُعِيشُونَ جُهَالًا وَ يَمُوتُونَ ضَلَالًا، لَيْسَ فِيهِمْ سَلْعَةٌ ابْوَرَّ مِنَ الْكِتَابِ إِذَا تُلِيَ حَقٌّ تِلَاوَتِهِ، وَ لَا سَلْعَةٌ أَنْفَقُ بَيْعًا وَ لَا أَعْلَى ثَمَنًا مِنَ الْكِتَابِ إِذَا حُرِفَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَ لَا عِنْدَهُمْ انْكَرٌ مِنَ الْمَعْرُوفِ وَ لَا اعْرَفُ مِنَ الْمُنْكَرِ “ (۸)

(اسہ ہی سے شکوہ ہے ان لوگوں کا جو جھالت میں جیتے ہیں اور گمراہی میں مرجاتے ہیں، ان میں قرآن سے زیادہ کوئی بے قیمت چیز نہیں ہے، جب کہ اسے اس طرح پیش کیا جائے جیسا پیش کرنے کا حق ہے، اور اس قرآن سے زیادہ کوئی مقبول اور قیمتی چیز نہیں، اس وقت جب کہ اس کی آیتوں کا بے محل استعمال کیا جائے، ان کے نزدیک نیکی سے بڑھ کر کوئی برائی نہیں اور برائی سے زیادہ کوئی نیکی نہیں۔)

قارئین کرام! توجہ فرمائیں حضرت امیر علیہ السلام کا یہ شکوہ و شکایت اس وقت کا ہے جب رحلت پیغمبر اکرم (ص) کو ۲۵ سال کا عرصہ بھی نہ گذرا تھا، لیکن انحرافات، شبہات اور بدعت دین کے لئے اس قدر نقصان دہ ثابت ہو رہے تھے کہ حضرت نے تنہائی کے عالم میں لوگوں کی ہدایت کے مسئلہ کو ان کے حال پر چھوڑتے ہوئے بارگاہ رب العزت میں اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر دیئے اور اپنے درد و غم کو بیان کرنا شروع کر دیا۔

مذکورہ بالا کلام کی طرح خطبہ نمبر ۱۴۵ میں بھی حضرت فرماتے ہیں:

” وَ إِنَّهُ سَيَاتِي عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِي زَمَانٌ لَيْسَ فِيهِ شَيْءٌ أَحْفَى مِنَ الْحَقِّ، وَ لَا أَظْهَرُ مِنَ الْبَاطِلِ، وَ لَا أَكْثَرُ مِنَ الْكِذْبِ عَلَى اللَّهِ وَ رَسُولِهِ، وَ لَيْسَ عِنْدَ أَهْلِ ذَلِكَ الزَّمَانِ سَلْعَةٌ ابْوَرَّ مِنَ الْكِتَابِ إِذَا تُلِيَ حَقٌّ تِلَاوَتِهِ، وَ لَا أَنْفَقَ إِذَا حُرِفَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَ لَا فِي الْبِلَادِ شَيْءٌ انْكَرٌ مِنَ الْمَعْرُوفِ وَ لَا اعْرَفَ مِنَ الْمُنْكَرِ “

(میرے بعد تم پر ایک ایسا دور آنے والا ہے جس میں حق بھت پوشیدہ اور باطل بھت نمایاں ہوگا، اور اللہ اور اس کے رسول پر افتراء پردازی کا زور ہوگا، اس زمانہ والوں کے نزدیک قرآن سے زیادہ کوئی بے قیمت چیز نہ ہوگی جبکہ اسے اس طرح پیش کیا جائے

جیسے پیش کرنے کا حق ہے، اور اس قرآن سے زیادہ ان میں کوئی مقبول اور قیمتی چیز نہیں ہوگی جب کہ اس کی آیتوں کا بے محل استعمال کیا جائے، اور (ان کے) شہروں میں نیکی سے زیادہ کوئی برائی اور برائی سے زیادہ کوئی نیکی نہ ہوگی۔) اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:

”چنانچہ حاملان قرآن کو چھوڑ دیا جائے گا اور حافظین قرآن کو بھلا دیا جائے گا، قرآن اور قرآن والے (اہل بیت) بے گھر اور بے در ہوں گے، اور ایک ہی راہ میں ایک دوسرے ساتھی ہوں گے، انہیں کوئی پناہ دینے والا نہ ہوگا وہ (بظاہر) لوگوں میں ہوں گے مگر ان سے الگ تھلگ، ان کے ساتھ ہوں گے مگر بے تعلق، اس لئے کہ گمراہی ہدایت سے سازگار نہیں ہو سکتی، اگرچہ وہ یک جا ہوں لوگوں نے تفرقہ پردازی پر تو اتفاق کر لیا ہے اور جماعت سے کٹ گئے ہیں گویا کہ وہ کتاب کے پیشوا ہیں کتاب ان کی پیشوا نہیں، ان کے پاس تو صرف قرآن کا نام رہ گیا ہے اور صرف اس کے خطوط اور نقوش کو پہچان سکتے ہیں، اس آنے والے دور سے پہلے وہ نیک بندوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچا چکے ہوں گے، اور اس کے متعلق ان کی سچی باتوں کا نام بھی بھتان رکھ دیا ہوگا اور نیکیوں کے بدلہ میں انہیں بُری سزائیں دی ہوں گی۔“

نیز فرماتے ہیں:

”وَ اَعْلَمُوا اَنْكُمْ لَنْ تَعْرِفُوا الرُّشْدَ حَتَّى تَعْرِفُوا الَّذِي تَرَكَهُ وَ لَنْ تَاْخُذُوْا بِمِيْثَاقِ الْكِتَابِ حَتَّى تَعْرِفُوْا الَّذِي نَقَضَهُ وَ لَنْ تَمْسُكُوْا بِهٖ حَتَّى تَعْرِفُوْا الَّذِي نَبَذَهُ“

(جان لو کہ تم ہدایت کو اس وقت تک نہ پہچان سکو گے جب تک اس کے چھوڑنے والوں کو نہ پہچان لو اور قرآن کے عہد و پیمان کے پابند نہ رہ سکو گے جب تک کہ اس کے توڑنے والے کو نہ جان لو اور اس سے وابستہ نہیں رہ سکتے جب تک کہ اسے دور پھینکنے والوں کی شناخت نہ کر لو)

اور خطبہ کے آخر میں ارشاد فرماتے ہیں:

”پس انہیں سے ہدایت حاصل کرو، وہی علم کی زندگی اور جہالت کی موت ہیں وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کا (دیا ہوا) ہر حکم ان کے علم اور ان کی خاموشی ان کی گویائی کا پتہ دے گی، اور ان کا ظاہر ان کے باطن کا آئینہ دار ہے، وہ نہ دین کی مخالفت کرتے ہیں نہ اس کے بارے میں باہم اختلاف رکھتے ہیں، دین ان کے سامنے ایک سچا گواہ ہے اور ایک ایسا بے زبان ہے جو بول رہا ہے۔“ (۹)

قارئین کرام! آپ حضرات نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام لوگوں کو متوجہ کرنے کے بعد ان سے چاہتے یہ ہیں کہ دین کو صرف اہل بیت (علیہم السلام) کے ذریعہ حاصل کریں کیونکہ دین اور قرآن سے انہیں کا حاصل کردہ نتیجہ صحیح اور برحق ہے، اور دین سے دوسرے حاصل کردہ نتائج باطل اور بے بنیاد اور راہ خدا کو حاصل کرنے والوں اور حق و حقیقت کے تلاش کرنے والوں کے چور ہیں، جس کا نتیجہ گمراہی اور ذلت کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔

توجہ فرمائیں کہ حضرت علی علیہ السلام کے نظریہ کے مطابق یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ ہر کس و ناکس دین سے ایک الگ نتیجہ حاصل کر لے اور اس طرح کے تمام حاصل شدہ نتائج صحیح اور درست ہوں، کیونکہ یہ اپنے سلیقہ اور ذوق کے مطابق ہے کیا دین کے سلسلہ میں ذوق کا بھی کوئی دخل ہے؟ کیا دینی مسائل میں بھی ذوق دکھایا جاسکتا ہے؟ (ہرگز نہیں) تو پھر دین کی صحیح تفسیر اہل بیت علیہم السلام سے حاصل کرنا چاہئے، نہ یہ کہ اپنے سلیقہ اور ذوق کی بنا پر خود بھی گمراہ ہو رہے ہوں اور دوسروں کو دین سے گمراہ کر دیں۔

۱۳۔ دینی سلسلہ میں ذاتی سلیقہ کو رد کیا جائے

بعض لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ اپنے سلیقہ اور ذوق کو دوسروں پر نہ تھوپنے، تو کیا دین ذوق اور سلیقہ کا نام ہے، اور اس کی حدود اور اس کے معنی و تفسیر انسان کے سلیقہ سے معین ہوتے ہیں؟ سلیقہ اور ذوق انسان کی عام زندگی سے متعلق ہوتا ہے؛ مثال کے طور پر کوئی شخص کوئی کپڑا یا دوسری چیز خریدنا چاہتا ہے تو اس موقع پر کسی دوسرے شخص پر اپنا سلیقہ تحمیل کرنا صحیح نہیں ہے لیکن اعتقادات میں سلیقہ اور ذوق کا کوئی سروکار نہیں ہے، مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ میرا سلیقہ یہ کھتا ہے کہ خدا ایک ہے، اور (نعوذ باللہ) دوسرا شخص کہے کہ میرا سلیقہ یہ ہے کہ کئی خدا ہیں، کیونکہ شریعت اور احکام الہی عوام الناس کے ذوق کے تحت نہیں ہیں تاکہ کہنے والے کھیں کہ دوسروں کے سلیقوں کو بھی برداشت کریں، نیز دوسروں کے سلیقوں کو رد نہ کریں پس اعتقادی مسائل، ضروریات اسلام، احکام اسلام، عقائد اور الہی اقدار کسی کے سلیقہ کے تحت نہیں ہیں، اور ان کے سامنے ذوق و سلیقہ کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے اپنے نظریہ کو مطلق نہ قرار دینے کے شعار فقط دین کے فرعی اور ظنی مسائل میں صحیح ہے اور ان میں بھی ان حضرات کا نظریہ قابل قبول ہے جو دینی و فقہی مسائل میں اپنے عظیم الشان علم اور صحیح طریقہ سے مکمل طور پر اجتہاد کریں اور قرآن و سنت کے ذریعہ اپنے نظریہ کو استنباط کریں اور اسی کے مطابق فتویٰ دیں اور جو شخص اس طرح کی صلاحیت کا مالک ہوتا ہے اس کو اصطلاحاً ”فقیہ“ کہا جاتا ہے، چنانچہ اسی موقع پر کہا جاتا ہے کہ ایک فقیہ اپنی رائے کو دوسرے فقیہ پر تحمیل کرنے کا حق نہیں رکھتا یہ مسلم ہے کہ دو فقہاء کے درمیان فتوؤں میں اختلاف ہوتا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی فقیہ یہ نہیں چاہتا کہ اپنے نظریہ کو دوسرے فقیہ پر تحمیل کرے لیکن عقائد، اصول اور اسلام کے قطعیات میں انسان کا کوئی سلیقہ اور ذوق قابل قبول نہیں ہے کیونکہ دینی عقائد میں صرف وہی چیز صحیح ہے جس کو چودہ سو سال پہلے پیغمبر اکرم (ص) اور آپ کے بعد ائمہ معصومین علیہم السلام نے بیان فرمایا ہے، اور تمام علماء اور فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے، کیونکہ اسلامی مسلمات کے سلسلہ میں پیغمبر اکرم (ص) اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی قرأت کے علاوہ دوسری تمام قرأت باطل اور بے بنیاد ہیں، اور کسی بھی صورت میں قابل

قبول نہیں ہے کہ کوئی آگے بڑھ کر یہ کھے میں بھی دین سے ایک نئی قرأت پیش کرتا ہوں، درحقیقت اس طرح کا نظریہ دین میں بدعت گزاری کا واضح مصداق ہے جس سے مقابلہ کرنا حقیقی علماء اسلام کا فریضہ ہے، تاکہ وہ خداوند عالم، اس کے فرشتوں اور نیک بندوں کی لعنت و نفرین کے مستحق قرار نہ پائیں۔

والسلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ۔

والحمد لله رب العالمین

تمت بالخیر

۱۲۰۰۱۵

حوالے:

(۱) سورہ مائدہ آیت ۲۷

(۲) سورہ مائدہ آیت ۳۱

(۳) سورہ نحل آیت ۹۲

(۴) سورہ جمعہ آیت ۵

(۵) (سورہ مائدہ آیت ۲۷ ترجمہ: ”اور اے پیغمبر! آپ ان کو آدم کے دونوں فرزندوں کا سچا قصہ پڑھ کر سنائیے“

(۶) سورہ اسراء (بنی اسرائیل) آیت ۱۰۵ ترجمہ: ہم نے قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور یہ حق ہی کے ساتھ نازل ہوا ہے“

(۷) نصح البلاغہ خطبہ نمبر ۱۲۲

(۸) نصح البلاغہ خطبہ نمبر ۱۷

(۹) نصح البلاغہ ترجمہ مفتی جعفر حسین اعلیٰ اللہ مقامہ، خطبہ نمبر ۱۴۵

فہرست

- ۳.....چوبیسواں جلسہ.....
- ۳.....حکومت کی عظیم منصوبہ بندی ۱.....
- ۳.....۱۔ حکومت کی ضرورت.....
- ۵.....۲۔ قوہ مجریہ کے اہداف کے سلسلہ میں مختلف نظریات.....
- ۷.....۳۔ انبیاء (ع) کی حکومت کے اغراض و مقاصد.....
- ۹.....۴۔ لیبرل "Liberal" (آزادی خواہ) نظام میں اجتماعی مشکلات کا اثر.....
- ۱۱.....۵۔ لیبرل نظام سے لوگوں کی انسیت کی دلیل.....
- ۱۲.....۶۔ اسلامی حکومت کے ڈھانچے کے سلسلہ میں ایک طریقہ.....
- ۱۲.....۱۔ قانون کی شناخت:.....
- ۱۲.....۲۔ قوانین کو نافذ کرنے کی طاقت:.....
- ۱۳.....۷۔ عوام الناس میں حکومت کی مقبولیت ضروری ہے۔.....
- ۱۳.....حوالے:.....
- ۱۶.....پچیسواں جلسہ.....
- ۱۶.....حکومت کی عظیم منصوبہ بندی ۲.....
- ۱۶.....۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر.....
- ۱۷.....۲۔ حکومت، انسانی معاشرہ کی دائمی اور ہمیشگی ضرورت ہے۔.....
- ۱۸.....۳۔ حکومت کی ضرورت پر اسلام اور قرآن کا نظریہ.....
- ۲۰.....۴ طاقت و قدرت کی ضرورت.....
- ۲۱.....۵۔ مدیروں میں تقویٰ اور اخلاقی صلاحیت ہونا ضروری ہے.....

- ۶۔ فلسفہ سیاست میں حکومت کی مشروعیت ۲۳
- ۷۔ حکومت کی مشروعیت کے سلسلہ میں اسلامی نظریہ کالیبرل معاشرہ سے فرق ۲۵
- وضاحت: ۲۶
- حوالے: ۲۸
- چھٹی سواں جلسہ ۲۹
- حکومت کے مخصوص کام اور عوام الناس کے ہاتھ بٹانے پر اسلام کا زور ۲۹
- ۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر ۲۹
- ۲۔ حکومت کے عظیم اور مخصوص کام ۲۹
- ۳۔ حکومت کے دو طرفہ وظائف ۳۲
- ۳۔ کم در آمد لوگوں کو مدد پہنچانے والی کمیٹیوں کی ضرورت ۳۳
- ۵۔ عوام الناس کی شرکت پر اسلام کی توجہ ۳۵
- ۶۔ عوام الناس کی شرکت کو کم کرنے والے اسباب ۳۶
- ۷۔ اسلام میں جامعہ مدنی کی اہمیت ۳۷
- ۸۔ اسلامی انتخاب کے معیار سے مخالفت کے نئے حیلے ۳۸
- ۹۔ اسلامی اصول اور اقدار کی حفاظت اور دشمن زمینہ سازی سے مقابلہ کی ضرورت ۳۹
- حوالے: ۴۱
- ستائیسواں جلسہ ۴۲
- اسلامی حکومت کی خاص پہچان ۴۲
- ۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر ۴۲
- ۲۔ نظام اسلامی اور لائیک نظام میں حکومت کے سلسلہ میں بنیادی فرق ۴۳

- ۳۔ مغربی کلچر کے عاشق افراد کی طرف سے سیکولر حکومت کی پیش کش ۳۳
- ۳۔ اسلامی شعار کا حفظ اور رائج کرنا، حکومت کی ایک ذمہ داری ۳۳
- ۵۔ حکومت اور اس کے کرداری پہلو ۳۵
- ۶۔ ”ٹوٹالیٹر“^(۱) (Totalitair) اور ”لیبرل“ حکومت کا ڈل ۳۷
- ۷۔ اسلامی نظریہ کے تحت حکومت کیسی ہونا چاہئے ۳۹
- وضاحت: ۵۰
- ۸۔ متحد حکومتوں کے نقائص ۵۲
- پھلا اشکال: ۵۲
- دوسرا اشکال: ۵۲
- تیسرا اشکال: ۵۳
- حوالے ۵۳
- اٹھائیسواں جلسہ ۵۳
- اسلامی حکومت اور جائز آزادی اور اقدار کی رعایت کرنا ۵۳
- ۱۔ حکومت کی ضرورت پر ایک اشارہ ۵۳
- ۲۔ انسانی کردار میں اصل اولی ۵۶
- ۳۔ سزا دینے کے سلسلہ میں اسلام کا تربیتی پہلو ۵۸
- ۳۔ حکومت کے مخصوص ثابت اور متغیر کام ۵۹
- ۵۔ قوانین جاری کرنے کے طریقہ کار میں اسلامی اور غیر اسلامی حکومتوں میں فرق ۶۱
- حوالے: ۶۳
- انتیسواں جلسہ ۶۳

- اسلامی حکومت کی ذمہ داری کے بارے میں نظریات ۶۳
- ۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر ۶۳
- ۲۔ اسلامی حکومت کے عہدہ داروں کے شرائط ۶۵
- الف۔ قانون کی پہچان ۶۵
- ب۔ اخلاقی صلاحیت ۶۶
- ج۔ مدیریتی مہارت اور تجربہ ۶۷
- ۳۔ عہدہ داری کے شرائط کا نصاب معین کرنے کی ضرورت ۶۷
- ۳۔ اخلاقی صفات کے بارے میں ”کانٹ“ کے نظریہ کی رد ۶۸
- ۵۔ اقدار اور وظائف کے بارے میں اسلامی درجہ بندی نظریہ ۶۹
- ۶۔ عبادت کے بھی مختلف درجات ہیں ۷۰
- ۷۔ اسلامی حکومت کے درجہ بندی شدہ نمونے ۷۱
- ۸۔ ولایت فقیہ کی حکومت پر عقلی دلیل ۷۲
- حوالے: ۷۵
- تیسواں جلسہ ۷۶
- اسلامی حکومت سے ولایت مطلقہ فقیہ کی نسبت ۷۶
- ۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر ۷۶
- ۲۔ اسلامی حکومت کے وظائف اور اختیارات کا برابر کا توسعہ ۷۷
- ۳۔ حکومتی اختیارات سے ولایت مطلقہ فقیہ کی نسبت ۷۸
- ۳۔ مخالفین کی طرف سے ولایت مطلقہ کے بارے میں شک و شبہات ۷۸
- ۵۔ اسلامی حکومت کا ڈھانچہ ۷۹

- الف۔ اسلامی قوانین کی وسعت اور ان کا نسخہ نہ ہونا..... ۸۰
- ب۔ اسلام کی طرف سے حکومت کے درجہ وار نمونے..... ۸۱
- ۶۔ اسلامی نقطہ نظر سے ”حکومت میں حکومت“ کے نقشہ کی تاریخ..... ۸۲
- ۷۔ حضرت امام خمینی (رہ) کی طرف سے ”ولایت مطلقہ فقیہ“ کا نقشہ..... ۸۳
- ۸۔ مقبولہ (روایت) عمر بن حنظلہ سے ولایت فقیہ..... ۸۶
- ۹۔ اسلام کی نظر میں تفلیک قوا (قدرت کا جدا جدا ہونا) کا جائزہ..... ۸۹
- ۱۰۔ طاقت کے ایک ساتھ ہونے کا سبب..... ۹۰
- ۱۔ پارلیمنٹی نظام..... ۹۰
- ۲۔ ریاستی نظام..... ۹۰
- حوالے:..... ۹۱
- اکیسواں جلسہ..... ۹۳
- تفلیک قوا (قدرتوں کی جدائی) کے نظریہ کی تحقیق اور اس پر نقد و تنقید..... ۹۳
- ۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر..... ۹۳
- ۲۔ تفلیک قوا (قدرتوں کی جدائی) کے نظریہ کی تاریخی حیثیت..... ۹۳
- ۳۔ تفلیک قوا نظریہ کے دلائل پر ایک نظر..... ۹۳
- ۳۔ تفلیک قوا کو بالکل محدود کرنا ناممکن..... ۹۶
- ۵۔ تینوں طاقتوں پر ایک ناظر اور ہم اہنگ کرنے والی طاقت کی ضرورت..... ۹۸
- ۶۔ ولایت فقیہ معاشرہ کے اتحاد کا مرکز..... ۹۹
- بیسواں جلسہ..... ۱۰۱
- اسلامی نظام کے اعتقادی عظمت بیان ہونے کی ضرورت..... ۱۰۱

- ۱۔ اسلامی حکومت کی تھیسز "The'sis" کی پہچان کے مختلف طریقے..... ۱۰۱
- الف۔ مختصر شناخت:..... ۱۰۱
- ب۔ مخصوص اور علمی شناخت:..... ۱۰۲
- ج۔ متوسط شناخت:..... ۱۰۳
- ۲۔ قانون کی ضرورت اور اس کے خصوصیات پر ایک نظر..... ۱۰۳
- ۳۔ قوانین جاری کرنے والے کے صفات پر دوبارہ ایک نظر..... ۱۰۶
- مذکورہ شرائط:..... ۱۰۶
- ۳۔ اعتقادی اصول سے اسلامی حکومت کی تھیوری کا تعلق..... ۱۰۷
- ۵۔ حکومت کے طولی (تحت) مراتب کی منطقی اور عقلی دلیل..... ۱۰۸
- ۶۔ اسلامی حکومت کے سلسلہ میں چند سوالات..... ۱۱۰
- حوالے..... ۱۱۲
- تینتیسواں جلسہ..... ۱۱۳
- اسلام اور حکومت کے مختلف نقشے..... ۱۱۳
- ۱۔ اسلام کی طرف سے حکومتی سلسلہ میں کوئی طریقہ بیان نہیں کیا گیا (ایک اعتراض)..... ۱۱۳
- ۲۔ مذکورہ اعتراض کا جواب، اور حکومت کی شکل کے سلسلہ میں اسلامی نظریہ..... ۱۱۵
- ۳۔ حکومتی ثابت اور مسلم ڈھانچہ پیش کیا جانا ممکن نہیں..... ۱۱۶
- ۳۔ حکومت کا عرفی اور دنیاوی ہونا اور قوانین اسلام کا ہم عصری ہونا (ایک اعتراض)..... ۱۱۷
- ۵۔ مذکورہ اعتراض کا جواب، اور اسلام کے متغیر اور ثابت احکام کی نسبت..... ۱۱۹
- ۶۔ انسانی، تمام مسائل میں احکام الہی کی وسعت..... ۱۲۳
- حوالے:..... ۱۲۶

- چونتیسواں جلسہ..... ۱۲۷
- اسلامی احکام کی عظمت اور اس کی دوسرے نظام پر برتری..... ۱۲۷
- ۱۔ حکومت اور متغیر احکام سے اسلامی ثابت احکام کی نسبت..... ۱۲۷
- ۲۔ احکام اولیہ اور احکام ثانویہ..... ۱۲۸
- ۳۔ ڈیموکریٹک حکومتوں کے نقائص..... ۱۳۱
- ۴۔ قدرتوں میں ہم اہنگ کرنے کے اسباب کا ہونا ضروری ہے..... ۱۳۳
- ۵۔ ولایت فقیہ حکومت کو ہم اہنگ کرنے والی طاقت..... ۱۳۳
- ۶۔ دوسری حکومتوں پر ولایت فقیہ نظام کے امتیازات..... ۱۳۵
- الف۔ اندورنی انسجام و یگانگت..... ۱۳۵
- ب۔ روحی اور اندرونی نفاذ کی ضمانت..... ۱۳۶
- ج۔ مقام رہبری میں شائستگی اور تقویٰ کے عالی ترین درجات کا ہونا..... ۱۳۸
- د۔ انسانی معنوی اور واقعی مصالح کی رعایت..... ۱۳۹
- حوالے:..... ۱۴۱
- پینتیسواں جلسہ..... ۱۴۲
- قوانین اور حکومت سے آزادی کی نسبت..... ۱۴۲
- ۱۔ حاکم کا نصب کرنا آزادی اور ڈیموکریسی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ (ایک اعتراض)..... ۱۴۲
- ۲۔ تکوینی آزادی اور نظریہ جبر کی تحقیق اور رد..... ۱۴۲
- ۳۔ معنوی اور اندورنی اقدار کا آزادی سے کوئی ٹکراؤ نہیں..... ۱۴۳
- ۴۔ آزادی اور دینی وظائف کی نسبت..... ۱۴۶
- ۵۔ حدود اور سزاؤں میں آزادی کی نسبت..... ۱۴۹

- ۶۔ حکومت اور قوانین کے زیر سایہ مطلق طور پر آزادی نہیں ہو سکتی..... ۱۵۱
- جواب:..... ۱۵۱
- ۷۔ حاکمیت کا خدا سے متصل ہونا..... ۱۵۲
- حوالے..... ۱۵۶
- چھٹیسواں جلسہ..... ۱۵۷
- اسلامی قوانین قطعی طور پر جاری ہونے چاہئیں..... ۱۵۷
- ۱۔ گذشتہ مطالب پر ایک نظر..... ۱۵۷
- ۲۔ حکومت کی ضرورت اور انسان کی اجتماعی زندگی کا عکس العمل..... ۱۵۷
- ۳۔ حکومت کی مشروعیت کے منشاء کی طرف ایک اشارہ اور ڈیموکریسی پر اشکالات..... ۱۵۹
- پہلا اشکال:..... ۱۵۹
- دوسرا اشکال:..... ۱۶۰
- تیسرا اشکال:..... ۱۶۱
- ۳۔ اسلام میں حکومت کی مشروعیت اور اس کا قانونی ہونا..... ۱۶۱
- ۵۔ انبیاء علیہم السلام اور عوام الناس کی ہدایت کا طریقہ..... ۱۶۲
- ۶۔ عوام الناس کی ہدایت میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کی ضرورت..... ۱۶۳
- ۷۔ الہی اقدار کی حفاظت اور مغربی کلچر سے روک تھام ضروری ہے..... ۱۶۶
- ۸۔ قوانین کو جاری کرنے اور دشمن نظام سے بھرپور مقابلہ..... ۱۶۸
- ۹۔ سازش کرنے والوں اور زر خرید غلاموں کے مقابلہ میں عوام الناس کی ہوشیاری..... ۱۷۰
- حوالے..... ۱۷۱
- سیتیسواں جلسہ..... ۱۷۲

- ۱۵۲ تشدد کے سلسلہ میں ایک تحقیق
- ۱۵۲ ۱- گذشتہ مطالب پر ایک نظر
- ۱۵۲ ۲- دشمنوں کی طرف اسلام کے خلاف پروپیگنڈا اور کارکردگی
- ۱۵۳ ۳- مغربی ممالک میں حقوق بشر کا جھوٹا دعویٰ
- ۱۵۵ ۴- اسلامی نظام پر تشدد طلب ہونے کا الزام اور اس کے خلاف سازشیں
- ۱۵۶ ۵- لوگوں میں انتخابات سے بائیکاٹ کا راستہ ہموار کرنا
- ۱۵۷ ۶- اسلامی مقدسات کی توہین کرنے والوں اور ثقافتی سازشوں سے مقابلہ کی ضرورت
- ۱۸۰ ۷- خداوند عالم کی رحمت اور غضب کے بارے میں اسلامی تصویر کشی
- ۱۸۲ ۸- ہدایت کے موانع کو برطرف کرنے، دشمنوں اور منافقین سے مقابلہ کی ضرورت
- ۱۸۳ ۹- اسلامی سزا کے احکام کی مخالفت
- ۱۸۶ ۱۰- تشدد، اسلامی سزائی قوانین میں محدود نہیں ہے
- ۱۹۰ ۱۲- دشمن کی سازشوں سے مقابلہ کی ضرورت
- ۱۹۱ ۱۳- دشمنان اسلام سے مقابلہ اور اعلان برائت ضروری ہے (قرآن کریم)
- ۱۹۲ حوالے
- ۱۹۳ اڑتیسواں جلسہ
- ۱۹۳ اسلامی قوانین کے ساتھ مغربی نظریات کا ٹکراؤ
- ۱۹۳ ۱- تحریک مشروطیت اور مغربی کلچر کا رواج
- ۱۹۵ ۲- اسلام میں مطلوب اور مقصود آزادی کے نقشہ پر بعض مولفین کی نارضا مندی
- ۱۹۶ ۳- مفسد فی الارض کے بارے میں اسلامی حکم
- ۱۹۸ ۴- سخت رویہ نہ اپنانے کا نتیجہ

- ۲۰۰ ۵- تشدد کی بحث کے مقابلہ میں غیر ذمہ دارانہ رویہ.....
- ۲۰۱ ۶- قرآن مجید میں لفظ ”تشدد“ کے ہم معنی لفظ کی تحقیق.....
- ۲۰۱ ۷- مغربی اور اسلامی نظر میں تحمل اور ٹولرانس کے معنی.....
- ۲۰۳ حوالے:
- ۲۰۵ انتالیسواں جلسہ.....
- ۲۰۵ دینی عقائد و اقدار کے نسبی ہونے کے نظریہ کی تحقیق و بررسی.....
- ۲۰۵ ۱- دینی مسائل کو مطلق یا نسبی قرار دینا.....
- ۲۰۶ ۲- معرفت کے نسبی ہونے کے سلسلہ میں تین نظریات.....
- ۲۰۶ الف: معرفت کے نسبی ہونے پر پہلا نظریہ.....
- ۲۰۷ ب- معرفت کے نسبی ہونے پر دوسرا نظریہ.....
- ۲۰۹ ۳- بعض اقدار کا مطلق اور ثابت ہونا.....
- ۲۱۰ بعض اقدار کے مطلق ہونے کا معیار.....
- ۲۱۱ ۴- مغربی تمدن میں تمام دینی عقائد نسبی ہیں.....
- ۲۱۳ ج- معرفت کے نسبی ہونے پر تیسرا نظریہ (معرفت دینی میں نسبت کا وجود).....
- ۲۱۳ ۵- قرانت نسبی اور قرانت مطلق دونوں جدا جدا ہیں.....
- ۲۱۷ حوالے
- ۲۱۸ چالیسواں جلسہ.....
- ۲۱۸ دینی معارف افسانہ ہیں یا حقیقت نما آئینہ.....
- ۲۱۸ ۱- گذشتہ مطالب پر ایک نظر.....
- ۲۱۸ ۲- وقع نما اور غیر وقع نما زبانوں کی اہمیت.....

- ۳۔ دین کی زبان کو غیر واقع نما قرار دینے کا سبب ۲۲۰
- ۴۔ مغربی نسبی گرائی نظریہ کی ترویج (وتبلیغ) کرنے والے مغرب پرست روشن خیال ۲۲۲
- ۵۔ ہابیل اور قابیل کے واقعہ سے انحرافی نتیجہ ۲۲۳
- ۶۔ دین کی زبان واقع نما نہ ہونا یا دین کی ایک مبہم تصویر ۲۲۵
- ۷۔ قرآن مجید کا شعراء کی زبان سے مقابلہ کرنا؛ بھت سے نتائج ہونے پر دلیل ہے!! ۲۲۶
- ۸۔ ہر منوٹک فلسفہ میں قرائت کی کثرت اور معرفت کا سیلاب ۲۲۹
- ۹۔ الفاظ کے ذریعہ مختلف حقائق کو سمجھا جاسکتا ہے ۲۳۰
- ۱۰۔ قرآن کریم سے مطلق اور واقعی معرفت کا حاصل کرنا ممکن ہے ۲۳۱
- ۱۱۔ قرآن کی زبان کو واقع نما نہ ہونے پر نسبی نظریہ رکھنے والوں کی بے بنیاد دلیل ۲۳۲
- ۱۲۔ تحریف دین کے سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام کا اظہار افسوس ۲۳۳
- ۱۳۔ دینی سلسلہ میں ذاتی سلیقہ کو رد کیا جائے ۲۳۴
- حوالے: ۲۳۸